[illegible]

بدن نامۂ میرؔ

کلامِ میرؔ کا ایک منفرد پہلو

تالیف و تدوین

ایم اے مجید یزدانی

یہ ہو گیا بدن کا سب بہ کے گوشت پانی
اب کاردا ے عزیزاں پہنچی ہے استخواں تک

بدن نامۂ میرؔ

کلامِ میرؔ کا ایک منفرد پہلو

تالیف و تدوین

ایم اے مجید یزدانی

نام تصنیف	"بدن نامہ میسر"
مصنف	ایم اے مجید یزدانی
طبع اوّل	اکتوبر ۱۹۸۶ء
تعداد	پانچ سو
طابع	اللہ والا پرنٹرز شاہراہِ قائدِاعظم لاہور۔
قیمت	عوپے

ناشر

ایم اے مجید یزدانی ۳۴۳۔ ریواز گارڈن لاہور

پیش از پیش لفظ

باوجودِ ملکیت نہ مَلک میں پایا　　وہ تقدس کہ جو ہے حضرتِ انساں کے بیچ

ملائک پر انسان کی برتری کے اس تصور کی بنیاد وہ تقدس ہے جو انسان سے مخصوص ہے۔ اسی تقدسِ خاص کا دوسرا نام "انسانیت" ہے۔ تقدس کسی تلبیس یا تخلیط کا متحمل نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ خود حضرتِ انسان اس کی تذلیل پر کمر بستہ ہو جائے! یہی حقیقت ہے "غمِ میرؔ" کی!

انسانیت کا احترام انسان کا فرض ہے نہ کہ دام و دَد کا! مروّت کا مظاہرہ انسان نہ کرے گا تو کیا شجر و حجر کریں گے؟ یہ الگ بات ہے کہ شجر تمازتِ آفتاب کے سامنے سینہ سپر ہو کر انسان کو سایہ فراہم کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے اور حجر آپس میں ٹکرا کر خود زخمی ہو جاتے ہیں لیکن انسان کو یخ بستگی سے بچانے کے لیے چنگاری مہیا کر دیتے ہیں! یہ تو انسان ہی ہے جو دوسرے انسان پر پتھر برسا کر اسے لہولہان کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ یہی حقیقت ہے غمِ میرؔ کی!

انسان کے ہاتھوں انسان کُشی کا عمل سائنس کی ایجاد نہیں ——— اس نے دھات کے زمانے میں تیر و شمشیر سے اور پتھر کے زمانے میں پتھر سے قتلِ انسان کا عمل جاری رکھا بلکہ اور بھی کئی طریقوں سے، اور اس کا آغاز تو فرزندِ آدم ہی نے کر دیا تھا۔ ابتدائے آفرینش ہی سے فقدانِ وفا و اخوت کے بارے میں میرؔ کہتے ہیں ؎

چشمِ وفا اخوانِ زماں سے سادہ ہو سو میرؔ رکھے　　قصّہ ہے مشہورِ زمانہ پہلے دونوں بھائی کا

تقدسِ انسان کا تشدد انسان میں مبتدل ہو جانا انسانیت کی توہین ہے ——— یہی میرؔ کا غم ہے!!

میرؔ بزدلی کی تعلیم نہیں دیتے لیکن ان کے ہاں جارحیت بجوابِ جارحیت کا ذکر اس لیے دکھائی نہیں دیتا کہ یہ بیمارئ ذہنِ انسانی کا دوسرا مرحلہ ہے جس سے افاقہ کی بجائے بیماری میں اضافہ ہوتا ہے یعنی سلسلۂ انتقام لامتناہی ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا علاج پہلے مرحلے پر کرنا چاہتے ہیں اور اس اندازِ فکر کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو ذہن کو تشدد و جارحیت، ظلم و جبر، استحصال و غصب، عیاری و منافقت اور حسد و منافرت کے منصوبے سجھاتا ہے اور ہمدردی و غمگساری، دردمندی و دل نوازی اور احترامِ آدمیت کے مفہوم کو ذہن نشین نہیں ہونے دیتا۔ یہ مفہوم فرد کے ذہن میں واضح ہو جائے تو جماعتوں، گروہوں، قوموں اور ملکوں کے اذہان کو بھی ہموار کر سکتا ہے اور زیستِ آدم اس کرب و عذاب سے نجات حاصل کر سکتی ہے جس میں وہ مبتلا چلی آتی ہے گویا میرؔ بدعمل اور ظالموں کا نہیں بلکہ بدی اور ظلم کا خاتمہ چاہتے ہیں کہ اس طرح بدکار اور ظالم کا وجود از خود ختم ہو سکتا ہے۔ میرؔ کا جہاد اسی اول الذکر حیوانی اندازِ فکر کے خلاف ہے مگر لوگ ان کا ساتھ نہیں دیتے جس سے انہیں دکھ ہوتا ہے۔ یہی میرؔ کا غم ہے!!!

میرؔ اپنے اس غم کا اظہار غزل کے ذریعے سے کرتے ہیں۔ الفاظ و تراکیب کی حد تک غزل کے روایتی انداز کو کم و بیش برقرار رکھتے ہوئے وہ خارجی مشاہدات کو داخلی واردات میں اس طرح ڈھال دیتے ہیں کہ سطحیں نقاد ان کے غمِ انسانیت کو ذاتی غم سے تعبیر کرنے لگتے ہیں ـــــ اور اس غلط فہمی یا کج فہمی کی تشہیر اس انداز سے ہوتی رہی کہ میرؔ کے زندگی بخش پیغام کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی ضروری نہ سمجھا گیا اور انہیں شاعرِ غم کہہ کر فارغ کر دینا ہی کافی تصور کیا گیا!

بہرکیف حقیقت یہی ہے کہ غمِ انسانیت نے رُوحِ میرؔ کو مسلسل مبتلائے درد رکھا۔ جان کی یہ کیفیت ہو تو جسم کی کیا حالت رہی ہوگی ـــــ خود انہی کے الفاظ میں ؎

اب حیرت ہے کس کس جگہ پنبہ و مرہم رکھنے کی ‏ ‏ قد تو گیا ہے سرو چراغاں داغ بدن پر کھا کھا ہم

یہ بدن اصل میں "انسانیت کا بدن"[1] ہے جو انسان نما حیوان کے ہاتھوں داغ داغ ہے!!

جن امور کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے انھی کا ذکر متنِ کتاب میں بھی دکھائی دے گا اگرچہ تفصیل میں جانا وہاں بھی ممکن نہ ہو سکا کیونکہ اختصار میری مجبوری ہے۔ مَیں ایک گمنام اور غیر معروف شخص ہوں اس لیے اہتمامِ طباعت مجھے خود ہی کرنا ہے اور کسی ضخیم کتاب کے بار طباعت کا متحمل مَیں نہیں ہو سکتا کہ ۱۹۸۴ء سے لے کر اب تک کا سارا عرصہ تو اہتمام کی نذر ہو گیا اور کتاب کو مختصر اور مختصر ـــــ اور مختصر کرنے کا عمل برابر جاری رہا تاکہ بارِ وام میری استطاعت سے متجاوز نہ ہونے پائے۔ چنانچہ ایک ہزار تو درکنار، پانچ سو جلدیں بھی شاید ہی چھپوا پاؤں ـــــ لیکن مَیں چھپوانا ضرور چاہوں گا کیونکہ محنت سے تیار کردہ بعض دیگر ضخیم مسودات کی طرح مَیں اسے بھی غیر مطبوعہ صورت میں نہیں رکھ سکتا۔ تعدادِ طباعت کا کیا ہے، اس میں اضافہ کر کے مزید زیرِ بار ہونا کیا ضرور ہے! ایسی کتابوں کے لیے قارئین بھی تو آسانی سے میسّر نہیں آتے اور کتاب کو "میرؔ ڈائجسٹ" سے موسوم کرنا میرے لیے ممکن نہیں، تس پہ مستزاد کہ مشہور نہیں ہوں! پس زحمتِ مطالعہ تو بہت کم اصحاب ہی گوارا فرمائیں گے لیکن ان میں سے اگر کوئی ایسا بھی نکل آئے جو نغمۂ میرؔ کے مطابق دردمندی[2] کو شعارِ زیست بنا لے تو مَیں سمجھوں گا کہ میری محنت اکارت نہیں گئی۔

یکم اکتوبر ۱۹۸۶ء
ریواز گارڈن لاہور

یزدانی

---

[1] یعنی تکرارِ بیان کا عیب یہاں دانستہ روا رکھا گیا ہے کیونکہ ہمارے اصل مخاطب مبتدی ہیں نہ کہ علماء و فضلاء۔

[2] دردمندی کی وضاحت مختصر اور سہل ترین انداز میں میرؔ نے یوں کی ہے ؎

چار دن کا یہ جملہ ہے سب ‏ ‏ سب سے رکھئے سلوک ہی ناچار
کوئی ایسا گناہ اور نہیں ‏ ‏ یہ کہ کیجے ستم کسو پر یار
جی میں آوے سو کیجیو پیارے ‏ ‏ ایک ہونا نہ درپئے آزار

شب چراغ

یہ پیامِ خود شناسی ہے بنامِ خود پسنداں　　یہ صلائے درد مندی ہے دوائے مستمنداں
یہ خودی ہے بیخودی ہیں یہ خودی میں بیخودی ہے　　یہ جنوں کہ جس کے آگے ہے خرد بھی خس بدنداں
یہ وقار ہے جنوں ہیں کہ تڑپ رہا ہے خوں ہیں　　وہ کہہ رہا ہے بسمل بجواسِ ہوشمنداں

"تو زبوں شکار تھا ہے ولے میرؔ قتل گہ میں
ترے خوں سے ہیں حنائی کفِ پائے صید بنداں"

یہی وارداتِ بسمل میں چلا ہوں پیش کرنے　　بحضورِ اہلِ دنیا بسرِ نیاز مندی
کہ فغانِ آدمیت جو سُنیں کبھی تو شاید　　کریں غور دلنوازی کسی طور دل پسنداں
درِ گوش سے اُتر کر کیا عجب دلوں میں پہنچے　　یہ بکائے چشمِ گریاں یہ صدائے زخمِ خنداں

تجھے میرؔ آدمی گر نہ کروں سلام کیونکر
تو شہِ سخنوراں ہے تو امیرِ دردمنداں

یزدانی

فہرست

میرِؔ ہمہ گیر

نوحہ گرِ ذات یا غمخوارِ کائنات

غمِ میرؔ کو اُن کا داخلی معاملہ، شخصی غم یا ذاتی احساسِ محرومی قرار دیتے ہوئے اس کی آفاقی اہمیت کو نظر انداز کرنے کی روش بہت عام رہی ہے خصوصاً ان نقادوں کے ہاں جو موضوعِ تنقید کی بجائے ہدفِ تنقید کے متلاشی رہتے ہیں۔ میرؔ سے اس ناانصافی کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور لکھا گیا ہے لیکن اس سلسلے میں کسی تفصیلی جائزے کی گنجائش تالیفِ ہذا میں اس لیے نہیں ہے کہ ہمارا موضوع کلامِ میرؔ کے ایک خصوصی و منفرد پہلو کی نشاندہی تک محدود ہے جسے ہم نے "بدن نامۂ میرؔ" کے عنوان سے ترتیب دیا ہے۔ تاہم سخنِ میرؔ کی آفاقیت کو اس حد بندی کے باوجود مختصراً زیرِ بحث لانا ضروری ہے کیونکہ بدنِ میرؔ کے داغ ہی اصل میں وہ چراغ ہیں جن کی روشنی میں ان کے کلام کی آفاقی صداقتوں کو دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ صفحاتِ مابعد میں اس کی صرف ایک جھلک سی پیش کی گئی ہے۔

ہمارے نزدیک غمِ میرؔ کو فردِ واحد کا غم اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ یہ وحدت اصل میں کثرت کے ہر رنگ پر محیط ہے، اس لیے کہ یہ غم کسی ایک بشر کا غم نہیں بلکہ نوعِ بشر کا غم ہے۔ ذاتی اس لیے دکھائی دیتا ہے کہ شاعر نے جملہ نوعِ انساں کے غم کو اپنا ذاتی غم بنا لیا ہے۔ وہ جن غموں کا ذکر کرتا ہے وہ بنی آدم کو ہمیشہ سہنے پڑے اور سہنے پڑ رہے ہیں۔ شاعری کی یہ داخلیت اصل میں خارجیت ہی کی پیدا کردہ ہے اور اس نے ان دونوں کو اس انداز سے مدغم کر دیا ہے کہ یہ اس کا شخصی معاملہ بن گیا ہے۔ عام نگاہیں اس حُسنِ اختلاط کو دیکھ نہیں پاتیں۔ بے دردی کے خلاف یہ شکایت غزل کی زبان میں کی گئی ہے — بے دردوں کی مذمت ضرور کی گئی ہے لیکن ان کا انسانیت پر غالب آ جانا تسلیم نہیں کیا گیا چنانچہ بحیثیت فرو جہاں غم کا اظہار کیا گیا ہے وہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ فرد غم کا شکار ہے، مگر کس کے ہاتھوں؟ افراد ہی کے ہاتھوں! یہ شکاری (بالفاظِ میرؔ "صید بنداں") اسے خون میں نہلا دیتے ہیں مگر ان کا یہ شکار زبوں حالی میں بھی فخر کا پہلو تلاش کر کے اخلاقی فتح اپنی ہی قرار دیتا ہے ؎

تو زبوں شکار تو ہے وے میرؔ قتل گہ میں
ترے خوں سے ہیں حنائی کفِ پائے صید بنداں

یہاں غاصبانِ سنگدل پر چوٹ کی گئی ہے جو پوشیدہ ہوتے ہوئے بھی آشکار ہے۔ میرؔ کو معلمِ اخلاق کہلانے کا شوق نہیں لیکن وہ رہتے اسی بات پر ہیں کہ انسان نے انسانی اقدار کو یکسر پسِ پُشت ڈالتے ہوئے خیر و نیکی کا مفہوم تک فراموش کر رکھا ہے۔ خود غرضی، بے مروّتی، سفاکانہ بے رحمی، پامالیٔ حقوق العباد، دوستی کے پردے میں دشمنی وغیرہ جیسی مکروہات میں وہ اس درجہ بے باک ہے کہ آدم فریبی اور مردم آزاری ہی کو کمالِ آدمیت تصوّر کرتا ہے یہاں تک کہ نمائشی زہد و عبادت کو توشۂ آخرت کہتے ہوئے بھی نہیں شرماتا۔ زبان سے یہ کہنا کہ سجدہ صرف اللہ کے لیے ہے لیکن حصولِ مطلب کے لیے کمر دوہری کر کر کے

درباروں میں کورنش بجالانا اس کے نزدیک کوئی گناہ بھی نہیں! لیکن میرؔ اپنی تمام مفلسی، ہتک دستی اور قلاشی کے باوجود رسمِ زمانہ کے برعکس اعلان کرتے ہیں کہ ؎

جھکے سلام کسی کو کرنا سجدہ ہی ہو جاوے ہے ۔ سر کو جاوے اس میں میرا سر نہ فرو میں لاؤں گا

کیا یہ اعلان دوسروں کے لیے دعوتِ فکر نہیں؟ کیا قبولِ دعوت کا مطلب ترکِ باطل پہ آمادگی کا اظہار نہ ہوگا؟ اور رفعِ فتنہ دشر ہی وہ آفاقی قدر ہے جو کسی بھی زمانے کے کسی بھی معاشرے کے لیے خیر و برکت کا باعث بن سکتی ہے۔ ماضی کی تحریریں کا مطالعہ اگر اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ ان کا حال سے کیا رشتہ ہے یا کوئی رشتہ ہے بھی کہ نہیں تو میرؔ کا مقام اور بھی بلند نظر آئے گا کیونکہ وہ جن دکھوں کی بات کرتے ہیں وہ آج بھی انسان کو لاحق ہیں۔ تخلیقِ فن کا مقصد اگر رہروانِ ہستی کی رہنمائی ہے تو کلامِ میرؔ چراغِ راہ بھی ہے اور منزلِ مقصود بھی۔

میرؔ راست روی، راست گوئی اور راست کرداری کی شمعیں فروزاں کرنا چاہتے ہیں خلوصِ عمل اور تصحیحِ اخلاق کو انسانیت کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ انہی صفات سے وہ انسان کو عاری پاتے ہیں تو اس کی بے راہ روی پہ آنسو بہاتے ہیں۔ اسی گریہ و زاری کو ان کا ذاتی غم تصور کر لیا جاتا ہے حالانکہ یہ انسان کی فریاد ہے بنامِ انسان، انسانیت کی پکار ہے بحضورِ انسانیت! میرؔ تو محض اس کے ترجمان ہیں ؎

شعر کے پردے میں مَیں نے غم سنایا ہے بہت ۔ مرثیے نے دل کے بھی میرے رلایا ہے بہت

لیکن لوگوں کا ردِ عمل انھیں یہ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے ؎

ہیں گھاؤ دل پہ اپنے تیغِ زباں سے سب کی ۔ تب درد ہے ہمارے اے میرؔ ہر سخن میں

یہ درد ایسے ہر انسان کا ہے جس نے انسان کو انسانیت کے لباس میں دیکھنا چاہا لیکن معاملہ یکسر برعکس پایا کیونکہ انسان نے انسان کُشی کا عمل ہمیشہ جاری رکھا۔ اسی لیے میرؔ کبھی کبھی اس خواہش کو محض سادہ لوحی بھی تصور کرنے لگتے ہیں ؎

چشمِ وفا اخوانِ زماں سے سادہ ہو سو میرؔ رکھے ۔ قصہ ہے مشہورِ زمانہ پہلے دونوں بھائی کا

اس تلمیحِ بلیغ میں انسان کے ابتدائے آفرینش سے ستم کیش ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ صاحب دلوں اور صاحب نظروں نے اس پر ہمیشہ آنسو بہائے، انہی میں سے ایک میرؔ بھی ہیں۔ انھوں نے شخصی محرومی کے پردے میں انسانیت کی جنتِ گم گشتہ کا ماتم کیا ہے اور اس کی بازیافت کے لیے احترامِ آدمیت کو کلیدِ کامرانی قرار دیا ہے، یہی ان کا آفاقی پیغام ہے اور لوگوں کی اسی سے روگردانی ان کا آفاقی غم ہے جس میں کسی بھی دَور کا اجتماعی غم از خود شامل ہے لیکن اسے سمجھنے کے لیے سخنِ میرؔ کی پہلو داری سے آگہی ضروری ہے۔ انہوں نے داخلی کیفیات اور خارجی زندگی کو اس صفائی سے مربوط کر دیا ہے کہ بظاہر وہ محض ذاتی واردات ہی معلوم ہوتی ہیں جب کہ شاعر کی مراد کچھ اور بھی (بلکہ اور ہی) ہوتی ہے ؎

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میرؔ ۔ کیا کیا کہا کرے ہیں زبانِ قلم سے ہم

غزل کے روایتی مزاج شناسوں کو اسی لیے میرؔ کی دلگیری کا احساس تو شدت سے ہوتا رہا لیکن اس کی ہمہ گیری کا کمان

کی رسائی نہ ہو پائی ! ہم نے اجتماعی غم کا ذکر خصوصی طور پر اس لیے کیا ہے کہ یہی وہ غم ہے جس سے بے اعتنائی یا بے خبری کا الزام میرؔ پر شدومد سے لگایا جاتا ہے حالانکہ یہ اصطلاح بجائے خود خاصی گمراہ کن ہے۔ ایسا غم کب اور کہاں دیکھنے میں آیا تھا جسے کسی پورے کے پورے معاشرے نے فرداً فرداً محسوس کیا ہو ؟ میرؔ جن چور اچکوں سکھ مرہٹوں کی مذمت کرتے ہیں وہ بھی اسی اجتماع کا حصہ تھے ۔ ان کے علاوہ ہزاروں حواریوں سمیت محلاتی سازشوں میں مصروف لوگ بھی اسی اجتماع میں شامل تھے ، لیکن کیا یہ سبھی بے درد اس اجتماعی غم میں بھی شریک تھے ؟ پھر دردمندوں اور بے دردوں کے مخلوط اجتماع میں وہ غم کہاں دکھائی دے گا جسے اجتماعی غم سے تعبیر کر سکیں ؟ پس اس مفہوم میں تو میرؔ کا غم واقعی اجتماعی نہ تھا لیکن اصل میں وہ تھا ہی اجتماعی نہ کہ انفرادی ! کیونکہ اجتماع کا جو گروہ واقعی سوگوار تھا اس کے سوگ میں تو میرؔ نہ صرف شریک تھے بلکہ اس کا مداوا چاہتے تھے ، البتہ چور ، لٹیروں ، سازشیوں ، غداروں اور باغیوں کے "غموں" میں وہ شریک نہ ہو سکے نہ ہو سکتے تھے۔ انفرادی پہلو اگر تھا تو فقط یہ کہ اس صاحب غم کا احساس منفرد تھا ، ایسا منفرد کہ اس نے پورے اجتماع کی بے حسی کو اتنی شدت سے محسوس کیا کہ اسے اپنا انفرادی غم بنالیا ! میرؔ کا غم اجتماع "کا" غم نہیں تھا ، اجتماع "کے لیے" تھا ، وہ اجتماع جو ان کے پاکیزہ احساس میں شرکت کے لیے آمادہ نہ تھا ! کیونکہ میرؔ چاہتے تھے آدمی کو انسان کے روپ میں دیکھنا اور یہی روپ اس اجتماع کو ناپسند تھا ! نہ ایسا ہو سکا نہ غم میرؔ کا خاتمہ ممکن ہوا جس سے کبھی کبھی وہ خود بھی تنگ آجاتے ہیں ؎

حصولِ کام کا دل خواہ یاں ہوا بھی ہے   سماجت اتنی بھی سب سے کوئی خدا بھی ہے
کہاں تلک کہ شب و روز دردِ دل کہیے   ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

سب سے زیادہ مایوسی انھیں ان لوگوں سے ہوئی جو دین و مذہب کی آڑ میں دام فریب پھیلائے ہوئے تھے ۔ ان لوگوں کو خدا تک رسائی کا دعوی تو تھا لیکن انسان کے دکھ درد تک رسائی کی توفیق کبھی نہ ہوئی ؎

بندے کے دردِ دل کو کوئی نہیں پہنچتا   ہر ایک بے حقیقت یاں ہے خدا رسیدہ

خرقۂ سالوس میں چھپے ہوئے ان عیاروں سے وہ اہلِ خطا و عصیاں بہتر جو اپنی سیاہ کاریوں پر دینی تقدس کا غلاف تو نہیں چڑھاتے ، جیسے ہیں ویسے ہی نظر تو آتے ہیں ، منافقوں سے تو جی گھبرا گیا ؎

اُداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابلِ سیر   صنم کدہ میں تو ٹک آکے دل لگا بھی ہے

یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ "احترامِ آدمیت" کا یہ مطلب شاعر کے ذہن میں نہیں ہے کہ ہر فرد معاشرے کے دیگر تمام افراد سے فرداً فرداً نیکی کا مظاہرہ کرے ، ہر فرد کا ہر فرد سے رابطہ عملاً ہوتا بھی نہیں اور نہ یہ ممکن ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کا جتنے افراد سے عملاً رابطہ یا واسطہ ہو ان کے ساتھ تو نیک نیتی اور نیک خوئی سے معاملہ کرے ۔ خلوص و وفا کا مظاہرہ کرے اور انہیں نقصان پہنچا کر اپنا فائدہ تلاش نہ کرے ۔ اس کی حقیر ترین صورت بھی قابلِ ستائش ہوگی ۔ یعنی کسی کو فیض نہ پہنچا سکیں تو اتنا تو بہر حال کر سکتے ہیں کہ کسی کو ضرر یا آزار نہ پہنچائیں یہ بجائے خود احترامِ آدمیت کی ایک احسن صورت ہے ۔ لیکن انسان ادھر مائل ہی نہیں ہوتا ۔ اس کے نزدیک وہ نفع

ہی کیا جو کسی کو نقصان پہنچائے بغیر حاصل ہو، وہ راحت ہی کیا جو کسی کو مبتلائے آزار نہ کر سکے، وہ عزت و آبرو کیسی جو دوسروں کو رسوا کرنے میں ناکام رہے۔! عقل و ذہانت کی برتری برحق لیکن ابنائے زمانہ نے اس کو چالاکی عیاری فریب مکاری کا مترادف بنا کے چھوڑا اور جن لوگوں نے ایسی عقل و ذہانت سے کام نہ لیا زندگی ان کے لیے عذاب بنی رہی حالانکہ ان کے درد کی دوا فقط مروّت ہم نفساں تھی اور وہ اسے جانتے بھی تھے مگر چارہ گری ان کا شیوہ ہی کب تھا ؎

چارہ گری بیماریِٔ دل کی رسمِ شہرِ حسن نہیں ۔۔۔ ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارہ جانے ہے

چنانچہ میرؔ جب کہتے ہیں کہ ؎

راہ میرؔ غریبانہ جاتا تھا چلا روتا ۔۔۔ ہر گام گِلہ لب پہ یارانِ وطن کا تھا

تو مراد یہ ہوتی ہے کہ وطن میں رہتے ہوئے بھی غریب الوطن ہیں کیونکہ انسانیت کا جو تصوّر وہ پیش کرتے ہیں وہ اہلِ وطن کے لیے عجیب ہے! وہ دشمنانِ انسانیت تو جملہ اخلاقی اقدار کی نفی ہی کو دنیاوی کامرانیوں کی کلید تصوّر کرتے ہیں ـــــ یہی ہیں اسباب و علل غمِ میرؔ کے! اور یہ اسباب اتنے متنوع، کثیر التعداد اور اذیت رساں تھے کہ میرؔ کی پوری زندگی انہی کے پیدا کردہ غموں میں گزر گئی۔! انھوں نے ہر قدم پر انسان کو قاتل ہی کے روپ میں دیکھا ـــــ قاتلِ مروّت، قاتلِ وفا، قاتلِ خلوص، قاتلِ خیر ـــــ اسی لیے ان کے ہر شعر پر خون کے چھینٹے دکھائی دیتے ہیں!

میرؔ دنیا کو جس حالت میں دیکھنے کے متمنی تھے وہ کوئی ناممکن صورت یا انہونی بات نہ تھی۔ انھوں نے یہی چاہا تھا کہ انسان انسانیت کو اپنا کر اسی کرۂ ارض کو بہشتِ بریں کے لیے قابلِ رشک بنا دے۔! اسی حسرت میں وہ ساری زندگی خارزارِ درد و الم میں سرگرداں رہے جس سے ان کا تن بدن مجروح و داغدار ہوتا رہا اور ہر عضوِ بدن زخم ہائے غم سے چوُر چوُر! چنانچہ اعضائے بدن کی خستگی و شکستگی کا ذکر وہ بار بار کرتے ہیں، اتنی بار ـــــ اتنی بار کہ تالیفِ ہٰذا کی تحریک ہی اسی اعادہ و تکرار سے ہوئی۔ اس کے وسیع تر پسِ منظر میں یہ حقیقت صاف دکھائی دیتی ہے کہ میرؔ کا بدن ایک علامت کی حیثیت سے مذکور ہے اصل میں یہ پوری انسانیت کا بدن ہے جو خود انسان ہی کے ہاتھوں مجروح و داغ داغ ہے! اس طرح میرؔ بظاہر اپنے لیکن در پردہ انسانیت کے بدن کی بات کرتے ہیں۔!!

میرؔ کا عہد شمالی ہند میں اردو شاعری کا ابتدائی دَور تھا جب وہ فارسی شاعری کی صدیوں پرانی روایت کے تحت اپنی نشو و نما کے اوّلین مراحل سے گزر رہی تھی اور نئے تجربات کی گنجائش کم ہی تھی لیکن میرؔ نے اعضائے بدن اور بعض دیگر الفاظ و تراکیب کو علامتی رنگ میں استعمال کر کے ایک ایسی طرح ڈالی کہ اسے روایت سے بغاوت کا نام نہ دیں تو بھی ایسی جدّت تو تسلیم کرنا ہی ہو گا جس کے نتائج بہت دُور رس ثابت ہوئے۔ بلاشبہ ان کے ہاں بہت سارے اشعار روایتی انداز کے ہیں نہ صرف الفاظ و تراکیب کی حد تک بلکہ معنی و مضمون کے اعتبار سے بھی لیکن یہ حقیقت اس کے باوجود قائم رہتی ہے کہ بہت سے روایتی الفاظ و تراکیب کو نئے معنی پہنانے کی ابتداء میرؔ ہی سے ہوئی تھی۔ غور کریں تو یہ جدّت بغاوت کے جملہ مفاہیم پر محیط نظر آتی ہے وہ جبر و تعدّی کے جالبوں میں لپٹی ہوئی اعلٰی اخلاقی اقدار کو بے نقاب دیکھنے کے ساتھ ساتھ منافقوں اور استحصال پسندوں کا پردہ بھی چاک کرنا چاہتے

ہیں۔اسی لیے ان کی شاعری خواب آور نہیں کیونکہ وہ افسانہ نہیں سُناتے بلکہ سرگزشت سناتے ہیں اور سرگزشت اگر دردناک ہو تو اس میں افسانے کی سی غنودگی کہاں سے آئے گی ؎

یہ سُنا تھا میرؔ ہم نے کہ فسانہ خواب لائے تری سرگذشت سُن کر گئے اور خوابِ یاراں

لیکن "یاراں" کا اشارہ یہاں فقط ان مٹھی بھر صاحب دلوں اور صاحب نظروں ہی کی طرف معلوم ہوتا ہے جو میرؔ کی بات سمجھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ یہ نہیں کہ میرؔ کے پیغام کو سمجھنا دشوار تھا یا اس میں کوئی پیچیدگی پائی جاتی تھی۔ وہ بات تو اتنی سادہ اور عام فہم تھی کہ عام سے عام آدمی بھی اسے بخوبی سمجھ سکتا تھا اور سمجھتا ہوگا لیکن بات تو اس پہ عمل پیرا ہونے کی تھی اور یہی چیز ان لوگوں کو ناپسند تھی —— ورنہ میرؔ کے مخاطب تو دراصل عوام ہی تھے، اسی لیے وہ اپنے اشعار کو خواص پسند کہتے ہوئے بھی اپنا اصل مخاطب عوام ہی کو قرار دیتے ہیں ؎

شعر میرے ہیں گو خواص پسند پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اور یہی عوام جن کے دکھوں کا مداوا میرؔ چاہتے ہیں ان کی بات پر کان نہیں دھرتے، چنانچہ میرؔ جب کہتے ہیں کہ ؎

تری چال ٹیڑھی تری بات اُلٹی تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے

تو بظاہر اپنے آپ پر لیکن درحقیقت ان لوگوں پر طنز کرتے ہیں جو ان کی سیدھی بات کو سمجھنے کی کوشش تو خود نہیں کرتے اور کج روی و کج گفتاری کا الزام اُلٹا میرؔ پر لگاتے ہیں! گویا جن کی خاطر شاعر کا دل مجروح و داغدار ہے وہی اس پہ نمک پاشی کر کے اسے مزید تکلیف دہ بنا رہے ہیں ؎

داغوں ہی سے بھری رہی چھاتی تمام عمر یہ پھول گل چُنا کیے باغِ وفا سے ہم

روایتی الفاظ و تراکیب کو نئے معنی عطا کرنے کی مثالیں میرؔ کے ہاں تلاش نہیں کرنا پڑتیں وہ جگہ جگہ موجود ہیں مثلاً ؎

بعد خونریزی کے تہمت ہے حنا رنگیں رہا ہاتھ اس کا جو مرے لوہو میں گستاخانہ تھا

فوراً سمجھ میں آجاتا ہے کہ اشارہ ان لٹیروں کی طرف ہے جو مجبوروں کے حقوق غصب کر کے اپنے ہاتھ رنگتے ہیں اور پھر مدتوں تک بلا محنت و مشقت عیش کیا کرتے ہیں ۔ معنی کی گہرائی اس وقت "رمزیت" کی بلندیوں کو چھونے لگتی ہے جب وہ ان ظالموں کی بات کرتے ہیں جو ظلم کے ساتھ ساتھ منافقانہ ہمدردی بھی جتاتے ہیں اور ایسے مشورے دیتے ہیں جن پر عمل کر کے مظلوم اور بھی زیادہ گرفتارِ اذیت ہو جاتا ہے بلکہ پچھتانے پہ مجبور ہو جاتا ہے ؎

جب تک شگاف تھے کچھ آتا نہ دم تنگ تھا پچھتائے ہم نہایت سینے کے چاک سی کر

بیانِ کرب میں مزید بلاغت اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب وہ ظالم و جابر سے دوستانہ مکالمے کا انداز اختیار کر لیتے ہیں ؎

ہر طرف ہیں اسیر ہم آواز باغ ہے گھر ترا تو اے صیاد

مکالماتی ہجوِ ملیح کا ایک انداز وہ ہے جہاں کسی اور سے گفتگو کے دوران ظالم کا ذکر اس کی غیر حاضری میں کیا گیا ہے ؎

کشتنِ مرداں اگر ہے ثواب تو ہوا ہے اسے ثواب بہت

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ میرؔ کے وقت میں یہ "ثواب" کئی لوگوں نے لُوٹا تھا اور میرؔ اس دنیا کو "بسمل گاہ" کہنے

لگے تھے لیکن خوف سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ جان کی بازی لگانے کا حوصلہ دلانے کے لیے ؎

بن جی دیے نہیں ہے امکان یاں سے جانا — بسمل گہ جہاں میں اب ہم تو میرؔ آئے

غمِ انسانیت سے معمور اور آفاقی صداقتوں سے بھرپور یہ کلام میرؔ کے فردِ گیر ہونے سے زیادہ ان کے ہمہ گیر ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ جدید اردو شاعری نے رمزیت کا انداز میرؔ ہی سے سیکھا ہے ؎

سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا!

جدید نقادوں کی نسبت جدید شاعروں نے "میرؔ شناسی" کی کوشش زیادہ خلوص اور سنجیدگی سے کی ہے اس لیے کہ عالمی سیاسی بیداری کے اس دور میں انسان، انسانیت اور بقائے باہمی سے متعلق جن "نسخہ ہائے وفا" اور آفاقی صداقتوں کی تلاش جدید شاعروں کو ہے ان کا سراغ اردو کے شعری ورثے میں دواوینِ میرؔ ہی سے مل سکتا ہے ـــــ یہ بجائے خود گفتۂ میرؔ کے آفاقی ہونے کی دلیل ہے ؎

عالم کی سیر میرؔ کی صحبت میں ہو گئی — طالع سے میرے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

یزدانی

سمن آباد لاہور
سولہ جون ۱۹۸۳ء

کلامِ میرؔ کا ایک منفرد عنصر

سخنِ میرؔ اور بدنِ میرؔ

کلامِ میرؔ میں اعضائے بدن کا ذکر اس کثرت سے دکھائی دیتا ہے کہ ان کی غزلیات کے تیرہ ہزار پانچ سو اٹھتر (۱۳۵۷۸) اشعار[1] میں سے چھ ہزار سات سو چھیالیس (۶۷۴۶) اشعار میں دل، جگر، سینہ، آنکھ، دماغ، ہاتھ، پاؤں، سر، زبان یا کسی نہ کسی دیگر "عضوِ بدن" کو مضمونِ شعر میں کلیدی حیثیت حاصل ہے (یا کم سے کم ایک خاص اہمیت اسے ضرور دی گئی ہے)!

ان کی شاعری کا یہ منفرد عنصر کلام کے قریباً پچاس فیصد حصّے پر محیط نظر آتا ہے! ہمارے نزدیک یہ انفرادیت خصوصی توجہ کی متقضی ہے (اور دعوتِ تحقیق تو دیتی ہی ہے) لہٰذا ہمیں خیال آیا کہ کیوں نہ ایسے تمام اشعار کو یکجا کر دیا جائے! تالیفِ ہٰذا کا مقصد اسی خیال کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ اشعار کے اس مجموعے کو ہم نے "بدن نامۂ میرؔ" سے موسوم کیا ہے۔ اعضائے بدن کی اس فہرست میں مذکورہ بالا اعضاء کے علاوہ منہ (دہن)، پاؤں، ہاتھ (دست) چہرہ (رُو، رُخ)

---

[1] یہ تعداد آسیؔ کی مرتّب کردہ "کلیاتِ میرؔ" کے مطابق ہے ورنہ نسخہ کلکتہ مطبوعہ (فورٹ ولیم کالج) ۱۸۱۱ء میں یہ تعداد چودہ ہزار سے متجاوز ہے۔ سات سو سے کچھ زائد اشعار کا فرق ہے جو آخری دو دواوین میں پایا جاتا ہے، جب کہ پہلے تین دیوان کم و بیش یکساں تعداد کے حامل ہیں۔ آسیؔ کے ہاں تفصیل یوں ہے:-

دیوان	تعداد غزلیات	تعداد اشعار	تعداد اشعار جن میں اعضائے بدن کا ذکر ہوا ہے
اوّل	۶۶۳	۴۲۷۷	۲۰۹۸
دوم	۳۸۰	۳۴۱۵	۱۷۴۰
سوم	۲۴۸	۱۸۳۱	۹۳۹
چہارم	۲۰۶	۱۳۰۷	۶۷۵
پنجم	۲۳۹	۱۶۵۲	۷۹۸
ششم	۱۳۱	۱۰۹۶	۴۹۶
میزان	۱۸۶۷	۱۳۵۷۸	۶۷۴۶

لب (ہونٹ)، جان (جی)، آنکھ اور چشم کے ساتھ متعلقاتِ چشم یعنی پلک، مژہ، نظر (نگاہ) دیدہ، اشک، آنسو (گریہ) وغیرہ اور رُخسار، گردن (حلق، گلا) دانت (دنداں) گوش (کان) ناخن، پیشانی (جبیں، ماتھا) کمر، بغل وغیرہ شامل ہیں۔ جان لغوی معنی میں کسی مخصوص عضوِ بدن کا نام نہیں ہے لیکن ہر عضو کا وجود اسی کا مرہونِ منت ہے، جسم کے ہر حصے کی تکلیف جان ہی کو محسوس ہوتی ہے۔ ہر عضو کی ہر کیفیت جان ہی سے وابستہ ہے، جان ہی نہ ہو تو کیسا بدن اور کہاں کے اعضائے بدن؟ لہٰذا فہرست میں اس کی شمولیت ناگزیر ـــــ ورنہ فہرست خود بے جان ہو کر رہ جائے!

"متعلقاتِ چشم" میں جہاں ہم نے اشک (آنسو) وغیرہ کو شامل فہرست کیا ہے وہاں "رونا" کو شامل نہیں کیا حالانکہ یہ بھی چشم ہی سے متعلق ہے لیکن یہ فعل ہے جب کہ عضو کا اسم ہونا لازم ہے[1]۔ بلکہ ہم نے بہت سے ایسے اعضائے بدن کو بھی شاملِ فہرست نہیں کیا جن کا ذکر مختلف اشعار میں ہوا تو ہے اور وہ اسم بھی ہیں لیکن اعادہ کئی بار نہیں ہوا مثلاً

ضعف پیری میں زندگانی بھی
دوش پر اپنے بار سا ہے کچھ

یاں جرم گنئے انگلیوں کے خط بھی مٹ گئے
واں کس طرح سے دیکھیں ہمارا حساب ہو

کیا ہے جو زنخ نن ہو مہ پاس کا ستارا
ہے داغ جانِ عالم ٹھوڑی کا خال تیرا

باچھیں پھٹ پھٹ گئی ہیں گھگھیاتے
بے اثر ہو گئی دعا افسوس

خوبی کو اس کی ساعدِ سیمیں کی دیکھ کر
صورت گردں نے کھینچ لیا ہاتھ کے تئیں

اس سے تشبیہ تو دیتے ہیں یہ ناشاعر لیک
سیب کچھ ذقن کے آگے جو مزا رکھتا ہو

ہاتھ سے وہ گئی جو سیمیں ساق
ہم ہے سر بزانو و مغموم

ان اشعار میں خط کشیدہ الفاظ (دوش، انگلیاں، ٹھوڑی، خال، باچھیں، ساعد، ذقن، زانو) سب کے سب اعضائے بدن ہی کے نام ہیں لیکن ان سے متعلق تعدادِ اشعار بہت نمایاں نہیں اس لیے شاملِ فہرست نہیں کیے گئے البتہ ان میں سے بعض از خود اس وجہ سے شامل ہو گئے ہیں کہ ان کے ساتھ شعر میں کوئی ایسا عضو بھی مذکور ہے جو شامل فہرست ہے مثلاً درج بالا آخری شعر میں زانو کے علاوہ ہاتھ اور سر کا ذکر بھی موجود ہے چنانچہ یہ شعر ان اشعار میں آگیا ہے جو سر کے عنوان کے تحت درج کیے گئے ہیں۔[2]

ایک ہی شعر میں مختلف اعضاء کا ذکر.....

یہ ضروری نہیں کہ ایک شعر میں کسی ایک ہی عضو کا ذکر کیا گیا ہو بلکہ بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں دو یا تین یا چار اعضاء بیک وقت مذکور ہیں ـــــ اور ان میں بلحاظ

---

[1] اسی لیے اشک وغیرہ کو متعلقات چشم کے طور پر شامل کیا گیا ہے کہ یہ نہ صرف اسم ہیں بلکہ بالواسطہ اعضائے بدن ہی ہیں مثلاً اشک کے بارے میں میر خود کہتے ہیں ؎

کہتے ہیں سب کہ خون ہی ہوتا ہے اشکِ چشم
راتوں کو گریہ ہے ٹپکا تو جگر نہیں

[2] فہرست میں شامل نہ کیے جانے والے اعضاء کی تفصیل آخر میں اپنے مقام پر درج ہے۔

معنی ومضمون خاص ربط پایا جاتا ہے مثلاً ؎

چھاتی میں بھری آگ ہے کیا جس سے شب و روز
چنگاریاں گرتی ہیں مری پلکوں کی صف سے

اسی طرح درج ذیل اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں جن میں تین تین یا چار چار اعضاء کا ذکر بیک وقت دکھائی دے گا ؎

گہہ لوہو ٹپکتا ہے گہہ لختِ دل آنکھوں سے
یا ٹکڑے جگر ہی کے ہر آن نکلتے ہیں

پایا نہ دل بہایا ہوا سیلِ اشک کا
یُں پنجۂ مژہ سے سمندر بلو چکا

داغ اور سینے میں کچھ بگڑی نہ ہے، عشق دیکھیں
دل کو جگر کو، کس کو اب درمیاں دے گا

پلکوں پہ تھے پارۂ جگر رات
ہم آنکھوں میں لے گئے بسر رات

کس کو ہر دم ہے لہو رونے کا ہجراں میں دماغ
دل کو اک ربط سا ہے دیدۂ خونبار کے ساتھ

دل نظر و دیدہ پیشکش اے باعثِ حیات
سچ کہہ کہ جی لگے ہے ترا کس مکان میں

دل جگر جان یہ بھسمنت ہوئے سینے میں
گھر کو آتش دی محبت نے جلا کیا کیا کچھ

لیتا ہی نکلتا ہے مرا لختِ جگر اشک
آنسو نہیں گویا کہ یہ ہیرے کی کنی ہے

جب تک ہو خون دل میں جگر میں مژہ ہو نم
تب کچھ بھی جو نہ ہووے تو کیا چشم تر رہے

چشم و دل و دماغ و جگر سب کو رو رہے
اس عشق خانہ سوز نے کیا کیا دکھائے داغ

قطعہ بند اشعار اور اعضائے بدن

غزلیات کے قطعہ بند اشعار میں ایک معنوی ربط و تسلسل تو ہوتا ہی ہے کیونکہ اس کی ضرورت ہی وہاں پڑتی ہے جہاں کوئی مفہوم ایک شعر میں ادا کرنا ممکن نہ ہو لیکن میرؔ کے ہاں یہ ربط و تسلسل بھی اکثر و بیشتر اعضائے بدن ہی کی مدد سے قائم کیا گیا ہے مثلاً ؎

خوں بستہ اپنی کھول مژہ پوچھتا بھی گر
رکھ ٹک تو اپنے حال کو تہ نظر کہیں

موتی سے اشک میں غلطاں کسو طرف
یاقوت کے سے ٹکڑے ہیں لختِ جگر کہیں

تعیینِ جا کو بھول گیا ہوں پہ یاد ہے
کہتا تھا ایک روز یہ اہلِ نظر کہیں

بیٹھے اگرچہ نقشِ تنا تو بھی دل اٹھا
کرتا ہے جائے باش کوئی رہگزر کہیں

کتنے ہی لے کے آئے سرِ پُر خیال پر
ایسے گئے کہ کچھ نہیں ان کا اثر کہیں

بعض غزلیات میں متعدد اعضاء کے بیان میں کسی ایک عضو پر خاص زور دیا گیا ہے مثلاً درج ذیل غزل میں چھاتی، چشم، دل، دماغ، جگر سب ہی مذکور ہیں لیکن مرکزی حیثیت چھاتی کو دی گئی ہے ؎

اب اس کے غم سے جو کوئی چاہے سو کھائے داغ
باقی نہیں ہے چھاتی میں اپنی تو جائے داغ

چشم و دل و دماغ و جگر سب کو رو رہے
اس عشقِ خانہ سوز نے کیا کیا دکھائے داغ

گیا لالہ ایک داغ پہ پھولے ہے باغ میں
بہتیرے ایسے چھاتی پہ ہم نے جلائے داغ

آخر کو روئے کار سے پردہ اُٹھے گا کیا — مقدور بھر تو چھاتی کے ہم نے چھپائے داغ

اسی طرح وہ جملہ غزلیات جن میں کسی عضو کا نام (مثلاً دل، دماغ، آنکھ، سر، چشم وغیرہ) بطور ردیف استعمال ہوا ہے وہاں غزل کی روایتی بے ربطی اور اشعار کے مختلف المضمون ہونے کے باوجود ایک معنوی ربط اس عضو سے متعلق نمایاں رہتا ہے۔

مختلف اعضا کے بیک وقت ذکر کے باوجود عدم تسکین کی صورت میں.....!

بعض جگہ میر دو، تین یا چار اعضا کی خستگی و شکستگی کے ذکر کو شدتِ احساس کی تسکین کے لیے ناکافی پاتے ہیں تو "جملہ اعضا"، "اعضائے بدن"، "ہمگی پیکر"، "تمام اعضا"، "اجزائے بدن"، "سارا بدن"، جیسی تراکیب استعمال کرتے ہیں بلکہ اس پہ بھی مطمئن نہ ہونے کی صورت میں "سارے حواس"، "پانچوں حواس" وغیرہ کہہ کر بارِ الم کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مثال کے طور پر:

اعضا

سارے رئیس اعضا ہیں معرضِ تلف میں — یہ عشق بے محابا کس کو امان دے گا

ے ″ اعضا گداز عشق میں ایک ایک بہہ گئے — اب کیا رہا ہے مجھ میں جو ئیں نیم جاں رہا

ے ″ ہوا جو دل خوں خرابی آئی ہر ایک اعضا میں ہے خراب — حواس گم ہیں دماغ گم ہے رہا سہا بھی گیا شعور اب

ے ″ کیا کہئے کہ اعضا سب پانی ہوئے ہیں اپنے — ہم آتشِ ہجراں میں یونہی پڑے گلتے ہیں

ے ″ ہو گئے تحلیل اعضا سب مرے پاکر گداز — رفتہ رفتہ ہجر کا اندوہ مجھ کو کھا گیا

ے ″ کیوں نہ ہو ضعف غالب اعضا پر — مر گئے ہیں تشنن کے سردار

ے ″ پوچھ اس سے دردِ ہجر کو جس کا یہ ناز کی — جا گہ سے اپنی عضو کوئی بے جگہ ہوا

ے ″ پانی ہو بہہ گئے سب اعضا بدن کے لیکن — یوں بھی کہا نہ ان نے وہ چشم تر کہاں ہے

ے ″ عشق میں کیا جو جان چلی ہے الفت تھی یا کلفت تھی — کوٹے گئے ہیں سب اعضا یہ محبت تھی یا محنت تھی

جسم

آگ میں غموں کی ہو کے گداز اں جسم ہوا سب پانی سا — یعنی بن ان شعلہ رُخوں کے خوب ہیں ہم بھی تائے گئے

ٹک ترکِ عشق کر دیئے لاغر ہوئے بہت ہم — آدھا نہیں رہا ہے اب جسم رنج فرسا

عبرت سے دیکھ جس جا یاں کوئی گھر بنے ہے — پردے میں جسم ڈھے کر دیوار و در بنے ہے

کشتے کی اس نے خاک بھری جسم زار پر — خالی نہیں ہیں لطف سے لوہو کی دھاریں

آلودہ کر نہ مستی سے جامے کو جسم کے — ہوشیار رہ یہ عاریتی ہے لباس پلس

اس جسم خاکی سے ہم مٹی میں اَٹ رہے ہیں — یوں خاک میں ہمیشہ کوئی رہے کہاں تک

تن / بدن / تن بدن

ے ″ کم ہم نے تب درد نے کی سوزش سے عافیت — سب تن بدن اس آگ نے اپنا بھسم کیا

ے ″ تیغِ جفائے خوباں بے آب تھی کہ ہمدم
زخمِ جگر ہمارے تفسیدہ ماہیاں ہیں

ے ″ بہہ بھی گیا بدن کا سب ہو کے گوشت پانی
اب کار دا اے عزیزاں پہنچی ہے استخواں تک

ے ، ہے نمک سود سب تن مجروح
تیرے کشتوں میں میرزا ہیں ہم

دیوان ا ے اجزا بدن کے جتنے تھے پانی ہو بہہ گئے
آخر گدازِ عشق نے ہم کو بہا دیا

دیوان ا ے سالک بہر طریق بدن ہے وبالِ جاں
یہ بوجھ تیرے ساتھ جو ہے اس کو ڈال چل

دیوان ۶ ے دل کی تسلی جبکہ ہمگی گفت وشنود سے لوگوں کی
آگ بھڑکے گی غم کی بدن اس میں جلنے بھننے لگا

ہمگی پیکر

ے ڈوبا لوہو میں پڑا تھا ہمگی پیکر میر
یہ نہ جانا کہ لگی ظلم کی تلوار کہاں

حواس/پانچوں حواس/سارے حواس

ے جمع ہوتے نہیں حواس کہیں
جائیں یاں سے جو ہم اداس کہیں

ے سارے حواس میرے پریشاں ہیں عشق میں
اس راہ میں یہ قافلہ سارا لٹا گیا

ے پانچوں حواس گم ہیں ہر اک کے اس سے ہیں
کیا میر جی ہی تنہا ان روزوں دو دے ہیں

ے چاہ میں اس بے الفت کے گھبراہٹ دل ہی کو تو نہیں
سارے حواسوں ہیں ہے تشتت جان بھی ہے گھبرائی ہوئی

ے تنہا دو دِلاّ وصال میں بھی میں کہ ہجر میں
پانچوں حواسوں کی تو پراگندگی ہوئی

ے ہوئے ہیں حواس اور ہوش و خرد گم
خبر کچھ تو آئی ہے اس بے خبر تک

ے عاشق ہوئے کہاں ہم پانچوں حواس کھوئے
اس مخمصے میں ازبس حیراں ہے کیا کرے دل

انفرادی شکستگی کے ساتھ اجتماعی پراگندگی کا ماتم

میر کی نظر اپنے حواسوں کے تشتت ہی تک محدود نہیں بلکہ اپنے دَور کی اجتماعی ابتری و تباہی کا بھی انھیں اتنا ہی غم ہے جتنا شخصی محرومیوں کا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے نزدیک کسی بھی فرد کی (خصوصاً کسی صاحبِ کمال کی) انفرادی ناکامیوں کی ذمے دار ہوتی ہی اجتماعی بے راہ روی ہے۔ اجتماعی سوچ صحت مند ہو تو انفرادی آہ و فغاں بلند ہی کیوں ہو، چنانچہ اپنے حواس کی پراگندگی کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں ے

سارے عالم کے حواسِ خمسہ میں ہے انتشار
ایک ہم ہی تو نہیں معلوم ہوتے دہ ذلے

اس قسم کے اشعار دراصل اس تاریخ کے راوی ہیں جو میر کے سامنے بن رہی تھی، اس دَور کی نشاندہی کرتے ہیں جس کے بارے میں انھیں معلوم تھا کہ آنے والا ہر زمانہ اس کو ہمیشہ یاد رکھے گا ے

رسم و عادت ہے کہ ہر ایک وقت کا ہوتا ہے ذکر
میر ہمارے یاد کر رو دیں گے کیا تھا دَور" لوگ

کیا تاریخ کے صفحات آج بھی ان آنسوؤں سے نم نہیں جو اس دَور کے لوگوں نے مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں، روہیلوں وغیرہ کے مظالم و خونریزی اور نادر شاہی و احمد شاہی حملوں کے نتیجے میں بہائے تھے! ابنائے زمانہ کی خود غرضیوں، سازشوں،

غداریوں، بغاوتوں سیکے بعد دیگرے یلغاروں نے اس ذوق کے پانچوں حواس کو جس طرح پراگندہ کر دیا تھا میرؔ اسی کی بات کرتے ہیں۔ یہ سانحات میرؔ کے تجربے میں رونما نہیں ہو رہے تھے یہ محشر ملک کے طول و عرض میں برپا تھا جو میرؔ نے دیکھا محسوس کیا بلکہ اس میں شریک رہے اور اس خارجی کیفیت کو اشعار کا جامہ پہنا دیا ___ مگر غزل کی صورت میں، رمزیت و ایمائیت کے رنگ میں، داخلی و خارجی محسوسات کی آمیزش کے انداز میں، جس کے باعث کوئی واقعہ ان کی نظر میں غیر اہم نہیں اور کوئی شے بے کار دکھائی نہیں دیتی ہے

جاتی ہے نظر خس پہ گہ چشم پر میدن
یاں ہم نے پر کاہ کو بھی بے کار نہ پایا

اسی لیے وہ ہر قدم پر مشاہدہ و تجزیہ کا عمل بیک وقت دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی مشورہ ہر رہرو ہستی کو دیتے ہیں ہے

سرسری مت جہاں سے جا غافل
پاؤں تیرا جہاں پڑے ٹک سوچ

اس سوچ کی تھوڑی سی وضاحت کے طور پہ کہتے ہیں ہے

سفرِ ہستی کامت کر سرسری جوں باد اے رہرو
یہ سب خاک آدمی تھے، ہر قدم پر ٹک تامل کر[1]

فضیلتِ ہجرت

"عزلت گزینی" کے اس اہتمام نے فضیلتِ ہجرت کا ذکر یوں کیا ہے ہے

یوسف عزیزِ دلہا جا مصر میں ہوا تھا
ذلت جو ہو وطن میں تو کوئی دن سفر کر

اور حیاتِ میرؔ گواہ ہے کہ انھوں نے ربع صدی سے زائد عرصہ سفر ہی میں گزارا۔ لکھنؤ جانے سے قبل کوئی درجن بھر ملازمتیں وہ کر چکے تھے۔ ان کی شعری و نثری تخلیقات بھی شاہد ہیں کہ وہ خلوت نشیں کم اور سیلانی زیادہ تھے ہے

اس خوبصورتی سے نہ صورت نظر پڑی
سورت تلک تو سیر کی وہ بے نظیر ہے

شاید یہ مضمون محض خیالی نہیں کیونکہ سورت کی خاص چیز "شرابِ پرتگالی" کا ذکر بھی ان کے ہاں موجود ہے ہے

نگاہِ چشمِ پُر خشم بتاں پر مت نظر رکھنا
ملا ہے زہر اے دل اس شرابِ پرتگالی میں

اعضائے بدن کا ذکر دیگر اصناف سخن میں

ہم نے اپنے موضوع کو غزلیات تک محدود رکھا ہے ورنہ کلیاتِ میرؔ میں اعضائے بدن کا ذکر ان کے خمسات، واسوخت اور مثنویوں وغیرہ میں بھی کم و بیش ویسے ہی نظر آتا ہے۔ نمونے کے طور پہ ان کی مثنوی "جوشِ عشق" کے بیالیس اشعار درج

---

[1] بعض تنقید نگار اس قسم کے اشعار سے بیزاری کا اظہار اس لیے کرتے ہیں کہ ان میں بے ثباتیٔ دنیا کا ذکر ہے۔ نہ جانے یہ کیونکر فرض کر لیا گیا ہے کہ موت کا ذکر زندگی سے فرار کی تعلیم دیتا ہے اور انسان کو بزدل و کاہل بنا دیتا ہے، حالانکہ اس تصور سے حرکت و عمل میں تیزی و مستعدی پیدا ہوتی ہے ہے

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

بس یہ ذکر بے عملی کی تعلیم نہیں خوشِ عملی کی تلقین ہے، دعوتِ گوشہ نشینی نہیں ہر گوشۂ عالم کو زیورِ انسانیت سے آراستہ کرنے کی ترغیب ہے۔

کیے جاتے ہیں جن میں چوبیس اعضاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثنوی پینسٹھ[۶۵] اشعار پر مشتمل ہے اور اس کے بیالیس اشعار ہمارے موضوع کی تائید کرتے ہیں (یہ تناسب ساٹھ فی صد سے کچھ اوپر بنتا ہے):۔

ضبط کروں میں کب تک آہ اب   چل اے خامے بسم اللہ اب
کر ٹک دل کا راز نہانی   ثبت جریدہ میری زبانی
یعنی میرؔ اک خستۂ غم تھا   سر تا پا اندوہ و الم تھا
آنکھ لڑی اس کی اک جاگہ   بے خود ہو گئی جانِ آگہ
صبر نے چاہی دل سے رخصت   تاب نے ڈھونڈی اک دم فرصت
سینہ فگاری سامنے آئی   بے تابی نے طاقت پائی
کرنے آئے داغ سیاہی   کام جگر کا کرنے تباہی
خون جگر کا بہنے لاگا   پلکوں ہی پہ رہنے لاگا
چاک جگر سے محبت ٹپکی   آنسو کی جاگہ حسرت ٹپکی
سوز سے چھاتی تابہ گویا   اور پلک خونابہ گویا
آہ سے اس کی مشکل جینا   درد فقط تھا سارا سینہ
دل میں تمنا داغ جگر میں   شیون لب پر یاس نظر میں
نالے شب کو اس کے سن کر   مر گئے کتنے سر کو دھن کر
آہ و فغاں ہے اس کے لب پر   روز ہے اب تک آفت اس پر
رُو و جبیں پہ خراش ناخن   داغوں سے خون قیامت گلبن
زخم سینہ دل تک پہنچا   کوئی نہ اس گھائل تک پہنچا
آبلہ دل کا جب کوئی پھوٹا   فوارہ لوہو کا چھوٹا
غم نے دل میں کیا ہے پھوڑا   پر میں تھا اک پکا پھوڑا
رخساروں پر خون رواں ہو   دل میں ہو سو منہ پہ عیاں ہو
دشنۂ غم سے سینہ کوچا   ناخن سے منہ سارا نوچا
دل آماج گہِ غم کا کی   اور نفس اک تیر خاکی
نے طاقت نہ یارا اس کو   ضعفِ دلی نے مارا اس کو
نالۂ دل میں حزینی اس کے   خاطر میں غمگینی اس کے
رنگ اڑے چہرے کا ہر دم   تھا گویا گلِ آخر موسم
دست بدل ہر آن رہے وہ   بے طاقت بے جان رہے وہ

خونباری سے چہرہ گلگوں　　　حلقِ بسمل دیدۂ پُر خوں
جدول جاری چاک گریباں　　　گوشۂ دامن وقفِ مژگاں
دیدۂ تر کے دریا قائل　　　ساحل خشک لبی کے سائل
تشنہ لبی اک منہ پر پیدا　　　لب چش جس کا ہووے نہ دریا
خاک بسر آشفتہ سری سے　　　شورِ قیامت نوحہ گری سے
سر تا پا آشفتہ دماغی　　　داغِ جنوں دے جس کی چراغی
کلفتِ دل جب خاک فشاں ہو　　　اشک کی جاگہ ریگ رواں ہو
دل کے غبار نے راہ جو پائی　　　شہر میں گویا آندھی آئی
سر پر اس کے سنگ ہمیشہ　　　جی پہ عرصہ تنگ ہمیشہ
دشت تلک گئی آبلہ پائی　　　دُور کھنچی اس کی رسوائی
لوہو ٹپکے آہ سحر سے　　　لالہ گُتھواں لختِ جگر سے
رکھتا سدا تھا وہ دیوانہ　　　وردِ زباں یہ شعر دانا
صَارَا فُؤَادِیْ شَقًّا شَقًّا[1]　　　حَقًّا حَقًّا حَقًّا حَقًّا
ہوش و خرد ناشاد گئے سب　　　دین و دل برباد گئے سب
دردِ دل سے کچھ نہ کہے وہ　　　ہر اک کا منہ دیکھ رہے وہ
حسرت اس کی ایک اعجوبا　　　آب دہن کی موج میں ڈوبا
ورنہ رہے من مار کر اپنا　　　سر دے مارے ہار کر اپنا
کیونکہ غم سے ہو آزادی　　　جان کے ساتھ اس کی ناشادی
کوئی نہ اس پر سایہ گستر　　　اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر

خط کشیدہ الفاظ اعضائے بدن کی نشاندہی کرتے ہیں جن میں دل، جگر، مژگاں، سینہ/چھاتی، سر، پاؤں، پلک، آنسو، لب، نظر، رو، جبین، حلق، ناخن، رخسار، منہ، جان، چہرہ، دیدہ، اشک، من، جی اور دماغ شامل ہیں۔ ان چوبیس اعضاء میں سے دل کا ذکر پندرہ بار کیا گیا ہے۔

اسی طرح ان کی مثنوی "در مذمتِ دنیا" سے (جو غالباً ان کا آخری کلام ہے) کچھ اشعار اپنے موضوع کی تائید میں درج کیے جاتے ہیں۔ مثنوی کل پچاس اشعار پر مشتمل ہے، ان میں سے بیس اشعار درج ذیل ہیں:۔

بھلا جی کے جانے کا کیا ہے بیاں　　　عیاں ہے کہ کہتے ہیں جاں کو رواں

---

[1] میرا دل چاک چاک ہو گیا۔

ہنسوں کیونکہ ہستی میں دنداں نما
کہ ہے جلتے دنداں ہی دنداں نما

گیا شور سر سے جُھکا ہے بہت
گئی داشد اب دل رُکا ہے بہت

بلا ارتعاشِ تنِ زار ہے
ہر اک عضو چلنے کو تیار ہے

نہیں گور کے کام سے کچھ فراغ
کسے ذوقِ صحبت کہاں ہے دماغ

نہ کچھ یونہی عینک نظر چڑھ گئی
بصارت کی بے طاقتی بڑھ گئی

شباب آہ داغِ جگر دے گیا
قدِ خم زمیں کی طرف لے گیا

نہ کچھ زورِ بازو بہت کم ہوا
جُھکا سر سو زانو کا ہمدم ہوا

بدن زار اعضا سب ہی رعشہ دار
کرے کون خوباں سے بوس و کنار

کھڑے ہوں تو تھرائے ران اور ساق
جنہیں بیٹھے کیونکر کہ جینا ہے شاق

جو یوں پاؤں چلتے بچلتے رہے
تو دیکھوگے ہم یاں سے چلتے رہے

کہے میں نہیں اپنے ٹک پا و دست
کیا خاک میں مجھ کو پیری نے سخت

جو بازو ہیں اپنے وہ بازو نہیں
اگر منہ کو دیکھو تو وہ رُو نہیں

بدن کی ہوئی میرے صورت ہی اور
وے آنکھیں نہیں وے نہ چتون کے طور

جسدِ ناتواں جائے مہمان تنگ
سخن منہ پہ آوے وداعی کے ننگ

لبوں پہ نہایت ضعیف ایک آہ
در و بام پر حسرتوں سے نگاہ

شکن جلد میں دل کو پژمردگی
غریزی حرارت میں افسردگی

چھڑکتا رہوں منہ پہ میں آب کاش
کہ ہوتا رہے رُوح کا انتعاش

وگرنہ دیا سا بجھا جائے ہے
پھر اُٹھ بیٹھوں تو جی چلا جائے ہے

سیہ روئے شیب اک ستم کر گیا
لکھوں کیا کہ میں بیٹھے جی مر گیا

خط کشیدہ الفاظ سے ظاہر ہے کہ ان بیس اشعار میں چھتیس بار مختلف اعضائے بدن کا ذکر کیا گیا ہے یہ بھی بطورِ نمونہ درج کیے گئے ہیں ورنہ انہیں "بدن نامہ" میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ وہ صرف ان اشعار پر مشتمل ہے جو دواوینِ غزلیات میں مذکور ہیں اور میرؔ کے پیغام فلسفۂ زیست، تصورِ تخلیقِ آدم اور ان کے کلام کی آفاقیت پر روشنی ڈالتے ہیں!

اس اہم پہلو سے بے اعتنائی یا عدم توجہی؟!

یہ دعویٰ نہیں، بلکہ اعتراف ہے کہ راقم کی نظر سے کسی محقق یا نقاد کا کوئی ایسا مضمون یا مقالہ اب تک نہیں گزرا جس میں شعرِ میرؔ کے اس خاص عنصر کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہو۔ کہیں کہیں محض اشارے سے اس ضمن میں دکھائی دے جاتے ہیں مثلاً مرزا ادیب کی تحریر بعنوان "میرؔ کے ہاں مرثیۂ دل یا مرثیۂ دلی" میں لفظِ دل کے بار بار کلامِ میرؔ میں آنے کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ان کی تحقیق کے مطابق یہ لفظ "ہر چوتھی یا پانچویں غزل کے بعد نظر آجاتا

ہے" جو درست نہیں کیونکہ دیوانِ میر کی ایک ہزار آٹھ سو سٹرسٹھ (۱۸۶۷) غزلیات میں دل کا ذکر دو ہزار تین سو چوّن (۲۳۵۴) مرتبہ کیا گیا ہے یعنی اوسطاً ہر غزل میں کم سے کم ایک بار آتا صاف ظاہر ہے۔ اسی طرح بعض دیگر اہلِ نقد و نظر کے ہاں نشنہ سے اشارے مل جاتے ہیں مثلاً حسن واصف عثمانی میر کی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں ـــــ "یہ ایک فرد کی جسمانی و ذہنی نامرادیوں کی کہانی ہے" ـــــ آگے چل کر لکھتے ہیں ـــــ "ان کے سارے مسائل سانس لیتے بدن کے مسائل ہیں" اس سے زیادہ وضاحت انہوں نے نہیں کی یا ضروری تصوّر نہیں کی۔ فراق گورکھپوری نے میر کے "معیارِ حواسِ خمسہ" اور "بیدار حواسِ خمسہ" کی تراکیب تو استعمال کی ہیں لیکن ان حواس کی "آپ بیتی" کا بیان انہوں نے بھی ضروری نہیں سمجھا! عندلیب شادانی نے اپنی "تحقیقات" میں "میر صاحب کا ایک خاص رنگ" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس میں میر کی "امرد پرستی" کو تو بہت زیادہ اچھالنے کی کوشش کی ہے لیکن اس خاص رنگ (ذکرِ اعضائے بدن) پر ان کی نظر نہیں گئی، شاید جا بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ انہوں نے (تنقید کی بجائے) فتوے کے انداز میں میر کا قصّہ ہی یہ کہہ کر پاک کر دیا ہے کہ ـــــ "میر صاحب کا موضوعِ سخن سادہ رو دلوں سے عشق بازی ہے اور ان کے کلام کا بیشتر حصّہ ان کے اس ایک شعر کی تفسیر ہے ؎

کیا میر تو روتا ہے پامالیٔ دل ہی کو
ان لونڈوں نے تو دلی سب سر پہ اٹھالی ہے "

"بیشتر" کے جو معنی اہلِ لغت نے بتائے ہیں ان کی رُو سے فاضل مضمون نگار کا یہ قول غلط قرار پاتا ہے۔ حیرت ہے کہ اشعارِ غزلیاتِ میر کی صحیح تعداد جاننے کے باوجود وہ اسی پر مصر ہیں اور کتاب کے صفحہ ۱۳۸ پر لکھتے ہیں ـــــ "میر صاحب کے اشعارِ غزلیات کی تعداد چودہ ہزار سے کچھ اُوپر ہے ـــــ کلامِ میر کا بیشتر حصّہ امرد نامہ کہلانے کا مستحق ہے"۔ اس کے بعد چُن چُن کر ایک سو چھہتر اشعار (مع تبصرہ) ایسے درج کیے ہیں جن میں امردوں کا ذکر آتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ ـــ "یہ انتخاب ہے" حالانکہ یہ انتخاب نہیں بلکہ صرف دس اشعار کے فرق سے یہی ان اشعار کی کل تعداد ہے۔ (شادانی نے ایک ۱۷۶ درج کیے ہیں جب کہ ایسے اشعار کی کل تعداد ۱۸۶ ہے)۔ یہ تعداد تو پورے کلام کا ساٹھواں حصّہ بھی نہیں بنتی، ایک فیصد سے بھی زیادہ نہیں! پھر بھی اسے کلام کا "بیشتر حصّہ" قرار دینا مناسب نہیں! لیکن ایک ایسے "نقاد" کو مناسب و نامناسب کی کیا پروا جس کے نزدیک ـــــ "ایک خوش ذوق انسان کے لیے میر صاحب کے پورے کلام کا مطالعہ کرنا کوئی سہل کام نہیں ـــــ الخ"۔ گویا کلامِ میر کا مطالعہ "بدذوق انسان" ہی کر سکتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے مضمون نگار نے میر کو ہر جگہ "میر صاحب" لکھا ہے حالانکہ عظیم اساتذہ کے نام اس تکلف کے محتاج نہیں ہوتے! "غالب صاحب" کا دیوان یا "اقبال صاحب" کی بانگِ درا کہنا ان شاعروں کو تعظیم کم اور تضحیک زیادہ ہے۔ [1]

[1] شادانی صاحب نے تو خیر کچھ زیادہ ہی برہمی کا مظاہرہ کیا ہے، لیکن میر کے ساتھ اپنے اپنے انداز میں ناانصافی
باقی صفحہ ۲۱ پر

ہمیں شادانی صاحب کے نظریے پر تبصرے کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں ہوتی کہ ممکن ہے "گلستاں" کے بابِ پنجم اور "مثنویٔ معنوی" کے دفترِ پنجم کی بعض حکایات کی وجہ سے سعدی

بقیہ صفحہ ۲۰

بقیہ صفحہ ۲۰

اور بھی کئی لوگوں نے روا رکھی ہے۔ کسی نے کلامِ میرؔ کو ناہموار بتایا تو کسی نے حشو و زوائد کا شکار قرار دیا اور کسی نے بھرتی کے اشعار سے بیزاری کا اظہار کیا ــــــ اس مؤخرالذکر مفروضے کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ پُرگو شعرا کے لاتعداد اشعار میں بھرتی کے اشعار ہوتے ہی ہیں۔ کلیاتِ میرؔ کی ضخامت سے خوفزدہ ہو کر اس مفروضے کا اطلاق بڑی سہولت سے میرؔ پر بھی کر دیا گیا، یہ سوچے بغیر کہ "پُرگوئی" کی اصطلاح میرؔ پر تو لاگو ہوتی ہی نہیں کیونکہ ان کی مدتِ سخن گوئی کم و بیش پون صدی پر محیط ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے ان پچھتّر برس کے دوران میرؔ نے ۱۸۶۷ غزلیں کہیں ــ گویا اوسطاً پچیس غزلیں سالانہ یا دو غزلیں ماہانہ، بالفاظِ دیگر بیس پچیس اشعار ماہانہ ــــــــــــ! یہ تو روزانہ ایک شعر کی اوسط بھی نہیں بنتی، پھر "پُرگوئی" کہاں سے آگئی؟! میرؔ خود فرماتے ہیں ؎

مصرع کوئی کوئی کبھی موزوں کروں ہوں میں | کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

پھر انہیں بھرتی کے اشعار کا خالق کیونکر کہا جا سکتا ہے اور ناہمواری کا احساس کس بنا پر پیدا ہو سکتا ہے۔ میرؔ کی تو اکثر غزلیات ایسی ہیں جن میں نے اور ہم آہنگی کی ایک لہر سی جاری و ساری رہتی ہے اور یہ لہر اس بحرِ غم سے اٹھتی ہے جس میں میرؔ عمر بھر غوطے کھاتے رہے اور اس کی تہہ سے جو کچھ ہاتھ لگا اسے سبک سارانِ ساحل کی طرف اچھالتے رہے، اس میں موتی بھی تھے اور صدف بھی، جلد بازوں کی نظریں موتیوں تک محدود رہیں، صدف کے ڈھیروں کو انھوں نے خذف سے زیادہ اہمیت نہ دی اور ان کے اندر پوشیدہ گوہر ان کی نظروں سے پوشیدہ ہی رہے! بس گنتی کے چند اشعار کو کسی نے میرؔ کے "بہتّر نشتر" سے تعبیر کیا اور کسی نے ان کا قابلِ اعتنا کلام قرار دیا۔ مشقتِ تحقیق سے گریز کے باعث صدف کا سینہ چیرنے کی توفیق ان سہل انگاروں کو نہ ہوئی!! چنانچہ شادانی صاحب نے ڈیڑھ دو سو اشعار امردوں سے متعلق تلاش کر لیے اور یہ کہہ کر حقِ تحقیق ادا کر دیا کہ ــــــ "میرؔ صاحب کا بیشتر کلام امرد نامہ کہلانے کا مستحق ہے۔" باقی چودہ ہزار اشعار کے مطالعے سے ان کی "خوش ذوقی" کے مجروح ہونے کا خطرہ لاحق تھا اس لیے ان کو ناقابلِ مطالعہ قرار دینا ہی شانِ محققانہ تصور کیا گیا ــــــ یہ غور کیے بغیر کہ جب بقیہ کلام آپ نے پڑھا ہی نہیں تو اس کے بارے میں "فتویٰ دینا" کیونکر جائز ہو گیا؟ اسی لیے حقیقت شناس اہلِ ذوق نے کلامِ میرؔ کے صرف اسی حصے کو ناقابلِ اعتنا تصور کیا جسے شادانی صاحب نے حاصلِ کلامِ میرؔ بتاتے ہوئے بہت زیادہ اچھالنے کی سعیٔ لاحاصل کی ہے!!!

اور روحی کا مطالعہ بھی ان کے نزدیک بد ذوقی ہی کی دلیل ہو ــــــ! البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پونے دو سو کے قریب یہ اشعار کلامِ میرؔ پر بدنما داغ تو واقعی ہیں۔ "بیشتر" کلام امردنامہ نہ سہی لیکن یہ تناسب بھی آٹے میں نمک کے برابر تو ضرور ہے اور نمک کی ایک چٹکی سے بھی آٹے کا ذائقہ تو بدل ہی جاتا ہے۔ چنانچہ ہزاروں اشعار میں یہ قلیل تعداد بھی کھٹکتی تو بہرحال ہے خصوصاً اس وقت جب سنجیدہ شعر پڑھتے پڑھتے کسی امرد کا ذکر سامنے آجاتا ہے اور ایک جھٹکا سا قاری کو لگتا ہے مثلاً ؎

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ　　　یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

اور اس کے فوراً بعد یعنی اگلا ہی شعر یہ ہے ؎

رکھ دیں نے رکھا ہے دُرِ تر سا بچگاں پر　　　رکھیو تو مری شرم بڑھاپے میں خدایا

"خدایا" کا قافیہ اسی دعا کے لیے رہ گیا تھا کیا؟...... اور یہ ذکر اکا دکا شعر کی صورت میں جاری ہی رہتا ہے۔ ویسے غزل کے روایتی انداز میں میرؔ کے ہاں عورت کا ذکر بھی موجود ہے تاہم اس زمانے کی رسم کے مطابق یہ عورت بازاری دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً ؎

آنا شن، ناداری سے ہم نے جی دینا ٹھہرایا ہے　　　کیا کہیے اندیشہ بڑا تھا اس کی منھ دکھلائی کا

بازاری عورتیں دلہن کی طرح منہ دکھلائی کا ڈھونگ اپنے احمق شیدائیوں سے پیسے بٹورنے کے لیے رچایا کرتی تھیں، میرؔ کا اندیشہ بھی انہی شاہدانِ بازاری میں سے کسی کے بارے میں معلوم ہوتا ہے یا محض خیالی بات! اسی طرح یہ شعر ؎

دیکھنا منہ یار کا اس وجہ سے ہوتا نہیں　　　یا الٰہی دے زمانے سے اٹھا رسمِ نقاب

اور ؎

منہ کی دو چھائیوں سے مت شرما　　　چھائیں ہوتی ہیں رُو کے ماہ کے بیچ

درجِ بالا دونوں اشعار ایک امرِ خاص کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے بھی درج کیے گئے ہیں۔ یہ دیوانِ ششم سے لیے گئے ہیں جس کے بارے میں وثوق سے کہا گیا ہے کہ لکھنؤ میں تیار ہوا تھا۔ جہاں ایسی عورتوں کی کوئی کمی اس زمانے میں نہیں تھی ــــــ چنانچہ یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ وہاں امردوں کے ذکر کی جگہ زنانِ بازاری کے ذکر نے لے لی تھی ــــــ لیکن اسی دیوان میں ان کا یہ اعتراف پھر سامنے آجاتا ہے ؎

معقول اگر سمجھتے تو میرؔ بھی نہ کرتے　　　لڑکوں سے عشق بازی ہنگامِ کہنہ سالی

جس امرِ خاص کی بات ہم نے کی ہے وہ یہ ہے کہ ترتیبِ دواوینِ میرؔ میں گڈمڈ کا شبہ پیدا ہونے لگتا ہے جس کا ذکر ہم درج ذیل عنوان کے تحت کرنا چاہتے ہیں۔ (یوں کہہ سکتے ہیں کہ بات میں سے بات نکل آئی ہے):-

ترتیبِ دواوین میں گڈمڈ

اوپر جو شعر نقل کیا گیا ہے (ع لڑکوں سے عشق بازی ہنگامِ کہنہ سالی) ضروری نہیں کہ "ہنگامِ کہنہ سالی" ہی کہا گیا ہو۔ ممکن ہے یہ دلی ہی میں کہا گیا ہو اور دیوانِ ششم میں درج کر دیا گیا ہو کیونکہ بعض بدیہی وجوہ کی بنا پر یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ترتیبِ دواوین گڈمڈ کا شکار ہو گئی ہے جس کے باعث میر کی شاعری کے ارتقائی مدارج کا سراغ لگانا مشکل ہے (ہرچند کہ سخنِ میر کے سکہ بند اجزائے ترکیبی اور از اوّل تا آخر مخصوص اندازِ بیان کے پیشِ نظر ممکن ہے اس کے کوئی قابلِ توجہ ارتقائی مدارج موجود ہی نہ ہوں تاہم زیادہ نہیں تو کم سے کم دلی اور لکھنؤ کے زمانے کا کلام ہی الگ الگ ترتیب دے دیا جاتا تو کچھ نہ کچھ سراغ تو مل ہی جاتا) گڈمڈ کے ضمن میں جن "بدیہی وجوہ" کی طرف اشارہ ہم نے کیا ہے وہ کچھ اس طرح سے ہیں:

۱: زیرِ نظر "کلیاتِ میر" کے حوالے سے

تالیفِ ہٰذا کے دوران ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک دیوان میں مندرج غزلیات کسی دوسرے دیوان میں بھی جس کی تیں درج کر دی گئی ہیں! انہیں اگر ایک ہی دیوان میں رہنے دیا جائے اور دوسری جگہ سے حذف کر دیا جائے تو بھی صرف رفعِ تکرار ہی کا عیب ختم ہو سکتا ہے، یہ پتہ تو پھر بھی نہ چلے گا کہ ان کا اصل تعلق کس دیوان سے ہے!

۲: ذکرِ "کہنہ سالی" کے حوالے سے

ہرچند کہ ایک غزل گو شاعر سے نہ تو یہ توقع کی جا سکتی ہے نہ ہی اس پر یہ پابندی عائد ہوتی ہے کہ وہ جوانی کی باتیں صرف اپنے زمانۂ شباب میں کرے اور بڑھاپے کا تذکرہ زمانۂ پیری سے قبل نہ کرے! وہ کسی بھی منزلِ زیست کا ذکر عمر کے کسی بھی مرحلے پر آزادانہ کر سکتا ہے۔ تاہم شعر کے خاص لب و لہجہ، انتخابِ الفاظ، بیساختگیٔ اظہارِ جذبات سے اضمحلال یا استقلالِ قویٰ کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے اس سلسلے میں ہم چند اشعار پیش کرتے ہیں جو مختلف دواوین سے لیے گئے ہیں جن میں شاعر کی عمر کا ذکر جمیل جالبی کی اس تحقیق کے حوالے سے کیا گیا ہے جس میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ کون سا دیوان عمر کے کون سے حصے میں تیار ہوا۔ مثلاً بحوالۂ تحقیقِ مذکور، پہلا دیوان دلی میں تیس برس کی عمر تک تیار ہو چکا تھا، اس میں یہ شعر دکھائی دیتا ہے:

کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہے عمر کو اب آخر آخر آن کے یہ ریختہ کیا

پھر اس سے بھی کہیں آگے کی بات کی گئی ہے

میر اب کس کو دماغِ گفتگو عمر گزری ریختہ چھوٹا گیا

آخر آخر کا اشارہ بجائے خود بڑھاپے کی طرف ہے چہ جائیکہ اس آخر آخر کردہ ریختہ کو چھوٹے بھی مدتیں بیت گئیں۔ یہی نہیں بلکہ بڑھاپے سے پیدا شدہ ضعف اور اس کے نتیجے میں اختیار کردہ بڈھے بوڑھوں کی سی احتیاطوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جب اپنی صحت کے علاوہ کسی بات کا خیال ہی باقی نہیں رہتا ہے

کس کو دماغِ شعر و سخن ضعف میں کہ میر اپنا رہے ہے اب تو ہمیں بیشتر خیال

یہ لب و لہجہ، مشاغل زیست سے دستبرداری بلکہ بیزاری کا اعلان ،ضعف و اضمحلال کی پیدا کردہ بے طاقتی کے باعث اظہار ملال و حسرت ،زمانۂ پیری کی غمازی زیادہ کرتا ہے اور دورِ شباب کی نشاندہی کم ، ان اشعار کا تعلق بظاہر تو دیوانِ ششم ہی سے بنتا ہے ، دوسرے دیوان میں ذکرِ پیری کا انداز فطری معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ تیس اور چھتیں برس کے درمیانی عرصے میں کہا گیا ہے

فائدہ سر جھکے گا شیب میں میرؔ پیری سے آگے اے جواں ٹک سوچ

بڑھاپے کی آمد کا ذکر بھی خاص تشویش سے نہیں کیا گیا ہے

بس بہت وقت کیا شعر کے فن میں ضائع میرؔ اب پیر ہوئے ترک خیالات کرو

لیکن تیسرے دیوان میں جو چھپّن اور چونسٹھ سال کی درمیانی مدت میں تیار ہوا، یہ شعر بڑھاپے کی انتہائی منزل کا نقشہ پیش کرتا ہے ؂

زانو پہ سر ہے قامت خم گشتہ کے سبب پیری میں اپنی آن لگے ہیں قدم سے ہم

جب کہ چوتھے دیوان میں جو چونسٹھ اور پچہتر برس کی مدت کے دوران تیار ہوا، قد کی فقط خمی کا ذکر ہے جو عمر کے اس حصے میں اکثر ہو ہی جایا کرتی ہے ؂

فقیری میں تھا شیب بارِ گراں قدِ راست کو اپنے خم کر گیا

چنانچہ اس سے برسوں قبل "قدموں سے آن لگنا" غیر معمولی اور خلافِ مشاہدہ ہے۔ اور تیسرے دیوان میں مندرج مذکورہ بالا شعر بھی دیوانِ ششم ہی سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔

اب یہ شعر جو دیوانِ ششم میں ہے جس کی تیاری کا زمانہ اسّی اور نوّے برس کی عمر کا درمیانی عرصہ بتایا گیا ہے پھر دعوتِ فکر بن جاتا ہے ؂

آیا ہے شیب سر پر گیا ہے شباب اب کرنا جو کچھ ہو تم کو سو کرو شتاب اب

گویا جوانی ختم ہونے کو ہے اور بڑھاپے کی آمد آمد ہے۔ یہ تو دوسرے دیوان کے زمانے کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں یہ اعتراف ہے کہ غزل کے اشعار کو صاحبِ کلام کی عمر کے تعین میں بطورِ دلیل پیش کرنا خاص وزن نہیں رکھتا تاہم پہلی ترتیبِ دواوین کے جس خلط ملط سے متعلق اشتباہ کی بات ہو رہی ہے، اس کو مندرجاتِ بالا سے تقویت ضرور ملتی ہے۔

اختصارِ دیوانِ ششم کے حوالے سے

اس ضمن میں یہ بات بھی کسی حد تک کھٹکتی ہے کہ میرؔ نے (جیسا کہ کہا جاتا ہے) ساٹھ برس کی عمر تک تو پانچ دیوان مرتب کر لیے لیکن لکھنؤ میں تیس سالہ قیام کے دوران وہ صرف ایک ہی دیوان ترتیب دے سکے جو ویسے بھی ان کا مختصر ترین دیوان ہے (جس میں کل ۱۳۱ غزلیں ہیں جو ۱۰۹۶ شعروں پر مشتمل ہیں) کیا وہاں میرؔ سال بھر میں اوسطاً چار پانچ غزلیں ہی کہہ پاتے تھے جب کہ وہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے۔ اس غیر معمولی اختصار کی ایک ممکنہ وجہ یہ ہو سکتی تھی اور وہ خاصی معقول اور قابلِ قبول بھی قرار پاتی کہ لکھنؤ میں دربار سے منسلک ہو جانے کے باعث میرؔ کی بیشتر توجہ قصیدہ نگاری کی طرف رہی۔ لیکن "کلیاتِ میرؔ" سے اس کی بھی تائید نہیں ہوتی۔ اس کے ۹۷۶

صفحات میں مدحیات کے عنوان سے فقط نو صفحے دکھائی دیتے ہیں جو ۱۹۵ شعروں پر مشتمل ہیں اور ان میں سے بھی ستره اشعار آغا رشید خطاط کی مدح میں ہیں۔ "ستائش ہائے گوناگوں" کی نو مثنویوں کے چار سو انسٹھ اشعار میں سے بھی نواب آصف الدولہ کے حصّے میں صرف چھبیّن اشعار ہی آسکے ہیں، بقیہ اشعار موہنی بلی، ہولی، مرثیۂ خروس وغیرہ سے متعلق ہیں۔ "مثنویات شکار نامہ ہائے" میں بظاہر نواب کے شکار کھیلنے کا ذکر ہے لیکن شاعر کی بیشتر توجہ منظر کشی اور مرقع نگاری پر مرکوز رہی ہے۔ نواب کا ذکر تبرکًا ہی کیا گیا ہے۔ گویا اختصارِ دیوان کا سبب میرؔ کی قصیدہ نگاری بھی نہیں۔ پھر اگر یہ تصوّر کر لیا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اصل میں یہ دیوان ضخیم تر تھا لیکن اس کے بہت سے اشعار دیگر دواوین میں غلط ملط ہو گئے ہیں۔ دواوین میں سے ہر دیوان کی ردیف دار ترتیب بھی گڈمڈ کا سبب بن سکتی ہے کیونکہ شاعر تو ردیف دار کلام پیش نہیں کرتا، وہ سلسلہ تو ملا جلا ہی ہوتا ہے، ردیف دار ترتیب کا اہتمام تو بعد میں مرتبین نے کیا وہ بھی شاعر کی ذاتی نگرانی میں نہیں بلکہ اپنی صوابدید کے مطابق سو بھی وراں حالیکہ شاعر نے کلام کی تاریخ وار نشاندہی نہیں کی! بلاشبہ مرتبین کا یہ کارنامہ قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نے کلام کو یکسر تلف ہونے سے بچا لیا لیکن ترتیبِ دواوین بلکہ ترتیب کلیات میں صحت ترتیب کی توقع ان سے کیونکر ہو سکتی ہے کیونکہ شاعر نے وقتاً فوقتاً جو کچھ کہا اس کے اوقات کا علم اس کے سوا کسی اور کو نہیں ہو سکتا تا آنکہ اس نے وقت یا تاریخ کی نشاندہی ساتھ ساتھ خود نہ کر دی ہو ــــ اور بصورتِ موجودہ یہ سہولت مرتبینِ کلیات کو حاصل نہ تھی۔ پھر اگر محققین کے ہاں قیاس آرائی کی گنجائش موجود ہے تو مرتبین کے اندازہ و قیاس کو جرم کیوں قرار دیا جائے! یوں سہواً مندرجات میں تقدیم و تاخیر اور گڈمڈ ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ مثنوی معوّد و خیال" کلیات کے آخر میں دکھائی دیتی ہے جو دورِ شباب کی چیز ہے جب دیوانِ اوّل بھی مکمل نہیں ہوا ہوگا پس اگر یہ سلسلہ کلیات کی مجموعی ترتیب میں ہو سکتا ہے تو دواوین اس سے کیونکر محفوظ رہے ہوں گے۔!!

ـــــــــــــــــ

ؔلہ "کلیاتِ میرؔ" (مرتبہ آسی) کی رُو سے میرؔ کے ہاں دواوین کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن کی تفصیل یوں ہے:

۱ ــــ فردیات، مثلث، تضمین، سولہ صفحات، اشعار = ۲۱۷
۲ ــــ رباعیات، قطعات، ترکیب بند، ۴۲ صفحات، اشعار = ۳۷۵
۳ ــــ نعت و منقبت، ۴۸ صفحات، اشعار = ۸۱۸
۴ ــــ مدحیات، ۹ صفحات، اشعار = ۱۹۵
۵ ــــ ستائش ہائے گوناگوں، ۱۰ صفحات، اشعار = ۴۵۹
۶ ــــ ہجویات و اسوخت، ۷۴ صفحات، اشعار = ۹۹۸
۷ ــــ شکار نامے، ۳۷ صفحات، اشعار = ۸۶۶
۸ ــــ جذباتِ عشق، ۵۸ صفحات، اشعار = ۱۴۲۱
۹ ــــ سوانحات، ۲۷ صفحات، اشعار = ۴۴۶

مدفنِ میر.....؟

ایک ناقابلِ تلافی اور ناقابلِ معافی بے اعتنائی!

ابنائے زمانہ نے میرؔ کو عمر بھر ستایا، تڑپایا اور رُلایا لیکن ان کے ساتھ بدترین ناانصافی اور غیر انسانی سلوک کا مظاہرہ ان کی وفات کے بعد کیا۔ اپنے وقت کا یہ عظیم ترین سخنور، محترم ترین انسان کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں مدفون ہے مگر کس جگہ؟ جواباً ایک قبرستان کا نام بتا دیا جاتا ہے اور بس! لیکن قبر اور قبرستان میں تو بہت فرق ہوتا ہے۔ ان فرضی قبور کا تذکرہ بھی سُننے میں آیا ہے جنہیں مختلف اوقات میں مختلف اشخاص میرؔ کی قبر بتاتے رہے (ان کا مذموم مقصد محتاجِ بیان نہیں)۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ قبرِ میرؔ کا نام و نشان تک باقی نہیں اور جملہ بیانات و قیاسات عبث ہیں۔ زمانے کی اس شرمناک بے اعتنائی کا دردناک پہلو یہ ہے کہ میرؔ کے ہر دیوان میں ایسے متعدد اشعار دکھائی دیتے ہیں جن میں اپنے مدفن کا ذکر انہوں نے کیا ہے۔ دیوانِ اوّل میں تربت کے علاوہ مرقد اور مزار وغیرہ جیسے الفاظ بھی اپنی قبر کے لیے وہ استعمال کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جیسے چشمِ تصوّر میں وہ مرجعِ خلائق پاتے ہیں اور فخر و مسرت کا اظہار کرتے ہیں ؎

تربتِ میرؔ پہ ہیں اہلِ سخن ہر طرف حرف ہے حکایت ہے
تو بھی تقریبِ فاتحہ سے چل بخدا واجب الزیارت ہے

کیسا روح پرور ماحول ہے اس تربت کا، ہر طرف زائرین کا ہجوم ہے، اہلِ سخن میرؔ کی باتیں کر رہے ہیں، لوگ قسمیں کھا کھا کر زیارت کی ترغیب دوسروں کو دلا رہے ہیں، فاتحہ خوانی ہو رہی ہے ....! خراجِ تحسین پیش کرنے والوں میں طائرانِ خوش الحان بھی شامل ہیں ؎

دور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا
بلبلوں نے کیا گل افشاں میرؔ کا مرقد کیا

یہی خواب عمر خیام نے اپنے مرقد کے بارے میں دیکھا تھا سو تو پورا ہو کر رہا لیکن میرؔ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا! تربت اور مرقد کے علاوہ مزار کا ذکر فخریہ انداز میں اس طرح کیا ہے ؎

میرے سنگِ مزار پر فرہاد رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

لیکن یہ انداز دیوانِ اوّل ہی تک محدود ہے۔ دوسرے ہی دیوان میں لب و لہجہ بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ کیونکہ اہلِ زمانہ کی بے رُخی نے اس تصوّر کو مجروح کر دیا اور خواب کی تعبیر بھی ذہن نشین کرا دی۔ اب فخر کی بجائے شکستہ دلی سے کہتے ہیں ؎

اتنی مدت میں واں رہا کیا خاک
تربتِ میرؔ پر چلے تم دیر

بلکہ یوں سماجت کناں بھی دکھائی دیتے ہیں ؎

رہنے دو غریب کا نشاں تو
مت تربتِ میرؔ کو مٹاؤ

تیسرے دیوان میں مایوسی غالب تر نظر آتی ہے، خود ہی مشورہ دے رہے ہیں کہ ؎

ڈھیری رہے اک خاک کی تو کیا ایسے خاک برابر کی
مجھ کو زمیں میں گاڑو گے تو نشانِ تربت مت کریو

چوتھے دیوان میں قبر ہی نہیں قبرستان کی امید بھی ختم ہونے لگتی ہے ؎

اس کے سمندِ ناز کا پامال تو رہوں
اے کاش میری گور کریں رہگذر کے بیچ

ستم ظریفیٔ زمانہ کے باعث یہ فریاد تو ایک طرح سے مدت تک درخورِ اعتنا بھی رہی کیونکہ بقول نادم سیتا پوری لکھنؤ ریلوے سٹیشن کے قریب ریل کی پٹڑی کے بہت نزدیک ایک قبر کو برسوں تلک میرؔ کی قبر بتایا جا رہا! آگے چل کر وہ چشمِ تصور میں اپنی تربت کی خاک اڑتی ہوئی دیکھنے لگتے ہیں ؎ (دیوانِ پنجم)

جب دیکھو تب تربت عاشق جھکڑ سے ہے ترلزل میں
عشق ہے بادِ صرصر گویاں ان کی خاک اڑانے سے

اور پھر انسان سے یکسر مایوس ہو کر وہ تزئینِ مزار کی توقع فقط طیورِ خوش نوا سے کرنے لگتے ہیں ؎ (دیوانِ ششم)

برسوں کیا کرے مری تربت کو گل فشاں
مرغِ چمن اگر حقِ صحبت ادا کرے

کہیں کہیں وہ یاس و نومیدی کے باوجود اہلِ دنیا کو یاد دہانی سی ضرور کرا دیتے ہیں کہ شاید کسی کے دل میں خوفِ خدا آ ہی جائے، چنانچہ کنائے کے انداز میں کہتے ہیں ؎

وہ تو مِٹا گیا تھا تربت بھی میرؔ جی کی
دو چار اینٹیں رکھ کر پھر میں نشاں بنایا

مگر یہ دو چار اینٹیں رکھنے کی توفیق کسی کو نہ ہوئی۔ میرؔ کو اس کا بھی اندازہ تھا بلکہ یہ بھی معلوم تھا شمعِ مزار کا فرض بھی ان کی اپنی ہی آہِ سوزاں کو ادا کرنا ہوگا ؎

مجھ سوز بعد مرگ کے آگاہ کون ہے
شمعِ مزارِ میرؔ بجز آہ کون ہے

اور بالآخر یہ کاشف الاسرار جیتے جی ہی اہلِ جستجو کو بتا گیا کہ ؎

کیا خاک میں ملایا ہم کو سپہرِ دوں نے
ڈھونڈے نشان تربت پاتے نہیں ہمارا

ایک مرغوب مضمون "تنگ پوشی" امردوں کا ذکر کرتے کرتے بات سے بات نکلتی گئی اور ہم اس امر کا ذکر نہ کر سکے کہ میرؔ کے زمان کی "تنگ پوشی" بہت مرغوب تھی جسے اس طبقے میں شاید خوش پوشاکی کی دلیل تصور کیا جاتا تھا (اس کا رواج ہمارے نقال معاشرے میں بھی ماضی قریب میں خاصا عام ہو گیا تھا جس کے لیے "ٹیڈی ڈریس" کی اصطلاح وجود میں آئی تھی)۔ میرؔ کے ہاں متعدد اشعار اس سلسلے میں دکھائی دیتے ہیں جن میں سے ممکن ہے بعض کا اشارہ عورتوں (زنانِ بازاری) کی طرف بھی رہا ہو ان اشعار میں بھی تن، بدن، جسم یا کسی نہ کسی عضوِ بدن کا ذکر ضرور آیا ہے ؎

؎ سینے کا سوز بہت بھڑکا جلا تن ملا
جامہ زیبوں نے عجب آگ پہ دامن مارا

؎ کیا بدن دیکھا چسی چولی سے ہائے
مارے حسرت ہی کے ہم جاں سے گئے

؎ کیا ظلم ہے لباس میں اس تنگ پوش کے
دل تنگی سے نکل گئے ہو کر فقیر ہم

؎ اس کے سونے سے بدن سے کس قدر چسپاں ہے ہائے
جامہ کبریتی کسو کا جی جلاتا ہے بہت

؎ جی پھٹ گیا ہے رشک سے چسپاں لباس کے
کیا تنگ جامہ لپٹا ہے اس کے بدن کے ساتھ

کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا ۔۔۔ اُگلا پڑے ہے جامے سے اس کا بدن تمام

حسرت موہانی نے اس مضمون سے یوں استفادہ کیا ہے ۔

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنین ۔۔۔ اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

چلنے میں مونڈھے پھٹی ہے کہنی جیسی ہے چولی پھنسی ہے مہری ۔۔۔ قیامت اس کی ہے تنگ پوشی ہمارا جی تو بہ تنگ آیا

زبانِ میرؔ کا ایک قابلِ لحاظ عنصر

درج بالا شعر میں لفظ "مونڈھے" استعمال ہوا ہے۔ عربی میں اسے کتف[1] فارسی میں دوش یا شانہ اور ہندی میں کندھا کہتے ہیں کلامِ میرؔ میں یہ جملہ صورتیں بھی موجود ہیں لیکن زبانِ میرؔ کا ایک قابلِ لحاظ پہلو یہ ہے کہ وہ الفاظ و تراکیب اور مترادفات کی ان صورتوں کو ترک کرنے کے قائل نہیں جو قدیم سے رائج و مستعمل رہی ہیں ۔۔۔ اور جنہیں ریختہ گوئیوں نے آزادانہ استعمال کیا ہے۔ "مونڈھے" ان الفاظ میں سے ہے جو اردو میں رچ بس جانے کے باوجود اہلِ زبان کے نزدیک اجنبیت سے خالی نہیں۔ لیکن میرؔ نہ صرف یہ کہ ایسے الفاظ کو اجنبی تصور نہیں کرتے بلکہ بڑی رغبت سے انہیں استعمال بھی کرتے ہیں اور چونکہ یہ استعمال نہایت برمحل ہوتا ہے اس لیے بیان میں ایک خاص حلاوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اردو زبان کے علیحدہ اور انفرادی تشخص کے لیے تیغِ متروکات سے قتلِ الفاظ کے حق نہیں ہیں بلکہ انہیں زندہ رکھنا چاہتے ہیں تاکہ زبان ایک زندگی بخش عنصر سے محروم نہ ہونے پائے۔ وہ ریختہ کی استادی پر فخر کرتے ہیں اور اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ ریختہ میں بہت سی زبانوں اور بولیوں کا عمل دخل ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان جملہ عناصر میں ہندی کا حصہ سب سے زیادہ ہے چنانچہ وہ ریختہ کے لفظِ متبادل کا درجہ ہندی ہی کو دیتے ہیں۔ اس سے اپنا دلی لگاؤ ظاہر کرنے کے لیے ان کا یہ تجاہلِ عارفانہ ملاحظہ ہو ۔

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو "سرورِ قلب" ۔۔۔ آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ

حالانکہ اس سے کہیں زیادہ مشکل و دقیق عربی اور فارسی الفاظ ان کے کلام میں ہیں جن کا "ہندی زباں کے بیچ" نام و نشان تک نہیں۔ اسی لیے وہ عربی و فارسی الفاظ اور ہندی الفاظ کے درمیان واؤ عطف بلا تکلف لگا جاتے ہیں ۔

تا چند بے دماغی کب تک سخن خشن ہو ۔۔۔ کوئی تو بات کریئے اخلاص و پیار کی بھی

وہ تو محاورات میں بھی اس آمیزش کو روا رکھتے ہیں ۔

مرنے سے تم ہمارے خاطر نچنت رکھو ۔۔۔ اس بات کا بھی ہم کچھ اسلوب کر چکے ہیں

لفظ نچنت کی معنوی وسعت نے بیان میں جو زور اور حسن پیدا کر دیا ہے وہ "خاطر جمع" کے استعمال سے پیدا نہیں ہو پاتا اسی طرح ہندی کے علاوہ کچھ دوسری زبانوں کا اختلاط بھی حسنِ زبانِ میرؔ کا باعث بنا ہے۔ یہاں ہم صرف پنجابی زبان کے حوالے سے بات کریں گے ۔

---

[1] قصابوں نے اسی کو بگاڑ کر لفظِ "کتیب" وضع کر رکھا ہے ۔

پنجابی زبان و محاورہ

پنجابی کے بے شمار الفاظ "دکنی اردو" میں رچے بسے دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں سے ریختہ گوئی کے ذریعے یہ واپس شمالی ہند میں پہنچے اور اردو میں شامل ہو گئے۔ ان میں سے بڑی تعداد ان الفاظ کی ہے جنہیں لغت کی رُو سے ہندی الاصل کہا جاتا ہے لیکن عملاً ان کا چلن بیشتر پنجاب ہی میں دکھائی دیتا ہے۔ وسیع النظر میرؔ نے ان کو بھی "متروکات" کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا بلکہ نہایت خوبصورتی سے استعمال کر کے کلام میں نکھار پیدا کیا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن میں سے بطور نمونہ چند ایک کا ذکر موزوں معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ ؎ دُور اس سے تو اپنے بھائیں آگ لگی ہے گلستاں میں آنکھیں نہیں پڑتی ہیں گل پہ سنکتی ہیں انگاروں سے

"ہمیں تو یوں لگتا ہے" یا "ہمارے نزدیک تو ایسا ہے" یا "ہمیں تو اس طرح دکھائی پڑتا ہے" وغیرہ کی بجائے یہاں "اپنے بھائیں" کہا گیا ہے جو پنجابی ترکیب ہے اور دواوین میں مندرج معنی میں مستعمل ہے لیکن اس اضافی مفہوم کے ساتھ کہ "لوگ جو سمجھتے ہیں سمجھا کریں ہمیں تو یوں لگتا ہے۔۔۔۔۔ الخ" چنانچہ "اپنے بھائیں" (پنجابی "ساڈے بھاویں" یا "ساڈے بھانے") میں جو لسانی اور معنوی حُسن ہے وہ دیگر صورتوں میں کہاں ؟

۲۔ ؎ چشم چرائی دُور سے کر دا مجھ کو لگا یہ کہتے گیا صید کریں گے کل ہم آ کر ڈال چلے ہیں چلا آج

جب بظاہر مخاطب کوئی اور ہو لیکن اصل میں بات کسی اور سے گوش گزار کرنا مقصود ہو تو پنجابی میں کہا کرتے ہیں "ایہہ گل اونے مینوں لاکے آکھی" یعنی "یہ بات اس نے دراصل مجھے سنانے کے لیے کہی" لیکن "سُنا کر کہنا" اور "لگا کر کہنا" میں جو فرق ہے وہ بجائے خود واضح ہے۔ اس سے بیان میں لطف اور مفہوم میں تیکھا پن پیدا ہو گیا ہے!
(آنکھ چرائی کی جگہ "چشم چرائی" بھی میرؔ ہی کہہ سکتے تھے جو "اہل فصاحت" کے نزدیک جائز نہیں)

۳۔ ؎ تد اس بہشتی رُو سے یہ غلطہ بہم کیا جد برسوں ہم نے سورۂ یوسف کو دم کیا

شعر کے سارے الفاظ فارسی اور عربی کے ہیں لیکن جب اور تب کی جگہ جد اور تد کے پنجابی الفاظ لائے گئے ہیں۔ شعر میں زیادہ زور حرف شرط اور متعلق فعل پہ دینا مقصود ہے اور جد تد زیادہ زور دار ہیں۔

۴۔ ؎ فرہاد و قیس ساتھ کے سب کب کے چل دیے دیکھیں نباہ کیوں کہ ہو اب ہم چھڑے رہے

چھڑا بمعنی اکیلا تنہا ہندی میں مستعمل تو ہے لیکن عام نہیں۔ اصل چلن اس کا پنجابی ہی میں ہے اور اس اضافی مفہوم کے ساتھ کہ پنجاب میں یہ لفظ عام طور پر مجرّد یا غیر شادی شدہ مرد کے لیے بولا جاتا ہے اور لازماً تو نہیں لیکن عموماً بے بسی اور مجبوری و بے چارگی کا شائبہ بھی اس میں ہوتا ہے، میرؔ نے اسی لیے اکیلا یا تنہا رہ جانے کی بجائے چھڑا رہ جانے کی ترکیب کو قابلِ ترجیح تصوّر کیا ہے۔

۵۔ ؎ کیا کیا نیاز طینت اے ناز پیشہ تجھ بن مرتے ہیں خاک رہ سے گوڈے رگڑ رگڑ کر

اردو میں "ایڑیاں رگڑ رگڑ کر" بالعموم مستعمل ہے لیکن میرؔ نے پنجابی کے "گوڈے رگڑ رگڑ کے" کہا ہے کیونکہ یہ ترکیب زیادہ زور دار اور بلیغ ہے۔

۶۔ پنجابی کا زور دار کلمۂ تحسین "اشکے ای" ہے (بطور طنز بھی آتا ہے)، اس کا مترادف اردو میں "عشق ہے"

مستعمل تو ہے لیکن صرف شاعری ہی وہ بھی بہت کم کم، میرؔ کے ہاں البتہ کئی اشعار میں استعمال ہوا ہے ؎

شب شمع پر پتنگے کے آنے کو عشق ہے
اس دل جلے کے تاب کے لانے کو عشق ہے

یہ باور کرنا مشکل ہے کہ پنجابی میں یہ کلمہ اردو کے "عشق ہے" سے وجود میں آیا ہو بلکہ زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ پنجابی کے "اشکے ای" نے اردو میں "عشق ہے" کی شکل اختیار کرلی ہوگی کیونکہ اردو کی تو ویسے ہی یہ خصوصیت ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے بعینہٖ یا تصرف کے ساتھ!

۷ـ ؎ گردش میں روسیہ کی کیا کیا بلائیں آئیں
جاتے ہی کے ہیں لچھن سارے اس آسماں کے

لفظ لچھن، کرتوت، انداز، رنگ ڈھنگ وغیرہ کے معنی میں پنجابی میں بہت استعمال ہوتا ہے۔

۸ـ ؎ ہجراں میں ٹک نہ پرچے کوہ اور داغ میں ہم
بوئے دفانہ پائی دل میں دماغ میں ہم

اردو میں برماتا یا بہلاتا زیادہ استعمال کرتے ہیں جب کہ پنجابی میں پرچانا زیادہ بولا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ مثالیں بہت ہیں لیکن ہم اختصار کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ البتہ یہ اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض جگہ پنجابی کے صوفی شعراء کے اندازِ فکر کی جھلک بھی میرؔ کے ہاں دکھائی دے جاتی ہے مثلاً پنجابی کے ایک صوفی شاعر نے کہا ہے ؎

علموں بس کریں او یار
اِکو الف تینوں درکار

(اے دوست علم سے بس کر کیونکہ تجھے صرف ایک الف ہی درکار ہے) میرؔ کہتے ہیں ؎

الف کی رمز اگر سمجھا اٹھا دل بحثِ علمی سے
اسی اک حرف کو برسوں سے ہم تکرار کرتے ہیں[۱]

بہرکیف اس کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں کہ میرؔ نے کسی پنجابی شاعر سے استفادہ کیا ہے یا یہ کہ ان کا حسنِ بیان پنجابی الفاظ و محاورہ کا مرہونِ منت ہے، ہم نے یہ ذکر فقط اس لیے کیا ہے کہ اس وسیع المشرب انسان اور وسیع النظر شاعر نے اپنی وسعتِ فکر و نظر کا عملی ثبوت لسانی اعتبار سے بھی اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ورنہ میرؔ زبان و بیان میں کسی سے استفادے کے محتاج کیونکر ہونے لگے، ہاں دوسرے شاعروں نے ان سے استفادہ ضرور کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میرؔ سے استفادہ

غالبؔ کا مشہور شعر ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

میرؔ کے ہاں یہ مضمون ایک سے زیادہ مرتبہ بندھ چکا تھا ؎

گل یادگارِ چہرۂ خوباں ہے بے خبر
مرغِ چمن نشاں ہے کسو خوش زباں کا

---

[۱] دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

تحصیلِ علم کرنے میں دیکھا نہ کچھ حصول
مَیں نے کتابیں رکھیں اٹھا گھر کے طاق میں

غالبؔ کے انکشاف میں حزن وحسرت کا رنگ نمایاں ہے جب کہ میرؔ کے کشف میں مادے کی تبدیلیٔ ہیئت کا ذکر وثوق سے کیا گیا ہے، نیز غالبؔ صرف خوش رُوؤں کی بات کرتے ہیں میرؔ نے خوش زبانوں کی نشاندہی بھی کردی ہے صرف چہروں کی بات درج ذیل شعر میں کی گئی ہے ؎

کیا خوبی اس چمن کی موقوف ہے کسو پر
گُل گر گئے عدم کو ٹکھڑے نظیر آئے

غالبؔ خاک میں پنہاں ہونے والی (ساری کی ساری نہیں بلکہ) "کچھ" صورتوں کو لالہ وگل میں جلوہ گر پاتے ہیں اور میرؔ خاک میں بل جانے والے لالہ وگل کی آفرینشِ مکرّر کا مشاہدہ ان کے ہم شکل ٹکھڑوں میں کرتے ہوئے مادے کی تبدیلیٔ ہیئت کا تسلسل ٹوٹنے نہیں دیتے اور پھر اپنے مخصوص اندازِ فکر سے وہ اس تخیل کو پوری کائنات پر محیط پاتے ہیں ؎

دیکھو نہ چشم کم سے معمورۂ جہاں کو
بنتا ہے اک گھریاں سو صورتیں بگڑ کر

غالبؔ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

شاعر دریائے حیرت میں ڈبکیاں کھا رہا ہے، سارا اکیمانہ اضطراب فقط استفسار کے بھنور میں چکر کھا رہا ہے، ذہن میں کچھ کہنے کو ہے لیکن زباں رُک رُک جاتی ہے۔ مگر میرؔ کو ایسی کوئی دقت پیش نہیں آئی، انھوں نے اس کیفیت کو صاف صاف بیان کر دیا اور وہ بھی دلیل کے ساتھ ؎

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

یہی نہیں — وہ اس سے بھی آگے، بہت آگے نکل جاتے ہیں ؎

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

یہاں اقبالؔ کا یہ شعر سامنے رکھنا خالی از لطف نہ ہوگا (کہ پروازِ تخیلِ میرؔ بدیہی طور پر بلند تر ہے) ؎

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

اسی طرح اقبالؔ کے ہاں عقل اور دل کا ذکر بہت کیا گیا ہے اور برتری ہمیشہ دل ہی کی ثابت کی گئی ہے۔ میرؔ کے ہاں بھی یہ موازنہ بڑے بلیغ انداز میں ملتا ہے مثلاً ؎

یک توجہ میں رہے ہے سیر اس کی عرش پر
عقل میں آتے نہیں یہ طرفہ طرفہ کارِ دل

عشق کی انتہائی صورت "جنون" ہے چنانچہ اقبالؔ اس کے بھی آرزو مند دکھائی دیتے ہیں ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں
مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

لیکن میرؔ منازلِ جنوں ابتدائے حال ہی میں طے کر چکے تھے، وہ اس کا ذکر بلیغ تر انداز میں قصۂ پارینہ کے طور پر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

خردمندی ہوئی زنجیر ورنہ
گزرتی خوب تھی دیوانہ پن میں

شاید اسی لیے آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ — "غالبؔ و اقبالؔ کو سمجھنا بھی میرؔ ہی کی مدد سے ممکن ہے" ہمارے خیال میں یہ بات "غالب شناسی" کی حد تک ہی کہی جا سکتی ہے کیونکہ غالبؔ نے میرؔ کو استاد بھی مانا ہے،

ان کے معتقد بھی ہیں، ان کے سہل ممتنع انداز میں غزلیں بھی کہی ہیں، دلّی کی تباہی بھی میر کی طرح دیکھی ہے اور اس پر آنسو بہاتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تنگدستی و عسرت سے بھی دوچار رہے ہیں، ہر چند کہ غالب کے غم شراب اور میر کے غم نان شبینہ ـــ بالفاظ دیگر غالب کی فاقہ مستی اور میر کی فاقہ کشی میں بڑا فرق ہے تاہم بے زری کے داغ دونوں نے کھائے ہیں لہٰذا گزر بسر کے ضمن میں ہم آہنگی کسی حد تک بہرکیف پائی جاتی ہے ـــ لیکن امیری کے گرد و نواح میں واقع اقبال کی فقیری اور میر کے فقر و فاقہ میں جو تفاوت ہے وہ میر و غالب کے فرق سے بھی نمایاں تر ہے۔ اقبال نے تو بالآخر ذاتی کوٹھی بھی بنوالی تھی، بچی کی دیکھ بھال ایک فرنگی گورنس کے سپرد تھی، وہ فقر و فاقہ کی بات دوسروں کے حوالے سے کرتے ہیں جب کہ میر کی رہائش چھپروں میں بھی رہی اور اپنے عزیز کو چھپر تلے دب کر مرتے ہوئے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، ہر طرح کی صعوبتیں اور صدمے انھوں نے سچ مچ جسمانی طور پر برداشت کیے تھے اس لیے ان کے واردات اصلی اور حقیقی تھے۔ وہ قلندری کا فلسفہ بیان نہیں کرتے بلکہ اس کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔ وہ بھاری بھرکم فلسفوں سے کلام و پیغام کو بوجھل نہیں ہونے دیتے۔ وہ قلندری کی کیفیت اپنے تجربے کی روشنی میں بیان کرتے ہیں ؎

زنجیر سر ہوا ہے تھا سلسلہ جو یاد کا　　ہیں نے نکل جنوں سے مشق قلندری کی

انھوں نے عرفان و وجدان اور شعور و آگہی کی منزلیں جس انداز سے طے کیں وہ غالب سے مختلف اور اقبال سے یکسر مختلف تھا، چنانچہ آل احمد سرور کا نظریہ تبصرہ طلب ہے البتہ ان کا یہ تجزیہ بالکل صحیح ہے کہ ـــ

"غالب اور اقبال نے افکار کو اظہار بنانے میں جو پاپڑ بیلے وہ میر کو نہیں بیلنے پڑے
غالب اور اقبال کو پتھر نچوڑنے پڑے، میر کے جذبہ کی آنچ سے پتھر خود پگھل گئے،
اسی لیے حُسنِ بیان .... الخ"

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فلسفۂ تخلیق پر چوٹ کرتے ہوئے اقبال جارحانہ گستاخی کی حدود میں نکل گئے ہیں ؎

آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر　　روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل

لیکن میر طنز ملیح کا انداز اختیار کرتے ہوئے زیادہ باوقار اور سنجیدہ لہجے میں کہتے ہیں ؎

اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اُوپر بہم پہنچے　　جو خاطر خواہ اپنے ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتے

"صانع کے مزاج" کی ترکیب میر ہی وضع کر سکتے تھے اور اس پر پورا اُترنے کی بات بھی وہی کر سکتے تھے! میر و اقبال کا موازنہ مقصود نہیں، نہ ہی اس کی کوئی ضرورت یا گنجائش تالیفِ ہذا میں ہے، ہمیں تو سرور صاحب کی بات پر تعجب ہوا کیونکہ میر و اقبال کی افتادِ طبع میں بہت زیادہ فرق واقع ہوا ہے اور طبائع کی ہم آہنگی کے بغیر خیالات و افکار میں ہم آہنگی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ ان میں تو بظاہر کوئی قدر مشترک دکھائی دے بھی جائے تو درحقیقت وہ مختلف ہی ہوتی ہے مثلاً "احترامِ آدمیت" کا ذکر دونوں کے ہاں موجود ہے لیکن میر کے ہاں اس کی اساس امن و آشتی، صلح و محبت اور مخلصانہ اخوت و مروّت پر استوار کرنے کی کوشش کی گئی ہے جب کہ اقبال کے نزدیک مظاہرۂ قوت و ہیبت ہی مقصودِ زندگی ہے چاہے اس کے ڈانڈے جارحیت سے جاملیں! شاہین پرندوں کی دنیا کا "درویش" ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (حالانکہ آشیانہ

تو چمگادڑ بھی نہیں بنا تا) لیکن یہی دُوَیش "اپنی دنیا" سے متعلق مخلوق پر عرصۂ زیست تنگ کیے رکھتا ہے۔ اپنے سے کمزور پرندوں کا شکار کر کے انھیں تڑپتے پھڑکتے ہوئے ہی نوچنا شروع کر دیتا ہے، ان کے لہو سے زیادہ مزا ان پر جھپٹنے میں ہے کہ جذبۂ درویشی کی تسکین اسی طرح ممکن ہے۔ کبوتر سزائے موت کا سزاوار ہے کیونکہ قاضیٔ تقدیر نے ازل ہی میں جرم ضعیفی کی سزا "مرگِ مفاجات" مقرر کر دی تھی ــــ لیکن کیا شاہین اور کبوتر کی تخلیق خود قاضیٔ تقدیر ہی نے الگ الگ فطرت، الگ الگ طاقت اور مزاج کے ساتھ ازل ہی میں نہیں کر دی تھی؟ کبوتر پر طنز اصل میں ترکیبِ تخلیق پر طنز ہے نہ کہ اس معصوم پرندے پر، اس کو بھی یہ کہنے کا حق حاصل ہونا چاہیے کہ ؎

آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر ۔ کیونکہ ــــ وہ تو ویسے ہی رہتا ہے جیسا اسے بنایا گیا ہے اور پھر حیوان ہونے کے باعث فلسفۂ قہاری وجباری کا مطالعہ بھی اس نے نہیں کیا! میرؔ تشدّد وجارحیت سے گریز کا مشورہ بزدلی کی بنا پر نہیں دیتے بلکہ اس نقطۂ نظر سے دیتے ہیں کہ وہ خاتمہ بدی کا چاہتے ہیں نہ کہ بدوں کا، ظلم کو مٹانا چاہتے ہیں ظالموں کو نہیں ــــ کہ بدی اور ظلم کا تصوّر ختم ہو جائے تو بدوں اور ظالموں کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ پس اس ضمن میں اقبالؔ کے اخذ کردہ اصول اور جاری کردہ احکام علائے میرؔ سے یکسر متضاد ہیں لہٰذا میرؔ کو سمجھ کر غالبؔ کو سمجھنے میں تو مدد مل سکتی ہے لیکن اقبالؔ کو سمجھنے میں قطعاً نہیں۔ اور "سمجھنے" سے مراد اگر چشمِ دل کا وا ہونا ہے تو اس پر میرؔ نے خود بہت زور دیا ہے ؎

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر   منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

میرؔ کے نزدیک جبر وتشدد سے زیادہ وہ تقدس قابلِ احترام ہے جو انسان کی تخلیق میں مضمر ہے ؎

باوجود ملکیت نہ ملک میں پایا   وہ تقدس کہ جو ہے حضرتِ انساں کے بیچ

۳ ــــ ستم ظریفی کے سلسلے میں غالبؔ کا مشہور شعر ہے ؎

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی   سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

میرؔ اس مضمون کو یوں باندھ چکے تھے ؎

کہا تھا میں نہ دیکھو غیر کی اُور   سو تم نے آنکھ مجھ سے ہی چھپائی

میرؔ کے ہاں لفظ "ستم ظریفی" محذوف ہے جس سے شعر میں مزید حسن پیدا ہو گیا ہے۔

۴ غالبؔ نظر لگے نہ کہیں اس کے دست وبازو کو   یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

میرؔ ڈرتا ہوں مالکانِ جزا چھاتی دیکھ کر   کہنے لگیں نہ واہ رے زخم اس کے ہاتھ کا

شعرِ میرؔ میں نظر لگنے کا ذکر محذوف ہے جس نے مضمون کو بلیغ تر بنا دیا ہے۔ غالبؔ لوگوں کی نظر کی بات کرتے ہیں میرؔ مالکانِ جزا کی ــــ جس سے واقعہ اور بھی مہتم بالشان بن جاتا ہے۔ پھر یہ کہ غالبؔ کا مضمون نظرِ بد تک محدود ہے جب کہ میرؔ کو اس سے بھی زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ مالکانِ جزا کہیں اس کے ہاتھ کے زخم کی داد ہی دیتے نہ رہ جائیں اور داد خواہ بے چارہ دادرسی سے محروم ہی رہے بلکہ ظالم داد وتحسین کا مستحق قرار پائے۔!

۵۔غالبؔ غمِ ہستی سے گر یائی بھی فرصت سر اٹھانے کی فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

میرؔ عشق ہمارے در پئے جاں ہے آئے گھر سے نکل کر ہم سر پر دیکھا ہی فلک ہے جاویں کیدھر چل کر ہم

میرؔ نے صرف "عشق" کہہ کر "غمِ ہستی" کی وضاحت بھی کر دی ہے۔

۶۔ظفرؔ نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر

پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

میرؔ بدتر خود سے پاؤں کسو کو تو میں اس کا عیب کروں خوب تامل کرتا ہوں تو سب مجھ سے بہتر ہیں لوگ

ظفرؔ کچھ عرصہ تک عیب جوئی کا ارتکاب کرنے کے بعد انتقادِ ذات کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن میرؔ ابتدائے حال ہی سے آگاہ ذات دکھائی دیتے ہیں۔

۷۔شیفتہؔ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

میرؔ ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

(یہ مضمون میرؔ کے ہاں اور بھی متعدد صورتوں میں باندھا گیا ہے)

۸۔ذوقؔ ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

میرؔ پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ غالباً زیرِ زمیں میرؔ ہے آرام بہت

یہاں لفظ غالباً خالی از لطف نہیں، بالکل مکالمے کا انداز ہے گویا کسی سے محوِ گفتگو ہیں [1]

---

[1] کلام میرؔ میں جگہ جگہ جو مکالمے اور گفتگو کا انداز پیدا ہو گیا ہے وہ اتفاقی یا غیر شعوری نہیں ہے۔ وہ دردِ دل بیان کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں بلکہ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ لوگ ان کی اس کیفیت سے آگاہ ہیں ؎

مر گئے پر مرے تکیے پہ کہیں گے "میاں میرؔ دردِ دل بیٹھے کہانی سی کہا کرتے تھے"

میرؔ کے اس انداز کو کلیم الدین احمد جیسے نکتہ چین بھی سراہے بغیر نہ رہ سکے۔ اس پہلو کی سیکڑوں مثالوں کا احاطہ تو یہاں نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے تو ایک الگ مضمون درکار ہے، یہاں صرف چند نمونے ہی پیش کیے جا سکتے ہیں مثلاً ؎

۱۔۔۔ یہ سرگزشت میری افسانہ جو ہوئی ہے مذکور اس کا اُس کے کوچے میں جا بجا تھا

سُن کر کسی سے وہ بھی کہنے لگا تھا کچھ کچھ بے درد کتنے بولے "ہاں! اس کو کیا ہوا تھا"

کہنے لگا کہ "جانے میری بلا عزیزاں! احوال تھا کسو کا کچھ میں بھی سُن لیا تھا"

۲۔۔۔ جو ہو میرؔ بھی اُس گلی میں صبا بہت پُوچھیو تو میری اُدھر سے

۳۔۔۔ میں کہا "دیکھو ادھر ٹک تم تو میں بھی جان دوں" ہنس کے بولے "یہ تیری باتیں ہیں پر دیکھیں گے ہم"

۴۔۔۔ نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں کھنچیں میرؔ تجھ سے ہی یہ خواریاں

۵۔۔۔ کہنے لگا نہ واہی بک اتنا کیوں ہوا ہے سڑی؟ ابے جا بھی!

باقی صفحہ ۳۵ پر

۹ غالبؔ فنا تعلیم درسِ بے خودی ہوں اس زمانے سے کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

میرؔ دیوانگی میں مجنوں میرے حضور کیا تھا لڑکا سا ان دنوں تھا اس کو شعور کیا تھا

غالب نے سوائے اس کے کہ شعر کو دشوار فہم بنا دیا ہے اور کوئی اضافہ مضمونِ میرؔ میں نہیں کیا۔

استفادے کی صورت بعض جگہ میرؔ کے اپنے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے لیکن وہ الفاظ کے علاوہ مفہوم میں بھی اتنی وسعت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ بالکل طبعزاد معلوم ہونے لگتا ہے۔ حافظ کا بہت مشہور شعر ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

میرؔ نے سرِ دلبراں کی جگہ خبثِ یاراں اور حدیثِ دیگراں کی بجائے افسانوں کہہ کر حافظ کے پورے شعر کا مفہوم تو ایک ہی مصرعے میں زیادہ وضاحت سے پیش کر دیا ہے اور دوسرے مصرعے میں ایک آفاقی صداقت اس خوبی سے بیان کی ہے کہ مصرعے پر ضرب المثل کا گمان ہونے لگتا ہے ؎

خُبثِ یاروں کا کر افسانوں میں عیب کرنے کو بھی ہُنر ہے شرط

میرؔ کی یہی وہ ہنرمندی ہے جسے انھوں نے سلیقہ مندی بھی کہا ہے، اور اسی کو حاصلِ زیست قرار دیا ہے ؎

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ناکامیوں سے "کام لینا" میرؔ جیسے حوصلہ و سلیقہ ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ اسی کی بدولت نہ صرف شعورِ ذات حاصل ہوتا ہے بلکہ شعورِ کائنات بھی، چنانچہ میرؔ اپنے زمانے کے اجتماعی کردار سے ایک طرف مایوس تھے تو دوسری طرف اس کے انجام سے بھی باخبر تھے۔ اس صاحب نظر کو معلوم تھا کہ قدرت اس بدکرداری کی سزا اس معاشرے کو ضرور دے گی —— اور پھر جب واقعی آشوب و ابتلا نے عرصۂ زیست سب پر تنگ کر دیا تو میرؔ کو کوئی حیرت نہ ہوئی، فقط یہ کہنا کافی سمجھا ؎

ہو جائے کیوں نہ دوزخ باغِ زمانہ ہم پر ہم بے حقیقتوں کے کردار ایسے ہی تھے!

امراء اور میرؔ

ان بے حقیقتوں میں سب سے زیادہ قابلِ مذمت اُمراء تھے کہ میرؔ کے ہر سخن کی تو در کنار ان کے پورے دیوان کی قدر و قیمت بھی نہ پہچانتے تھے۔ میرؔ نے برملا اپنے ردِعمل کا اعلان بھی کیا ہے ؎

جیسی عزت مرے دیواں کی امیروں میں ہوئی ویسی ہی ان کی بھی ہوگی مرے دیوان کے بیچ

بقیہ صفحہ ۳۴

۸—— جی ہی کھپ جاتا ہے طنز آمیز ایسے لطف سے ہنس کے جب کہتا ہے سب میں "آئیے جی آئیے"

اس ضمن میں بسا اوقات منظر کشی اس بلا کی ہوتی ہے کہ واقعہ کی چلتی پھرتی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

۹—— کب تک ہم انتظار میں ہر لحظہ بے قرار گھر سے نکل نکل کے گلی میں نظر کریں

ب—— اوّل تو آتے ہی نہیں ہو اور کبھو جو آتے ہو نیچی نظریں کیے پھرتے ہو مجلس میں شرمانے سے

اور واقعی ایسا کیا بھی ہے اور ان کی سرمایہ دارانہ خستت ذہنیت پر اس طرح چوٹ کی ہے ؂

کیا کہیے اپنے عہد میں جتنے امیر تھے
ٹکڑے پہ جان دیتے تھے سارے فقیر تھے

بلکہ اپنی ذات کے حوالے سے بھی ان دشمنانِ انسانیت کی مذمت کی ہے ؂

نہ بل میرؔ اب کے امیروں سے تو
ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

ان لوگوں کی جو چیز سب سے زیادہ قابل نفرت و ملامت تھی وہ ظاہر و باطن کی دو رنگی تھی جب کہ میرؔ اسی یک رنگی کو کمالِ انسانیت تصوّر کرتے تھے۔ دو رنگی ہی سے سارے مکر و فریب جنم لیتے ہیں جس کا رونا روتے روتے میرؔ تھک جاتے ہیں تو تنگ آکر اپنے آپ سے پوچھنے لگتے ہیں ؂

غم کو تمہارے دل کے نہایت نہیں ہے میرؔ
اس قصّے کو کروگے بھی تم مختصر کبھو

میرِ خود دار

میرؔ خود دار تھے، بلاشبہ خود دار تھے لیکن کسی مصنوعی یا غیر فطری خودی[1] کا خول انھوں نے اپنی شخصیت پر نہیں چڑھایا، نہ اس کا ڈھنڈورہ پیٹ کر دکان شہرت کو چمکانے کی کوشش کبھی ضروری تصور کی۔ جو کچھ تھا اپنے عمل سے اس کا اظہار کیا ــــ گیارہ برس کی عمر سے ٹھوکریں کھاتے کھاتے اوّلین مربی انہیں رعایت خاں کی صورت میں ملا تھا لیکن جونہی اس نے یہ فرمائش کی کہ اپنی کچھ غزلیں فلاں قوّال بچے کو یاد کرادو، میرؔ اس کی ملازمت ترک کر کے گھر جا بیٹھے جہاں کھانے کو روٹی بھی نہ تھی ؂

غم کھاویں یا غصّہ کھاویں یوں اوقات گذرتی ہے
قسمت میں کیا خستہ دلوں کے یہی لکھے تھے کھانے دو؟

ایک اور سرپرست راجا جگل کشور نے اپنا کلام اصلاح کے لیے پیش کیا تو اس کے پورے کلام پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا کیونکہ وہ "کلام الملوک ملوک الکلام" کہہ کر انعام و اکرام کے متمنّی نہ تھے وہ تو ناقص کو ناقص ہی کہہ سکتے تھے حالانکہ افلاس بلکہ قلّاشی کا عالم تب بھی وہی تھا چنانچہ وہ جب کہتے ہیں کہ ؂

کہنا جس سے جو کچھ ہوگا سامنے میرؔ کہا ہوگا
بات نہ دل میں پھر گئی ہوگی منہ پر میرے آئی ہوئی

تو محض زورِ کلام کی نمائش کے لیے نہیں کہتے بلکہ اس لیے کہ وہ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ اس کی سب سے اہم مثال انھوں نے نواب آصف الدولہ کے سامنے یہ کہہ کر پیش کی تھی ــــ

---

[1] میرؔ کے ہاں لفظِ خودی لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی "اپنا آپ"، "خود غرضی، خود سری" وغیرہ۔ البتہ اسے بمعنی "فخر" انھوں نے اکثر استعمال کیا ہے، تاہم بلند انداز میں وہ اس سے مراد غرور اور تکبّر ہی لیتے ہیں جس کے لیے اردو کہاوت بھی ہے کہ "خودی اور خدائی میں بیر ہے" لہذا ان کے جو اشعار تصوّف کے رنگ میں ہیں، ان میں اس کا استعمال انہی معنی میں ہوا ہے ؂

نہ کھینچیں کیونکہ نقصاں ہم تو قیدی ہیں تعیّن کے
خودی سے کوئی نکلے تو اسے ہووے خدا حاصل

"شاہوں کو پسند آنے والا عیب بھی ہُنر بن جاتا ہے" (ہر عیب کہ شاہاں بہ پسندند ہنر است) چنانچہ وہ جب شیخ یا زاہد پر چوٹ کرتے ہیں تو محض روایت کے انداز میں یا عام روش کی تقلید میں نہیں کرتے بلکہ اس لیے کہ وہ اس کو اسی کا سزاوار پاتے ہیں۔ اپنے مخصوص مکالماتی انداز میں کھلے بندوں زاہد سے یوں خطاب کرتے ہیں ؎

کہنا ترے منہ پہ تو نپٹ بے ادبی ہے　　زاہد جو صفت تجھ میں ہے سو زن جلبی ہے

ماشی حاکموں کی اصلیت یوں ظاہر کی ہے ان کے عہدہ و اختیار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ؎

بارے مستوں نے ہوشیاری کی　　دے کے کچھ محتسب کا مُنہ جُھلسا!

خودداری و مجبوری

اس حق گوئی و بے باکی کا خمیازہ ان کو عمر بھر بھگتنا پڑا لیکن اس کی سب سے زیادہ تکلیف دہ صورت وہ ہے جب زندگی کے ظالم تقاضوں سے مجبور و بے بس ہو کر بدکرداروں سے "بنا کر" رکھنا ان کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جن کی بدکرداری سے انہیں کراہت ہوتی ہے، جن کی وہ قدم قدم پر مذمت کرتے ہیں، انہی سے "بنا کر رکھنا" امر مجبوری بن جاتا ہے۔ ابن الوقتی کے بہروپ میں نہیں بلکہ بے بسی کی زنجیر میں کسے جانے کی بدولت ــــــ اس کے باوجود یہ اعلان کرتے ہوئے کہ حالات نے بُروں کے ساتھ بنا کر رکھنا لازم کر دیا ورنہ اصل میں تو یہ لوگ اس قابل ہرگز نہیں، لہٰذا اس مجبوری کو "ستم تازہ" کہہ کر بدکرداروں پر چوٹ کر ہی جاتے ہیں ؎

یہ ستم تازہ کہ اپنی ناکسی پر کر نظر　　جس سے بگڑا چاہیئے اس سے بنایا چاہیئے

کلیدِ میریات

اس ایک شعر کے پس منظر میں جھانکا جائے تو میرؔ کی جملہ ناکامیوں، نامرادیوں، محرومیوں اور حزن و ملال کے الاؤ دہکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جن میں گیارہ برس کی عمر سے لے کر نوّے سال کی عمر تک وہ مسلسل جلتے بُھنتے اور تڑپتے رہے ؎

کیا میرؔ ہے یہی جو ترے دَر پہ تھا کھڑا　　نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

یہ ہیئت محض ذاتی غموں کی عطا کردہ نہیں بلکہ اس تمام عرصے میں دنیا کی مجموعی کیفیت بھی انہیں ملول سے ملول تر کرتی رہی جہاں فکرِ محشر سے بے نیاز اہلِ دنیا نے خود غرضی و انسان دشمنی کے باعث ہر دن کو نفسی نفسی کا دن بنا رکھا ہے۔ انسانیت کی اس بے حرمتی نے ان کے دلِ دردمند کو ہمیشہ تڑپائے رکھا ؎

ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ دل پر ہے　　خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

انسانیت کی تذلیل میرؔ کو مبتلائے غم رکھتی ہے، تس پہ "ستم تازہ" کے تحت "جس سے بگڑا چاہیے اس سے بنایا چاہیے" کی فکر اس غم میں مزید شدت پیدا کر دیتی ہے ــــ اس طرح سلسلۂ غم دراز سے دراز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کیفیت کو ذہن نشین کر لیا جائے تو "کلیدِ میریات" ہاتھ آجاتی ہے اور غمِ میرؔ کی آفاقیت واضح ہونے لگتی ہے!

اس کے بعد ان کے کلام میں خستگی، شکستگی، برشتگی اور سوختگی کے مضامین کی کثرت دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچنا دشوار نہیں رہتا کہ ان پر جو کچھ بیتی آخر ان کے تن بدن ہی پر تو بیتی تھی، پھر اعضائے بدن کا ذکر بار بار کیوں نہ ہو گا ؎

اب حیرت ہے کس کس جاگہ پنبہ و مرہم رکھنے کی　　قد تو کیا ہے سرو چراغاں داغ بدن پر کھا کھا ہم

غم سہنے کے لیے طاقت درکار ہوتی ہے۔ جسم کے ہر عضو کو یہ طاقت خرچ کرنا پڑتی ہے خصوصاً دل و جگر کو جو منبعِ طاقت کہلاتے ہیں۔ آہیں کھینچنے کو سینہ چاہیے، آنسوؤں کا مقابلہ آنکھوں کو کرنا ہوتا ہے، ٹھوکریں کھانے کو پاؤں اور چھاتی پیٹنے کو ہاتھ کام آتے ہیں۔ فریاد کرنے کے لیے زبان و لب کا محوِ فغاں ہونا لازم، منہ نوچنے کو ناخن ہوتے ہیں، ماتھا بھی رگڑنا پڑتا ہے۔ سوچ اور فکر کا بوجھ دماغ کو برداشت کرنا پڑتا ہے، کشت دھن اور جور و ستم کے مناظر نگاہوں کو دیکھنا پڑتے ہیں، پلکیں بھیگ بھیگ جاتی ہیں، گریہ سے اشکوں کا رنگ خونیں ہو جاتا ہے، مژگاں تر رہنے لگتی ہیں، جی گھبراتا ہے، جان بے قرار ہو جاتی ہے — میر نے ان میں سے کیا کچھ نہیں برداشت کیا تھا — کس کس طرح سے دل و جگر خون ہو ہو گئے تھے، کیسے کیسے بوجھ دماغ پر پڑے تھے، سر کو کیسے دے دے مارا تھا ؎

چھاتی کوٹی منہ نوچا سر دے دے مارا پتھر سے   دل کے ہمارے خون ہونے میں یہی طریق ہے ماتم کا

پھر یہ خونِ دل میرؔ ہی کی بات نہیں خونِ زمانہ کی، خونِ انسانیت کی بات ہے جو اٹھارھویں صدی ہی تک محدود نہیں، ہر صدی کی بات ہے جس میں ماضی حال مستقبل سب آجاتے ہیں ؎

تڑپے ہے متصل وہ کہاں ایسے روز و شب   ہے فرق میرؔ برق و دلِ بے قرار میں

میرؔ نے دلی کی تباہی دیکھی تھی یا لکھنؤ کی زوال بردوش سلطنت، آج پوری دنیا آفات کی لپیٹ میں ہے۔ میرؔ نے جو خون دنوں، ہفتوں، مہینوں میں بہتے دیکھا تھا آج اس سے کہیں زیادہ چشمِ زدن میں بہایا جا سکتا ہے، بہایا جا چکا ہے، بہایا جا رہا ہے اور بہلانے کے حیلے تلاش کیے جا رہے ہیں۔ اس انسانی دکھ کا مداوا میرؔ کے ہاں موجود ہے، آج بھی موجود ہے بشرطیکہ ان کی بات کو سمجھنے کی سنجیدگی سے کوشش کی جائے مگر یہ کوشش تو ان کے اپنے دَور اور دیار میں بھی نہیں کی گئی تھی۔ ع "نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری!" ہم نے اسی لیے بار بار کہا ہے کہ ان کا غم نہ صرف اجتماعی بلکہ آفاقی یعنی ہر دَور کے لیے تھا — انفرادی غم ہوتا تو لکھنؤ میں نسبتاً آسودگی میسر آجانے پر ختم ہو جاتا کیونکہ وہ قانع و صابر تھے جو شیوۂ شرفا ہے۔ اس تسلسلِ غم کا ٹوٹنے نہ پاتا ہی ان کی اقدار پروری اور انسان دوستی کا سراغ بہم پہنچاتا ہے۔ پہلے وہ دلی کی تباہی پر روتے رہے، پھر لکھنؤ میں انہیں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ لکھنوی تہذیب و سلطنت کی اپنی جڑیں بالکل کھوکھلی تھیں جو اہلِ لکھنؤ کو بحالتِ عیش و عشرت دکھائی نہ پڑتی تھیں لیکن میرؔ کی حقیقت شناس نگاہیں اسے آمادۂ زوال پاتی تھیں جیسے جشنِ چراغاں میں کسی کی نگاہ اس چراغ پر اٹک کر رہ جائے جسے ہوا کے جھونکے نے بجھا دیا ہو یا روغن کی کمی کے باعث اس نے خود ہی دم توڑ دیا ہو!

میرؔ کی دُوربین نگاہوں سے تو یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہ تھی کہ ہندو مسلم اتحاد ایک امرِ دشوار ہے اور کوئی بھی تدبیر ان کی باہمی یک جہتی کے لیے کارگر نہیں ہو سکتی۔ کس وثوق سے کہتے ہیں ؎

مسلم و کافر کے جھگڑے میں جنگ و جدل سے رہائی نہیں   لوتھوں پہ لوتھیں گرتی رہیں گی کٹتے رہیں گے سر کے سر

کیا میرؔ کے ذہن میں "دو قومی نظریے" کا ناقابلِ تردید تصور اس وقت بھی موجود تھا؟ بھارت میں آئے دن

برپا ہونے والے مسلم کش فسادات اس پیش گوئی کے شاہد ہیں۔ عام ہندو ذہنیت کی قلعی یوں کھولی گئی ہے ؎

برہمن زادگانِ ہند کیا پُرکار و سادے ہیں مسلمانوں کی پامالنے میں ہی تکفیر کرتے ہیں

داخلیت پسندی کی حقیقت

میرؔ کو داخلیت پسند کہنے والے یہ تصور کرتے ہیں کہ انہیں خارجی زندگی سے نہ کوئی لگاؤ تھا نہ اس کی کچھ خبر ہی تھی! لیکن انہیں ایسے کسی شاعر کا نام بتانا ہوگا جس نے خارجی ماحول کو بچشم خود میرؔ سے زیادہ دیکھا ہو۔ میرؔ سے زیادہ سفر ان کے کسی ہم عصر نے نہیں کیے نہ ہی ربع صدی کے دوران درجن بھر سے زیادہ ملازمتیں کسی اور نے اختیار کیں۔ میرؔ نے سفارت تک کے فرائض بھی انجام دیے جب وہ راجا ناگرمل کی ملازمت میں تھے (راجا نے مغل حکمران احمد شاہ کے سفیر حسام الدین سے بات چیت کے لیے میرؔ کو اپنا نمائندہ مقرر کیا تھا) اور میرؔ اس سفارت میں کامیاب بھی رہے مگر راجا کے بیٹے نے باپ کو غلط مشورہ دے کر میرؔ کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا بلکہ مایوسی کے علاوہ میرؔ کو خاصی ذلت و پریشانی کا سامنا بھی کرنا پڑا اور خوار ہو کر کاماں (بھرت پور) سے نکلنا پڑا ـــــ اور نتیجۃً جن مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا انہی کا اظہار انہوں نے اپنے مشہور مخمس میں کیا ہے۔ کیا وہ اشعار کسی داخلی تجربے کے تحت کہے گئے تھے؟ وہ تو بہت بڑا خارجی تجربہ تھا جس کی نوعیت سیاسی اور تاریخی تھی! البتہ ایک غزل گو کی حیثیت سے وہ خارجی محرکات کو بھی داخلی احساسات سے مربوط کر دیتے ہیں اور ہر شخص ارتباط کے اس نازک رشتے کو دیکھ نہیں پاتا۔ میرؔ کی داخلیت اپنی غذا تو خارجیت ہی سے حاصل کرتی ہے۔ انہیں موادِ سخن تو خارجی مشاہدات ہی نے بہم پہنچایا ہے۔ خارجی ماحول کی عطا کردہ مایوسی ہی تو ان کی داخلی کشمکش کا باعث بن جاتی ہے۔ یہی روحانی کشمکش انہیں اس مقام پر لے جاتی ہے جہاں زندگی کی بلندیاں اور پستیاں ایک سطح پر دکھائی دینے لگتی ہیں اور وہی ہمواری ان کی شخصیت کا جزو بن جاتی ہے ؎

ارض و سما کی پستی بلندی اب تو ہم کو یکساں ہے یعنی نشیب و فراز جو دیکھے طبع ہوئی ہموار بہت

میرؔ کی خلوت پسندی کا باعث مردم بیزاری نہیں، بلکہ یہ کہ وہ خود مردم آزاروں کے ستائے ہوئے تھے اور بے دردوں، بے اصولوں اور انسان نما حیوانوں سے اختلاط و ربط کسی بھی خوش اخلاق کے لیے ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس انسانیت دشمن ماحول میں انہیں جلوت و خلوت میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا تھا، بھرے بازار بھی ان کے لیے ویرانے ہی تھے۔ چہروں کا ایک جنگل تھا جس میں وہ خود کو تنہا محسوس کرتے تھے۔ ورنہ فدائے انسانیت سے زیادہ انسان دوست کون ہو سکتا ہے مگر انسان دوست حد کہ ہجوم دوست، اور یہ ہجوم بھی وہ جو یکسر گم کردہ راہ ہو ـــــ اور یہی گمرہی شاعر کی دل گرفتگی کا باعث ہو، چنانچہ صاف کہتے ہیں ؎

گرفتہ دل ہوں سِیر ارتباط مجھ کو نہیں کسو سے شہر میں کچھ ارتباط مجھ کو نہیں

وہ دنیا اور دنیا کے کاموں سے محترز اور گریزاں نہیں تھے۔ ان کاموں سے مفر ممکن ہی کہاں ہو سکتا ہے۔ کس بلیغ پیرائے میں کہا ہے ؎

جگر چاکی، ناکامی، دُنیا ہے آخر نہیں آئے جو میرؔ کچھ کام ہو گا

"کچھ کام ہوگا" کی نوعیت پہلے ہی واضح کردی یعنی ناکامی اور اس کے نتیجے میں جگر چاکی ـــــ کہ یہی وہ کام تھے جو اہلِ زمانہ نے انہیں سونپ رکھے تھے! کیا اس ایک شخص کے معمولاتِ زندگی پورے معاشرے کی عکاسی نہیں کرتے؟ اس کے آئینہ فکر میں جھلکتے ہوئے تجربات پوری انسانیت کے عکاس ہیں۔ شعرِ میر جن آفاقی عناصر سے عبارت ہے اس سے استفادہ کیا جائے تو زندگی کے دھارے بدلے جا سکتے ہیں کیونکہ جلنے کا سلیقہ اور جل جل کر زندہ رہنے کا ہنر حاصل کرنے کے لیے جس "دلِ دردمند" کی ضرورت ہے، میر اسی کی بات کرتے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا مسفارت میں ناکامی پر ان کا مشہور مخمس کسی ایک ناکامی کا نوحہ نہیں بلکہ پوری زندگی کا مرثیہ ہے، کس طرح ایک خود دار لیکن مجبور، سعی و کوشش کے باوجود مجبور انسان آہ و فغاں کا شکار ہو جاتا ہے۔ رنگِ شکایت میں خود داری کی نمود ملاحظہ ہو ؎

جانا نہ تھا جہاں مجھے سو بار واں گیا ضعفِ قویٰ سے دست بدیوار واں گیا
محتاج ہو کے، ناں کا طلب گار واں گیا چارہ نہ دیکھا، مضطر و ناچار واں گیا
اس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

لیکن خود داری کی یہ دبی دبی لہر انہیں ناکافی معلوم ہوتی ہے اور اپنی شانِ انفرادیت کی نفی ناگوار گزرتی ہے تو اپنی تمام مجبوریوں کے باوجود اہلِ جفا کی تذلیل ان الفاظ میں برملا کرنے لگتے ہیں ؎

در پر ہر اک دنی کے سماجت مری گئی نا لائقوں سے ملتے لیاقت مری گئی
کیا مفت ہائے شانِ شرافت مری گئی ایسا پھرایا اس نے کہ طاقت مری گئی
مشہورِ شہر اب ہوں سبکسار و بے وقار

یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جہاں وہ اپنے اعضائے بدن کی خستگی کا ذکر لازماً کرنے لگتے ہیں ـــــ یہاں اپنی جسمانی شکستگی کا خاکہ یوں پیش کیا ہے ؎

دل سر بسر خراب ہے تعمیر کیا کروں آشفتگیٔ حال کی تعبیر کیا کروں
خونابہ ہائے چشم کی تقریر کیا کروں زردیٔ رنگِ چہرہ کی تحریر کیا کروں
آیا جو میں چمن میں خزاں ہو گئی بہار

اور آخری بند اُن لوگوں کے لیے دعوتِ فکر ہے جو میر کو "بدماغی برائے بدماغی" کا مرتکب کہا کرتے ہیں ؎

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ ہے نام مجلسوں میں مرا میرِ بے دماغ

از بسکہ کم دماغی[1] نے پایا ہے اشتہار

اِس کے بعد یہ شعر مکرّر پڑھیں ؎

یہ ستم تازہ کہ اپنی ناکسی پر کر نظر
جس سے بگڑا چاہیئے اس سے بنایا چاہیئے

تو پتہ چلتا ہے کہ یہ انسانی مجبوریوں کی کیسی سچی تصویر ہے۔ ابن الوقتوں کی ساری کامرانیاں اسی "وضع" کی رہینِ منت ہوتی ہیں اور میرؔ ابن الوقت نہیں تھے، ان سے تو یہ الفاظ شدتِ احساس نے کہلوائے ہیں جن سے دُکھ صاف ظاہر ہوتا ہے ــــــ ورنہ وہ تو صاحبِ دل اور صاحبِ نظر تھے۔ انسانیت کے یہی وہ مقام ہیں جن تک رسائی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ہر زمانے میں ان صفات کے مدعیوں کی تعداد اچھی خاصی دکھائی دیتی رہی ــــــ میرؔ نے ان جھوٹے دعویداروں کو بہت سے اشعار میں ہدفِ طنز بنایا ہے، چنانچہ بظاہر خود پر لیکن درپردہ مدعیانِ باطل پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اہلِ نظر کسُو کو ہوتی ہے محرمیت
آنکھوں کے اندھے ہم تو مدت ہے حرم میں

حقیقتِ عبادت

ان کے نزدیک دین و مذہب مخصوص قسم کی نمائشی عبادات سے عبادت نہیں، عبادت کا اصل مقصد تطہیرِ نفس اور اصلاحِ اخلاق ہے اور اسی چیز کو وہ ہر مذہب کے لوگوں میں مفقود پاتے تھے مسلمان ہونے کے ناطے وہ مسلمانوں سے مثالی کردار کی توقع کرتے ہیں لیکن عملاً وہ انہیں بالکل کورا پاتے ہیں تو سٹ پٹا کر رہ جاتے ہیں ؎

رحم آشنا کسُو کو اس بستی میں نہ پایا
اسلامیوں کی یاں کے تکفیر ہے مناسب

حق گوئی

اس لیے کہ وہ رحم جیسی بنیادی صفت سے بھی عاری ہیں۔ مسلمانوں کی حق گوئی سے ناآشنائی انہیں اور بھی رنجیدہ کر دیتی ہے، چنانچہ پھر بظاہر خود پر لیکن اصل میں خطاکاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ؎

میرؔ بھی دیر کے لوگوں ہی کی سی کہنے لگا
کچھ خدا لگتی بھی کہتا جو مسلماں ہوتا

بتوں کے جرم الفت پر ہمیں زجر و ملامت ہے
مسلماں بھی خدا لگتی نہیں کہتے قیامت ہے

اِس ماحول میں انھیں اپنی "مثالی دنیا" کا نقشہ دکھائی دے تو کہاں؟ بس اسی تخیل میں سرگشتہ و سرگرداں رہے لیکن ہجوم آدم میں انھیں صورتِ آدم کے سوا کچھ نظر نہ آیا، سترِ آدمیت سے اس ہجوم کو کوئی واسطہ تھا نہ دلچسپی! ؎

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے، صورتِ آدم بہت ہے یاں

---

[1] صاحبِ "نقدِ میرؔ" نے (ص ۳۳ پر) بددماغی اور بے دماغی کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بے دماغی عبارت ہے انفعالی رنگ سے جبکہ بددماغی اس کی جارحانہ صورت ہے، لیکن فاضل مصنف نے کم دماغی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا حالانکہ یہ ترکیب بھی میرؔ کے ہاں بہت استعمال ہوئی ہے!

ذات پات کی مذمت

اس ضمن میں وہ ذات برادری کی بدعت کی مذمت ان الفاظ میں کرتے ہیں ؂

مرتا ہے کیوں تو ناحق یاری برادری پر
دنیا کے سارے ناتے ہیں جیتے جی تلک کے

حاجت روائی بہ توقعِ مطلب بر آری

ذات برادری سے بھی مکروہ تر اور ظالمانہ تصور ہر زمانے میں "انسان" (؟) کا یہ رہا ہے کہ "اسی کے کام آؤ جو تمہارے بھی کام آسکتا ہو۔" یہ سراسر غیر انسانی تصور آدمی کو سنگدل اور بے حس بنا دیتا ہے۔ اخوت و ہمدردی سے دُوری کا باعث اکثر و بیشتر یہی عملِ مذموم رہا ہے۔ الف نے ب کی مدد سے اس لیے گریز کیا کہ جواباً ب سے اسے کسی فائدے کی توقع نہ تھی! اس سفاکانہ رویّے نے "مسلّم اصول" کی شکل اختیار کرلی تو رشوت اور سفارش جیسی مکروہات نے جنم لیا۔ میرؔ نے اس نام نہاد "اصول" پر بھرپور طنز کیا ہے ؂

پروا اسے ہو کا ہے کو ناکام گر مروں
اس کامِ جاں کو مجھ سے تو کچھ کام بھی نہیں!

یہی وہ دشمنانِ انسانیت ہیں جن کے ہاتھوں "ناکام مرنے والوں" کی تعداد بعض اوقات ان گنت ہو جاتی ہے لیکن ان لوگوں کو ذرّہ بھر احساس نہیں ہو پاتا۔ ان پر طنز کی شدت بھی اسی تناسب سے زیادہ نظر آتی ہے ؂

کشتنِ مردماں اگر ہے ثواب
تو ہوا ہے اسے ثواب بہت

قتلِ انسانیت کے جس درد نے میرؔ کو افسردہ دملول رکھا اس کا مداوا تو فقط یہی تھا کہ افرادِ زمانہ آدمیت کی قدر پہچانیں اور حیاتِ چند روزہ کو ایک دوسرے کے لیے جہنم نہ بنائیں۔ لیکن نہ ایسا ہوا نہ میرؔ کے دل کا کنول کِھل سکا، اس پہ یہ کہنا کہ —— "میرؔ زندگی کی ناخوشگواریوں کو خوشگوار بنانے کے اہل نہ تھے[1]"

---

[1] یہ قولِ فیصل ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا ہے جو اُن کی گراں قدر کتاب نقدِ میرؔ کے صفحہ ۸۷ پر درج ہے۔ اس کتاب میں اعلیٰ اور معیاری تنقید کے باوجود بعض جگہ تکذیبِ بیان کی کیفیت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً (ص ۸۷ پر) کہتے ہیں — "اس قسم کا غم وسیع انسانی ہمدردی اور اعلیٰ انسانیت میں مبدّل ہو کر نسخۂ کیمیا بن جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر غم عالمگیر شفقت کا وسیلہ اور سرچشمہ بن جاتا ہے۔ غم کی اسی صورت کو میرؔ نے دردمندی سے تعبیر کیا ہے۔" لیکن صفحہ ۸۹ تک جاتے جاتے یہ نسخۂ کیمیا بے اثر ہو جاتا ہے، عالمگیر شفقت کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے اور دردمندی بھی محض ایک ڈھونگ بن کر رہ جاتی ہے جب ارشاد ہوتا ہے کہ —— "ان کا غم انفرادی تھا اجتماعی نہ تھا...... جہاں عام انسانیت کا ذکر کیا ہے وہاں بھی دراصل اپنے ہی غم کی کہانی بیان کی ہے ...... الخ" فاضل نقاد کے ان دو متضاد بیانات کا اطلاق ایک ہی میرؔ پر تو نہیں ہو سکتا۔ اسی تسلسل میں پہلے تو کہا کہ —— "دلّی سے زیادہ انہیں اپنے دل کی بستی کے اجڑنے کا غم ہے۔" لیکن اسی صفحے پر یہ بھی کہہ دیا کہ —— "لکھنؤ میں یہ غم افسردگی کا رُوپ اختیار کر لیتا ہے، اس زمانے میں دلّی کی یاد اور موت کا مضمون عام ہے...... الخ" غم میں افسردہ ہونا کوئی نیا انکشاف نہیں ہے لیکن وہ دلّی سے زیادہ دل کی بستی کا غم کیا ہوا؟ اور موت کا مضمون صرف

باقی صفحہ ۴۳ پر

کچھ عجیب سالگتا ہے، دوسرے الفاظ میں انسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ زمانہ ساز نہیں تھے یا ابن الوقتی کے "فن" سے ناآشنا تھے، جس کے لیے بے حسی (یعنی اعلیٰ اخلاقی اقدار سے بے اعتنائی اور پاکیزہ و باوقار احساسات سے محرومی اور مطلب برآری کے لیے ظاہر و باطن کی دو رنگی) ضروری ہے۔ ناخوشگواریوں کو خوشگوار بنانے کا یہ نسخہ تو میر جیسے حساس انسان دوست اور انسانیت پرور کو راس نہیں آسکتا تھا۔ اس کے اہل تو واقعی وہ نہیں ہو سکتے تھے۔

بقیہ صفحہ ۴۲

آخری دیوان ہی تک محدود نہیں وہ ہر دیوان میں برابر دکھائی دیتا ہے، پھر دل کی بستی اور دلی کی بستی میر کے ہاں الگ الگ بستیاں نہیں ہیں، دلی کی بستی بھی دل کی بستی ہی کا ایک حصہ تھی کیونکہ دل کو انہوں نے شہر، نگر، بستی وغیرہ کے علاوہ مملکت، ملک اور جہان سے بھی تعبیر کیا ہے جس میں سینکڑوں، ہزاروں بستیاں آباد ہیں، ازاں جملہ دلی بھی ہے جو انہیں خاص طور پر عزیز ہے لہذا اس کے اجڑنے کا غم بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اور پھر غم تو بہر صورت غم ہے دلی کا ہو یا دل کا، کیونکہ دونوں کا تعلق غمِ انسانیت سے ہے۔ اس کے علاوہ میر صرف دلی اور موت ہی کو یاد نہیں کرتے، انہیں تو زیست تلخ کا بیتا ہوا ہر لمحہ یاد آتا ہے۔ موت سے زیادہ وہ جوانی کو یاد کرتے ہیں، زندگی انہیں عزیز ہے تو زندگی کا زمانۂ شباب عزیز تر ہے۔ آخری دیوان میں حسرت سے کہتے ہیں ؎

شاد وے جو کہ جواں تازہ ہوئے ہیں شہر میں — دل زدہ ہم شیب میں رہتے ہیں اپنے غم کے بیچ

ایک خامی یہ بتائی گئی ہے کہ "میر کی مثالی دنیا ان کے ذہن و خیال ہی میں رہی" اس سے ان کے تصورِ دنیا کی نفی تو نہیں ہو جاتی، افلاطون کی خیالی جمہوریت بھی وجود پذیر تو کبھی نہ ہوئی لیکن اس کے ذکر سے کون سا زمانہ خالی رہا ہے؟ اور پھر میر کی مثالی دنیا کم سے کم ان کے قول و فعل میں تو دکھائی دیتی رہی، دنیا اسے اپنانے سے انکار کردے تو میر کا کیا قصور؟ یہی تو ان کا اصلی غم ہے! اسید صاحب کا یہ بیان بھی محلِ نظر ہے کہ "میر اپنے غم میں حکیمانہ شان نہ پیدا کر سکے"۔ "حکیمانہ شان" کی کوئی قابلِ فہم وضاحت پیش نہیں کی گئی صرف "اظہارِ تاسفِ عالمانہ" ہی کو کافی تصور کیا گیا ہے جسے دلیل قرار نہیں دیا جاسکتا یہاں خوفِ طوالت مانع ہے ورنہ یہ موضوع تفصیلی بحث کا متقضی ہے۔ جو شخص کامرانیوں سے کم اور ناکامیوں سے زیادہ "کام لینے" کا نہ صرف سلیقہ رکھتا ہو بلکہ اسے نبھانا بھی جانتا ہو وہ حکیمانہ شان سے عاری کیونکر ہو سکتا ہے؟ جو شخص غم کے زخموں ہی سے مرہم کا کام لینے پر قادر ہو وہ طبیب ہی نہیں حکیم بھی ہے۔ اس سے بڑی حکیمانہ شان اور کیا ہوگی کہ انھوں نے فکر کو احساس میں اور احساس کو فکر میں ڈھال کر ایک وحدت میں بدل دیا۔ ذہن حکیمانہ ہو تو غم بھی حکیمانہ ہوگا، ذہنِ حکیمانہ کی یہ مثال ملاحظہ ہو ؎

محو کر آپ کو یوں ہستی میں اس کی جیسے — بوند پانی کی نہیں آتی نظر پانی میں

نظریۂ "وحدت الشہود" کے اثبات میں ستاروں اور آفتاب کی جو دلیل پیش کی جاتی ہے کیا میر کی پیش کردہ مثال زیادہ بدیہی اور حکیمانہ نہیں؟ اور پھر کیا مادے کی تبدیلیٔ ہیئت کا ذکر میر حکیمانہ شان سے نہیں کرتے؟

کوشش کرتے بھی تو ناکام رہتے جیسا کہ درج ذیل شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید "زمانہ سازی" کا تجربہ کر کے بھی دیکھا تھا جسے وقارِ انسانیت کے منافی پا کر انہیں اور بھی زیادہ رنجیدہ ہونا پڑا اور نادم بھی ؎

آخر زمانہ سازی سے کھویا نہ وقر میرؔ — یہ اختیار تم نے کیا روزگار کیا

وقر و وضعداری اور عزتِ نفس ہی جس کی متاعِ زیست ہو وہ ناخوشگواریوں کو خوشگوار بنانے کی خفت انگیز کوشش کیسے کر سکتا ہے! انسان کے ہاتھوں انسانیت کی بے دریغ تذلیل کو دیکھ کر میرؔ کو اس درجہ وحشت ہوئی کہ وہ قیامت سے بھی خائف نظر آتے ہیں کیونکہ وہاں پھر یہی شکلیں دکھائی دیں گی۔ یہاں کی عارضی زندگی تو جوں توں ان لوگوں کے درمیان گزر گئی لیکن وہ ہمیشہ کی زندگی ان کی صحبت میں کیونکر کٹے گی؟! زندگی کا جو تجربہ دنیا میں حاصل ہوا اس کے بعد دوبارہ جینے کے تصور ہی سے دل گھبراتے ہیں ؎

خوفِ قیامت ہی ہے کہ میرؔ — ہم کو جیا بار دگر چاہیئے

بالائے غم ہائے دگر، اس غم کا نیا اضافہ انہیں پریشان کر دیتا ہے جو مرگِ جان سے بھی خوفناک تر ہے ؎

جی تو جانے کا ہمیں اندازہ ہی ہے لیک میرؔ — حشر کو اٹھنا پڑے گا پھر یہ اک غم اور ہے!

یہ دلیل مردم بیزاری کی نہیں بلکہ میرؔ کے مردم گزیدہ ہونے کی ہے۔ افعی گزیدہ تو پانی کبھی مانگ بھی لیتا ہوگا، لیکن آدمی کا ڈسا ہوا کبھی مشکل ہی سے سنبھل پایا ہے کیونکہ نتیجہ موت نہ ہو تو بھی بدتر از موت زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ حق گوئی کو مردم بیزاری سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ میرؔ کو نفرت گناہ سے ہے گنہگاروں سے نہیں؛ وہ خاتمہ بدی کا چاہتے ہیں نہ کہ بدوں کا، ان سے تو وہ فریاد ہی کرتے ہیں یا شکایت؛ کیونکہ کردار کشی کی بجائے کردار سازی ان کا اصل مقصود ہے۔ میرؔ بس اسی جرم کی پاداش میں عمر بھر مبتلائے آزار رہے لیکن انھوں نے وہی کہا جو دیکھا، وہی سنائی جو بیتی تھی وہی بیان کیا جو محسوس کیا، صداقتِ بیان کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ اپنی امرد پرستی کا تذکرہ بھی صاف صاف کر دیتے ہیں جو ایک اخلاقی کمزوری تھی لیکن اخلاقی جرأت نے اس کی پردہ پوشی بھی ضروری نہیں سمجھی، تو جو شخص اپنے عیب نہیں چھپاتا وہ دوسروں کے عیوب کو سراہ کر زندگی کی ناخوشگواریوں کو خوشگوار بنانے کی کوشش کس طرح کر سکتا ہے؟!

میرؔ آج ہمارے معاشرے میں ہوتے تو بھی وہی کچھ کہتے جو دو سو برس پہلے کہا تھا، شاید اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ! کیونکہ ہمارے اور ان کے زمانے میں فرق فقط یہ ہے کہ آج لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے اور اسی تناسب سے انسانی اقدار کی پامالی بھی ظہور میں آئی ہے اور حصولِ عظمت و شہرت کیلئے جن نئے تصورات نے جنم لیا ہے ان میں نمایاں ترین یہ ہے کہ آدمیت سے جس قدر دور ہوگے اسی قدر عظمت سے قریب تر ہوتے جاؤ گے! ع نہیں جس میں آدمیت وہ عظیم آدمی ہے! مہابھارت کے اس دور میں بھی مختلف مذاہب کے پیروکاروں کی تعداد تو الگ الگ بتا دی جاتی ہے لیکن یہ کوئی نہیں بتا پاتا کہ انسان کی اس دنیا میں انسانوں کی تعداد کیا ہے؟ لہٰذا میرؔ کا غم انہیں آج بھی ویسے ہی مبتلائے عذاب رکھتا ناخوشگواریوں کو خوشگوار بنانے کی "صلاحیت" وہ آج بھی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے تھے! حقیقی خوشگواریوں کی تمنا میرؔ سے زیادہ کس کو تھی اور کس کو ہو سکتی تھی، انہی کی نایابی کا ماتم تو وہ عمر بھر کرتے رہے، لیکن مکر و فریب کے جمِ غفیر سے بر بنائے شیریں کی توقع انہیں نہ جب تھی نہ اب ہو سکتی تھی! ان کی مایوسی کو بے خبری سے تو تعبیر نہیں کیا جا سکتا، جلنے والے پہچانتے تو وہ سب کچھ تھے بلکہ یہی پہچان یہی شناخت ان کے غم میں شدت کا باعث بن جاتی تھی ؎

نہ سمجھو مجھے بے خبر اس قدر — نہ دل سے ہے لوگوں کے آگاہ ہوں

سخن گری اور آدمی گری

؎ خدا ساز تھا آذرِ بت تراش — ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

میر کو شہِ شاعراں، امیرِ سخنوراں، خدائے سخن وغیرہ متعدد القابات سے یاد کیا جاتا ہے، یہ سب اپنی جگہ بجا لیکن ہم ان میں "میر سخن گر" کا اضافہ خود انہی کے حوالے سے کرنا چاہتے ہیں ؎

مصرع کبھو کبھو کوئی موزوں کروں ہوں میں — کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

اور اس میں شک نہیں کہ "ع "نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر" پھر میر تو جو نقش ابھارنا چاہتے ہیں وہ ہے بھی انسانیت کا، جس کے لیے جگر ہی کیا، تن بدن کا خون نچوڑ کر ہی کوئی شکل نکل سکتی ہے۔ یہاں نقش یا شکل سے مراد نقش و دیوار یا پتھر دھات وغیرہ کا مجسمہ نہیں بلکہ جیتا جاگتا انسان ہے، جو آدمی کی صورت میں پہلے موجود ہے اور میر اسے زیورِ آدمیت سے آراستہ کر کے انسان بنانا چاہتے ہیں کہ بدقسمتی سے یہاں ع "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا" پس اس فن کار کے پاس خام مال تو موجود ہے جو بجائے خود اس کے نزدیک قابلِ احترام ہے ؎

خاکِ آدم ہی ہے تمام زمیں — پاؤں کو ہم سنبھال رکھتے ہیں

ہر چند کہ یہ احترام اصل میں اس "صانع" برتر کا ہے جس نے خاک سے تخلیق کر کے ان صورتوں کو بطور آدم آدم اشرف المخلوقات، یہاں بھیجا تھا — لیکن اس تخلیق اشرف نے صرف صورتِ آدم ہی کو برقرار رکھنا کافی سمجھا اور اصلِ آدمیت کو یکسر فراموش کر دیا بلکہ اس فراموش کاری ہی پر فخر کرنے لگا — اپنے آپ کو اس قدر نیچے گرا لیا کہ دام و دد کے درجے تک نیچے آیا اور ہر زمانے میں جو چند اہلِ نظر اس گراوٹ سے محفوظ رہے ان کے لیے دردِ سر بنتا گیا، وہ چیخ چیخ کر اسے راہِ انسانیت کی طرف بلاتے رہے لیکن یہ اس راہ سے دور ہوتا گیا — بس برائے نام سی کامیابی ان صاحب نظروں کو حاصل ہوتی رہی — مگر انھوں نے بہرکیف "آدمی گری" کا عمل جاری رکھا ورنہ آج زمین پر خاکِ آدم کے سوا کچھ بھی باقی نہ ہوتا — ایسے ہی "آدمی گر" میر تقی میر بھی تھے جنھوں نے سخن گری کے ذریعے آدمی گری کی کوشش میں عمرِ عزیز صرف کر دی۔ اس سے مراد جسمانی خط و خال کی ترتیب نو نہیں بلکہ روحانی بیداری و بالیدگی ہے جس کی بنیاد تصحیحِ اخلاق اور اصلاحِ کردار پر ہے۔ یہی "جادۂ انسانیت" ہے، میر اس کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی ان کی "آدمی گری" ہے۔ اس آدمی گری کے کچھ اجزائے ترکیبی یہ ہیں :—

مقامِ زبان

زبان محض آلۂ گفتار نہیں، بہت بڑا وسیلۂ اصلاحِ کردار بھی ہے۔ دنیا کی آدمی سے زیادہ جھگڑے، فساد، فتنے، ہنگامے، آشوب وہ ہیں جو زبان کے غلط استعمال سے جنم لیتے ہیں۔ اس کے صحیح

مقام اور محلِ استعمال کو سمجھ لیا جائے تو آدمی کے لیے انسان بننا بہت آسان ہو سکتا ہے۔ میرؔ کے ہاں سینکڑوں مثالیں ہیں جن میں سے چند ایک ہی پیش کی جا سکتی ہیں ؎

ہونٹ اپنا ہلا نہ سمجھے بن
یعنی جب کھولے تو زباں ٹک سوچ

یعنی سوچ سمجھ کر وہی کہو جو کسی کی دلآزاری کا باعث نہ ہو، جو حق ہو جس پر تم قائم رہ سکو ورنہ خوف، طیش یا لالچ کے تحت تو لوگ زبان کا پاس بھی نہیں کرتے اور زبان کا یہ بگاڑ زمانے کے اجتماعی کردار کے بگڑنے کی دلیل ہے ؎

زبانیں بدلتے رہیں ہر آن خوباں
یہ سب کچھ ہیں بگڑے زمانے کی باتیں

یہاں لفظ خوباں محض روایتی انداز میں کہا گیا ہے ورنہ اصل میں عام ابنائے زمانہ پر چوٹ کی گئی ہے!

فضیلتِ خاموشی

بلا وجہ زبان کھولنے سے خاموشی اختیار کرنا بہتر ہے کیونکہ بعض اوقات زبان کھولنا ہی باعثِ مصیبت بن جاتا ہے۔ میرؔ طائرِ خوش نوا کی گرفتاری کا سبب اسی زبان کشائی کو قرار دیتے ہیں اور بالواسطہ انسان کو خاموشی کی قدر و قیمت سمجھانا چاہتے ہیں ؎

کاش اے میرؔ زباں بند رکھا کرتے ہم
صبح کے بولنے نے ہم کو گرفتار کیا

زبان درازی سے احتراز

اگر خاموشی پر قدرت حاصل نہ ہو تو کم سے کم اتنی احتیاط تو ملحوظ رکھنا ہی چاہیے کہ بات حد سے نہ بڑھنے دی جائے ؎

خاموش رہ سکے نہ تو بڑھ کر بھی کچھ نہ کہہ
سرِ شمع کٹ گئے ہے زبانِ دراز سے

زبان و دل کی ہم آہنگی

زبان سے کچھ کہنا اور دل میں کچھ اور ہی سوچنا منافقت کہلاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی تو آہ و زاری بھی بے اثر ہوتی ہے ؎

۱۔۔۔ یاروں کی آہ و زاری ہووے قبول کیونکر
ان کی زباں پہ کچھ ہے دل میں ہے کچھ دعا کچھ

۲۔۔۔ ایک ہووے جو زبان و دل تو کچھ نکلے بھی کام
لیس اثر اے میرؔ کیا ہو گریہ و زاری کے بیچ

۳۔۔۔ نہ ان لوگوں کی بات سمجھی گئی
یہ خلق اور ان کی زباں اور ہے

آلودۂ دشنام زباں کی دلخراشیاں ؎

ہر بات کے جواب میں گالی کہاں تلک
اب جاں بلب ہوئے ہیں تمہاری زباں سے ہم

حق گوئی و بے باکی

موقع و محل کے لحاظ سے جہاں خاموشی و سکوت کو فضیلت حاصل ہے وہاں حق گوئی سے زبان کو روکنا بدی کے مترادف بھی ہے۔ حق و صداقت کے اعلان کے لیے وہ زبان کے بے باکانہ استعمال کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ باطل کے خلاف زبان کھولنا بجائے خود نیکی ہے۔ سچائی کا اظہار کھلے بندوں ہی لطف دیتا ہے ؎

۱۔۔۔ کہنا جس سے جو کچھ ہو گا سامنے میرؔ کہا ہو گا
بات نہ دل میں پھر گئی ہو گی منہ پہ میرے آئی ہوئی

۲۔۔۔ ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
پر ہم سے تو تھمی نہ کبھو منہ پہ آئی بات

مقامِ چشم ونظر

زبان کی طرح آنکھ اور نگاہ کا بھی تعمیرِ اخلاق میں بڑا عمل دخل ہے۔ مروّت کا سرچشمہ چشم ونظر ہی ہیں کیونکہ ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرنا انہی کا کام ہے۔ یہ آنکھیں ہی تو ہیں جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں (یعنی کسی کے ذہن میں) مروّت ہے یا نہیں! مروّت کا فقدان انسان کو انسانیت کے درجے سے گرا دیتا ہے۔ میرؔ نے اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ بے مروّتی کے شکار ہر ذی روح کے لیے بار بار آنسو بہائے ہیں ؎

۱ سن اے بیدرد گلچیں غارتِ گلشن مبارک ہے — پہ ٹک گوشِ مروّت جانبِ فریادِ بلبل کر

۲ دل ٹوٹتے پہ مرغِ چمن کے نہ کی نظر — بے درد گلفروش سبد بھر کے لائے ہیں

صاحبِ مروّت کو دکھ اور تکلیف برداشت کرنے سے بھی گریز نہیں ہوتا ؎

بھری آنکھیں لوہو سے بہنے لگیں — یہ رنگ اپنا دیکھا مروّت سے ہم

مروّت شیوۂ اہلِ دُنیا نہیں

؎ مروّت چشم رکھنا سادگی ہے
نہیں شیوہ یہ اپنے آشنا کا

آنکھیں پھیر لینا بے مروّتوں کا وطیرہ ہے

؎ وہ آنکھیں پھیرے ہی لیتا ہے دیکھتے کیا ہو
معاملت ہے ہمیں دل کی بے مروّت سے

بے مروّت بے دید

؎ بلانا آنکھ کا ہر دم، فریب تھا اُس کا
پھر ایک دم میں وہ بے دید آشنا نہ رہا

بے دید بے درد

بے دید پرلے درجے کے بے درد بھی ہوتے ہیں۔ جن آنکھوں سے کبھی آنسو گرے ہی نہ ہوں وہ دوسروں کی گریہ وزاری سے کیا اثر قبول کر سکتی ہیں۔ ایسے بے دردوں کے سامنے کوئی روئے، تڑپے، چیخے، چلائے لیکن ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی ؎

عاشق کے اس کو گریۂ خونیں کا درد کیا — آنسو نہیں ہے آنکھ سے جس کی گرا ہنوز

بے مروّتی بالآخر بیوفائی کا رُوپ دھار لیتی ہے

بے مروّت لوگ بالآخر اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بھی آنکھیں پھیر لینے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے صرف چند مثالیں پیش ہیں ؎

تیکھے بھی تم نے ٹھہرتے دیکھے کہیں تنک — چشمِ وفا رکھو نہ خسانِ جہاں سے تم

جس سے تھی ہم کو چشم کیا کیا میرؔ — اس طرف ان نے اک نگاہ نہ کی

جس آنکھ سے دیا تھا ان نے فریب دل کو — اس آنکھ کو جو دیکھو اب آشنا نہیں ہے

اہلِ وفا کی دشواریاں

؎ عشق کرنا نہیں آسان بہت مشکل ہے
چھاتی پتھر کی ہے ان کی جو وفا کرتے ہیں

یارب ہماری جانب یہ سنگ کیوں ہے عائد — جی ہی سے مارتے ہیں جو نام لے وفا کا

ہاتھوں ہی سے بھری رہی چھاتی تمام عمر — یہ پھول گل چُنا کیے باغِ وفا سے ہم

اچھی ہی ہے جنسِ وفا یاں لیک نہ ہم نے پائی کہیں
داغ ہوئی ہے جان ہماری اس شئے کی نایابی سے

بیوفائی سے بے رحمی جنم لیتی ہے

اس بے رحمی کے لاتعداد رُوپ ہیں جن میں سے بطورِ نمونہ چند ایک یہ ہیں ــــ

خوار پھرایا گلیوں گلیوں سر مارے دیواروں سے
کیا کیا اُن نے سلوک کیے ہیں شہر کے عزت داروں سے

شرم کرنی تھی مرا سر کاٹ کر
سو تو ان نے اور ٹیڑھی کی کلاہ

کاٹ کے سر عاجز کا ان نے اور بھی پگڑی پھیر رکھی
فخر کی کون سی جاگہ تھی یاں ایسا کیا رستم مارا

ہے تند و تیز اس کی نگاہ اس طرف ہنوز
مارا ہے بے گناہ و گناہ اس طرف ہنوز

دیں گالیاں انہی نے وہی بے دماغ ہیں
ہم میر کچھ کہا نہیں اپنی زبان سے

اپنے تو ہونٹ بھی نہ ہلے اُس کے رُوبرو
رنجش کی وجہ میرؔ وہ کیا بات ہو گئی

ظالمانہ احسان

ــــ پہلے گلے لگایا پھر دستِ جور اٹھایا
مارا تو ان نے لیکن احسان کر کے مارا

ظالمانہ تمسخر

ــــ یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رُخِ زرد پر مرے
کہتا ہے میرؔ رنگ تو اب کچھ نکھر چلا

خودغرض گراں گوش

ــــ پھر امت میرؔ سر اپنا گراں گوشوں کی مجلس میں
نہ سمجھے کوئی تو کچھ کہئے بھی، اس کہنے سے کیا حاصل

موازنۂ مکار و مخلص

ــــ سادے جتنے نظر آتے ہیں دیکھو تو عیار ہیں سب
زرد و زار و زبوں جو ہم ہیں چاہت کے بیمار ہیں سب

چاہ کا دعوٰی سب کرتے ہیں مانیے کیونکر بے آثار
اشک کی سُرخی زردی منہ کی عشق کی کچھ تو علامت ہو

دنیاداری اور زمانہ سازی کے بدنُما رُوپ جابر اور نااہل کی طرفداری

ــــ آنکھیں تمام خلق کی رہتی ہیں اس کی اور
مطلق کسو کی حال پہ میرے نظر نہیں!

ــــ سر اپنا عشق میں ہم نے بھی یُوں تو پھوڑا تھا
پر اس کا کیا کریں اوروں کا اعتبار ہے آج

توقیرِ محنت و سخت کوشی

ــــ عشق میں کیا دخل ہے نازک مزاجی کے تئیں
کوہکن کے طور سے جی توڑ کر محنت کرو

عشق میں گامِ اوّل اپنے جی سے گزرنا پیش آیا
اس میداں میں رکھ کے قدم کیا مرنے سے ڈر جاویں ہم

جو راہِ دوستی میں اے میرؔ مر گئے ہیں
سر دیں گے لوگ ان کے پائے نشاں کے اُوپر

ہے عاشقی کے بیچ ستم دیکھنا ہی لطف
مر جانا آنکھ موند کے یہ کچھ ہنر نہیں

تسلیمِ محبّت ؎

زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیمِ محبت میں اُٹھایا نہ گیا

پاسِ ادب ؎

تربت سے ہماری نہ اُٹھی گرد بھی اے میرؔ
جی سے گئے پر نہ کیا ترکِ ادب ہم

احترامِ جذباتِ دوستاں ؎

دم بخود رہتا ہوں اکثر سر رکھے زانو پہ میرؔ
حال کہہ کر کیا کروں آزردہ اور احباب کو

حقیقی کیمیاگری ؎

نزدیک سوزِ سینہ کے رکھ اپنے قلب کو
وہ دل ہی کیمیا ہے جو گرم گداز ہو

ہوسِ طلب اخلاقی برائیوں کی جڑ ہے

میرؔ کے نزدیک اخلاقی اقدار کی پامالی ہوس ہی سے ظہور میں آتی ہے۔ ٹوٹے ہوئے پاؤں ان تندرست و توانا پاؤں سے اچھے جو راہِ ہوس کی طرف لے جاتے ہیں ؎

رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی — شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا
رکھا ہے باز ہمیں در بدر کے پھرنے سے — سروں پہ اپنے ہے احسان شکستہ پائی کا

غاصبانہ ذہنیت ؎

دلبراں نقدِ دل کو عاشق کے
جان کر اپنا مال لیتے ہیں

جھوٹی شفقت بلائے جان ؎

احوال بہت تنگ ہے اے کاش محبت
اب دستِ تلطف کو مرے سر سے اُٹھا لے

اب جو نصیب میں ہے سو دیکھ لیں گائیں بھی — تم دستِ لطف اپنا سر سے مرے اُٹھالو

اکڑ بازوں کی بے تہی ؎

تھوڑے سے پانی میں بھی چل نکلے ہے اُبھرتا
بے تہہ ہے سر نہ کھینچے اِک دم حباب کیونکر

آگے زمین تہہ میں ہم نے بہت نہ تھے تو بھی — سر پر زمیں اُٹھالی ہم بے تہوں نے آگر

اہلِ درد کو ہنسی کہاں

دردِ انسانیت سے معمور دلوں کو ہنسی کہاں نصیب ہوتی ہے۔ چاہتے تو وہ بھی ہیں مگر ؎

ساون ہرے نہ بھادوں ہم سوکھے اہلِ درد — سبزہ ہماری پلکوں کا سیراب تھا سو تھا
گلگشت کا بھی لطفِ دلِ خوش سے ہے ندیم — پیشِ نظر وگرنہ چمن زار کیوں نہ ہو

ہنستا ہی میں پھروں جو مرا کچھ ہو اختیار
پر کیا کروں میں دیدۂ بے اختیار کو

کم ظرفوں سے رازداری کی توقع عبث ہے

؎ کہتی پھرے ہے رسوا سارے چمن میں مجھ کو
گر کوئی بات دل کی بلبل سے میں کہی ہے

پس اندازِ اشک

؎ ابھی اک عمر رونا ہے نہ کھو دو اشک آنکھو تم
کرو کچھ سوجھتا اپنا تو بہتر ہے کہ دنیا ہے

دُنیا انسان کیلئے ہے نہ کہ انسان دُنیا کیلئے

؎ کچھ نہ دیکھا تھا ہم نے پر تو بھی
آنکھ میں آئی نہ یہ دُنیا کچھ

ایسی متاعِ قلیل کے اوپر چشم نہ کھولیں اہلِ نظر
آنکھ میں جو کچھ ہو وے سو ظاہر دنیا اتنی مال نہیں

تصوّرِ معیشت

لفظ "معیشت" میرؔ کے ہاں بہت استعمال ہوا ہے۔ میرؔ نے اسے بیشتر معاش کی بجائے معاشرت کے معنی میں اور اسم کی بجائے فعل کے طور پر باندھا ہے مثلاً ؎

ایسی معیشت کر لوگوں سے جیسے غم کش میرؔ نے کی
برسوں ہوئے ہیں اُٹھ گئے ان کو روتے ہیں ہمسائے ہنوز

اس اندازِ معیشت کو اپنا لیا جائے تو ساری عداوتیں، کدورتیں، نفرتیں از خود ختم ہو جائیں لیکن اس کے لیے جو تحمل، مشقت اور بردباری درکار ہے اس سے لوگ بھاگتے ہیں۔ مروّت و اخوت کے جس جذبے کی اس معیشت میں ضرورت ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرؔ نے خود کو "غم کش" قرار دیا ہے! کسی کو آزار نہ پہنچانا، نقصان نہ کرنا، ضرر رسانی سے مکمل گریز...... وغیرہ، کا مظاہرہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسان جملہ ہیجانات پر قابو رکھے اور یہی "غم کشی" کی انتہائی صبر آزما صورت ہے۔ اپنی خواہش ہر کسی کو عزیز ہوتی ہے۔ لیکن مسلک دردمندی سے عہدہ برا ہونے کے لیے اپنی خواہشوں کو خیر باد بھی کہنا پڑتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس سے دردمندوں کو تکلیف نہیں ہوتی —— وہ تو بہر حال ہوتی ہے لیکن ان کا میران کی تکلیف پر غالب آجاتا ہے ؎

اب حسرت آنکھوں میں اس کی نومیدانہ پھرتا تھا
میرؔ نے شاید خواہش دل کی آج کوئی پھر رخصت کی

اس میں تکلیف ضرور ہے مگر روحانی سکون اس کے سوا ممکن بھی نہیں ایسے ہمسائے کو لوگ کیوں نہ برسوں روتے رہیں گے۔!!

میرِ مصوّر

اعضائے بدن کے بیان میں میرؔ کی لفظی تصاویر کا لمس کی راہ سے آنکھوں میں آتی ہیں اور چشم تصوّر کو گویا رنگین مصوّرانہ شاہکاروں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ اس مصوّر کیفیات کے مشاہدے میں گہرائی ہے اور فنِ مصوری میں اسے خاصا درک معلوم ہوتا ہے۔ معمولی سی کیفیت کو لائق توجہ اور جاذبِ نظر تصویر میں ڈھال دیتا ہے۔ رنگوں کے تضاد و توافق، امتزاج و موزونیت، ہم رنگی و ہم آہنگی اور نزاکت و نفاست کا گہرا شعور اسے حاصل ہے چنانچہ مختلف اعضا کی مختلف کیفیات کے بیان میں یہ مصوّرانہ انداز نمایاں رہتا ہے مثلاً ؎

ہجر میں کیا کیا سے دیکھے ہیں ان آنکھوں سے میں
زرد رخ پہ لالہ گوں آنسو بہا کرتا تھا رات

زرد پس منظر میں سرخ پیش منظر جو بہار دکھاتا ہے اس کا اندازہ ایک عام آدمی بھی لگا سکتا ہے یا مثلاً ؎

برنگِ کہربائی شمع اس کا رنگ جھمکے ہے　　　دماغِ سیر اس کو کب ہے میرے رنگِ کاہی کا

"چشمِ تر" کے سلسلے میں "نقش بر آب" کا مضمون کئی جگہ باندھا ہے مثلاً ؎

نقش نہیں پانی میں ابھرتا یہ تو کوئی اچنبھا ہے　　　صورتِ خوب اس کی ہے پھرتی اکثر چشمِ تر میں اب

دل گداز، دلِ گداختہ کی تراکیب تو عام ہیں لیکن میرؔ نے "دیدۂ گداختہ" کی ترکیب مصوّرانہ انداز میں استعمال کی ہے ؎

برسوں تری گلی میں چمن ساز جو رہا　　　سو دیدہ اب گداختہ ہو کر شفق ہوا

"دیدۂ گداختہ" کی جدتِ لطیف اپنی جگہ لیکن اس کا "شفق ہو جانا" پھر مصوّرانہ مشاہدے کا غمّاز ہے۔ مصوّرانہ باریک بینی کے علاوہ میرؔ چشمِ عبرت بیں بھی رکھتے ہیں۔ ان کے بے ساختہ استفسار بڑے معنی خیز ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ بظاہر کچھ پوچھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن اصل میں کچھ بتا رہے ہوتے ہیں ؎

تعجب ہے مجھے یہ سرو کو آزاد کہتے ہیں　　　سراپا دل کی صورت جس کی ہو وہ کیا ہو وارستہ

یعنی دل تو دل، دل کا ہم شکل ہونا بھی گرفتارِ بلا ہونے کی دلیل ہے !

مقامِ دِل

میرؔ کے ہاں مختلف اعضائے بدن میں سے کسی کا ذکر بیسیوں اور کسی کا سینکڑوں بار آیا ہے لیکن دل کا ذکر ہزاروں مرتبہ ہوا ہے۔ دو ہزار تین سو چوّن (۲۳۵۴) اشعار ایسے ہیں جن میں دل کی کوئی نہ کوئی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ انسان اور انسانیت میرؔ کا اصل موضوعِ سخن ہے اور انسان کے قالب میں دل کو مرکزی و محوری حیثیت حاصل ہے، اور عشق جو میرؔ کا اوڑھنا بچھونا ہے اس کے جملہ واردات کا تعلق دل ہی سے ہے، باقی اعضاء تو دل کی وجہ سے گرفتارِ بلا ہو جاتے ہیں، اور ان کی گرفتاری چھپائے نہیں چھپتی ؎

عشق آنکھوں کے نیچے کیے کیا میرؔ چھپے ہے　　　پیدا ہے محبت تری مژگاں کی تری سے

اسی لیے کہتے ہیں ؎

دل یہی ہے جس کو دل کہتے ہیں اس عالم کے بیچ　　　کاش یہ آفت نہ ہوتی قالبِ آدم کے بیچ

اور نزولِ آفت کا باعث عشق ہے ؎

عشق کو بیچ میں یارب تو نہ لایا ہوتا　　　یا تنِ آدمی میں دل نہ بنایا ہوتا

میرؔ کے نزدیک دل ہی اصلی اور حقیقی جائے باش ہے۔ اسی کی آبادی یا بربادی انسان اور انسانیت کی آبادی یا بربادی ہے۔ شہر اور عمارتیں، مکان اور بستیاں دل ہی کے اندر بستی یا اجڑتی ہیں، چنانچہ ایسے بیسیوں الفاظ جن سے آبادی کا مفہوم پیدا ہوتا ہے انھوں نے دل کے لیے استعمال کیے ہیں۔ وہ دل کو کہیں مکان، کہیں بستی، کہیں شہر، کہیں نگر حتیٰ کہ کہیں ملک یا مملکت سے تعبیر کرتے ہیں اور اکثر ان کی تباہی و بربادی پہ نوحہ کناں

نظر آتے ہیں۔ ایسے تمام اشعار اگرچہ "بدن نامہ" میں بعنوان دل اپنے اپنے مقام پر درج ہیں لیکن ظاہر ہے کہ دیگر اشعار میں گھل مل گئے ہیں جب کہ اپنی امتیازی خصوصیت کی بنا پر علیحدہ اندراج کے متقضی ہیں۔ عنوانِ مذکور کے تحت دیگر اشعار بھی دل ہی سے متعلق ہیں جس کے ذکر کو وہ اپنی "انفرادیت" کا نشان قرار دیتے ہیں ؎

دفتر لکھے ہیں میرؔ نے دل کے الم میں یہ ۔۔۔ یاں اپنے طور و طرز میں وہ فرد ہو گیا

اور اسی لیے ان کا مشورہ اور صلائے عام یہ ہے ؎

ٹک دل کے نسخے ہی کو کیا کر مطالعہ ۔۔۔ اس درس گہہ میں حرف ہمارا ہے اک کتاب

لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کرتے ہیں ؎

قلب یعنی کہ دل عجب زر ہے ۔۔۔ اس کی نقادی کو نظر ہے شرط

گویا محض مشاہدہ کوئی چیز نہیں، مشاہدہ اور تجربہ کا عمل بیک وقت لازم ہے چنانچہ دل کو "آبادی" کا مفہوم جہاں بھی پہنایا ہے وہاں شرطِ نقادی اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ ذیل میں ایسے جملہ اشعار یکجا کیے جاتے ہیں جن میں دل کے لیے مکان، آبادی، نگر، شہر، ملک وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں :-

دل کا اعزازِ خاص

دیوانِ اوّل

آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدّت ۔۔۔ اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب پایا

شہرِ دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں ۔۔۔ آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا

دل سے مت جا کہ حیف اس کا وقت ۔۔۔ جو کوئی اس مکان سے نکلا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ ۔۔۔ جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے ۔۔۔ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

شب کو اس کا خیال تھا دل میں ۔۔۔ گھر میں مہماں عزیز تھا کوئی

دل کے تئیں آتش ہجراں سے بچایا نہ گیا ۔۔۔ گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا

دل میں رہ دل میں کہ معمارِ قضا سے اب تک ۔۔۔ ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا

شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اس کے گئے ۔۔۔ ایسا اجڑا کہ کسو طرح بسایا نہ گیا

منزل اس ماہ کی رہا جو مدتوں اے ہمنشیں ۔۔۔ اب وہ دل گویا کہ اک مدت کا ماتم خانہ تھا

ہیں اس خراب دل سے مشہورِ شہرِ خوباں ۔۔۔ اس ساری بستی میں گھر ویران ہے ہمارا

بنجر زمین دل کی ہے میرؔ ملک اپنی ۔۔۔ پہ داغ سینہ مہری فرمان ہے ہمارا

خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا ۔۔۔ کہ آبادی تھی یاں یا کہ ویرانہ ہے مدت کا

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے ۔۔۔ پچھتاؤ گے سنو ہو، یہ بستی اُجاڑ کے

کیا قصرِ دل کی تم سے ویرانی نقل کریئے ۔۔۔ ہو ہو گئے ہیں ٹیلے سارے مکان ڈھے کر

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ ۔۔۔ دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

جاؤ نہ دل سے منظرِ تن میں یہی ہے جا ۔۔۔ پچھتاؤ گے اٹھو گے اگر اس مکاں سے تم

یہ دل وہ جا ہے جس میں دیکھا تھا تجھ کو بستے ۔۔۔ کن آنکھوں سے اب اجڑا اس گھر کو آہ دیکھوں

دل نذر و دیدہ پیشکش اے باعثِ حیات ۔۔۔ سچ کہہ کہ جی لگے ہے ترا کس مکان میں

ہے فرش عرش تک بھی قلبِ حزیں کا اپنے ۔۔۔ اس تنگ گھر میں ہم نے دیکھی ہیں کیا فضائیں

تن کے معمورہ میں یہی دل و چشم ۔۔۔ گھر تھے دو، سو خراب ہیں دونوں

منظر میں بدن کے بھی یہ اک طرز مکاں تھا ۔۔۔ افسوس کہ ٹک دل میں ہمارے نہ رہا تو

بے سوز داغِ دل گر بھی جلے بجا ہے ۔۔۔ اچھا لگے ہے اپنا گھر بے چراغ کس کو

چشم تو ہے اک دید کی جا پر کب تکلیف کے لائق ہے ۔۔۔ دل جو ہے دلچسپ مکاں تم اس میں کب کب آتے ہو

اشتعالک کی محبت نے کہ دربست پھونکا ۔۔۔ شہرِ دل کیا کہوں، کس طور جلا، مت پوچھو

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا ۔۔۔ ہے ختم اس آبلے پر سارا سفر ہمارا

طاقتِ دل برنگِ نکہتِ گل ۔۔۔ پھیر اپنے مکان پر آئی

خرابی کچھ نہ پوچھو ملکتِ دل کی عمارت کی ۔۔۔ غموں نے آج کل سنیو وہ آبادی سی غارت کی

خانۂ دل سے زینہار نہ جا ۔۔۔ کوئی ایسے مکاں سے اٹھتا ہے

دل کے معمورے کی مت کر فکر فرصت چاہیے ۔۔۔ ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہیے

بے یار شہرِ دل کا ویران ہو رہا ہے ۔۔۔ دکھلائی دے جہاں تک میداں ہو رہا ہے

دل عجب جائے ہے ولیکن مفت ۔۔۔ ہاتھ سے یہ مکان جاتا ہے

ڈھایا جنھوں نے اس کو ان پر خرابی آئی ۔۔۔ جانا گیا اسی سے دل بھی کسو کا گھر ہے

ہمارے دل میں آنے سے تکلف غم کو بیجا ہے ۔۔۔ یہ دولت خانہ ہے اس کا وہ جب چاہے چلا آوے

ٹک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ ۔۔۔ دل بھی کیا لق و دق جنگل ہے

غارتِ دل کرے ہے ابرِ سیاہ ۔۔۔ بے طرح گھر میں چور آیا ہے

اس شہرِ دل کو تو بھی جو دیکھے تو اب کہے
کیا جانیے کہ بستی یہ کب سے خراب ہے

دیوانِ دوم

اس کے گنے پہ دل کی خرابی نہ پوچھیے
رہے نہ کیونکہ یہ دل باختہ سدا تنہا
وہ دل کہ تیرے ہوتے رہے تھا بھرا بھرا
صدرنگ ہے خرابی کچھ بھی تو رہ گیا ہے
دل کی آبادی کو پہنچا اپنے گویا چشمِ زخم
اس صحن پر یہ وسعت اللہ رے تیری قدرت
غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے
دل نہ تھا ایسی جگہ جس کی نہ سُدھ لیتے کبھو
دل سے خوش طرح مکاں پھر بھی کبھو بنتے ہیں
دل سے مت جا کہ پھر وہ پچھتایا
دل میں رہا نہ کچھ تو کیا ہم نے ضبطِ شوق
دل میں کیا کیا تھا ہمارے جو نہ ہو جاتی یاس
عشق سے دل یہ تازہ داغ جلا
یہ بستیاں اُجڑ کے کہیں بستیاں بھی ہیں
قصرِ جناں تو ہم نے دیکھا نہیں جو کہیے
یا دل وہ دیدنی تھی جگہ یا کہ تجھ بغیر
رونق تھی دل میں جب تئیں بستے تھے دلبراں
جل جل کے سب عمارتِ دل خاک ہوگئی
دل جو باقی ہو تو آئینہ ہے روئے یار کا
فکرِ تعمیرِ دل کسو کو نہیں
تم دل سے جو گئے سو خرابی رہی بہت
یہ دل جو شکستہ ہے سو یے لطف نہیں ہے
کیا اس کے گئے ہے ذکر دل کا
نہ دل سے جا خدا کی تجھ کو سوگند
دل اور عرش دونوں پہ گویا ہے ان کی سیر

جیسے کسو کا کوئی نگر ہو لُٹا ہوا
کہ کوئی آوے کہاں مَیں تو گھر نہیں رکھتا
اب اس کو دیکھیے تو ہے اِک گھر خراب سا
کیا نقل کریے یارو دل کوئی گھر سا گھر تھا
دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر سب ویراں ہوا
معمار نے قضا کے دل کیا مکاں بنایا
وہ گنج کہ اس کنجِ خرابی میں نہاں تھا
اجڑی اس بستی کو پھر تو نے بسایا ہوتا
اس عمارت کو ٹک اک دیکھ کے ڈھایا ہوتا
ہاتھ سے جس کے یہ مکان گیا
یہ شہر جب تمام لُٹا تب نسق ہوا
یہ نگر کا ہے کو اس طرح سے ویراں ہوتا
اس سیہ خانے میں چراغ چلا
دل ہو گیا خراب جہاں، پھر رہا خراب
شاید نہ ہووے دل سا کوئی مکاں زمیں پر
اب دیکھتا نہیں ہے کوئی اس مکاں کی اَور
اب کیا رہا ہے اُٹھ گئے سب اس مکاں کے لوگ
کیسے نگر کو آہ محبت نے دی ہے آگ
خانہ آبادی سمجھ اس خانہ ویرانی کے تئیں
ایسی ویسی بنائیں کیا کیا ہیں
پھر بھی بساؤ آکر اس اجڑے نگر کے تئیں
ٹھہرو کوئی دم آن کے اس ٹوٹے مکاں میں
ویران پڑا ہے یہ مکاں تو
خدائی میں اگر ایسا مکاں ہو
کرتے ہیں باتیں میرجی کس کس مقام سے

دل کے ویراں کرنے میں بیداد کی ہے تو نے ہائے
خوش عمارت ایسے گھر کو اس طرح سے ڈھائیے!

ٹک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ
دل بھی دامن وسیع صحرا ہے

نہ چھوٹا دل میں کچھ اس کے گئے پر غارتِ غم سے
ہزار افسوس کیا بستی محبت نے لٹا دی ہے

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

دیوانِ سوم

اس سرے دل کی خرابی ہوئی اے عشق دریغ
تو نے کس خانۂ مطبوع کو ویران کیا

دل عجب چہچے کی جاگہ تھی سو دیوانہ ہوا
جوشِ غم سے جی جو بولا سو یہ ویرانہ ہوا

دوریِ یار میں ہے حالِ دل ابتر اپنا
ہم کو سو کوس سے آتا ہے نظر گھر اپنا

دل فقیری سے نہیں میرؔ کسو کا ناساز
خوش ہوا کتنا ہے یہ خانۂ ویراں اپنا

دل عجب شہر تھا خیالوں کا
لوٹا مارا ہے حسن والوں کا

اس شہرِ خوش عمارتِ دل کا ہے کیا خیال
ناگاہ آ کے عشق نے مارا، جلا، گرا

سوجھا نہ چاہ میں کچھ برباد کر چکے دل
میرؔ اندھے ہو رہے تھے اپنا بھی گھر نہ دیکھا

ایسا خدا ہی جانے کہ ہو عرش یا نہ ہو
دل ہونے کی جا نہیں کیا اس مکاں کی بات

گرفتِ دل سے ناچاری ہے یعنی
رہا ہوں بیٹھ میں بھی کر کے گھر بند

پیس مارا دل غموں نے کوٹ کر
کیا اجاڑا اس نگر کو لوٹ کر

گزرے گر دل میں ہو کر تو ایک نگاہ ضروری ہے
کچھ کچھ ترے غم نے لکھا ہے اکھر واں کی عمارتیں

دل و دلی دونوں اگر ہیں خراب
پہ کچھ لطف اس اجڑے گھر میں بھی ہے

دل کو کہتے ہیں کہ اس گنجِ رواں کا گھر ہے
اس خرابے میں کرے ہے وہ کرم کاہے کو

خوش طرح مکاں دل کے ڈھانے میں شتابی کی
اس عشق و محبت نے کیا خانہ خرابی کی

جہاں سے دل کو دیکھو منہ نظر جوں کاں حلق آئے
نہ کی کچھ قدر اُن نے حیف اس آئینہ خانے کی

دیوانِ چہارم

خانہ آبادی ہمیں بھی دل کی یوں ہے آرزو
جیسے جلوے سے ترے گھر آرسی کا بھر گیا

دل کو جو خوب دیکھا تو ھُو کا مکان ہے
ہے اس مکاں میں ساری وہی لامکاں کی طرح

جمگھٹ تھا دل میں لالہ رخوں کے خیال سے
کیا کیا بہاریں دیکھی گئیں اس مکان پر

میرؔ ابتر بہت ہے دل کا حال
یعنی ویراں پڑا ہے گھر افسوس

دل ہی کے غم میں گزرے دس دن جو عمر کے تھے — اچرج ہے اس نگر سے جاتا نہیں رہا کچھ

دیوانِ پنجم

کیا شہرِ خوش عمارت دل سے ہے گفتگو — لشکر نے غم کے آن کے مارا چلا گیا
دل کی خرابی کے تو درپے ہے اے صنم تُو — اس خانۂ خدا کی تعمیر ہے مناسب
دل کی حقیقت عرش کی عظمت سب کچھ ہے معلوم ہمیں — سیر رہی ہے اکثر اپنی ان پاکیزہ مکانوں پر
اجڑے نگر کو دل کے دیکھوں ہوں جب کہوں ہوں — اب پھر بسے گی ایسی بستی خراب کیونکر
اٹھنے دیتا نہیں شکستہ دل — ڈھے گیا کیا مکاں دریغ دریغ
صحرا کو جیسے کشادہ دامن ہم تم سنتے گئے ہیں — بند کر آنکھیں ٹک دیکھو تو ویسا ہی صحرا ہے دل
کیونکیاں اس کا خیال آئے کہ آگے ہی ہم — دل سا گھر آتشی آہوں سے جلا بیٹھے ہیں
دل کو نہیں لاگ لامکاں سے — ہم کو کوئی دل مکاں بہت ہے
دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے — دل خرابہ جیسے دلّی شہر ہے

دیوانِ ششم

عرش و دل دونوں کا ہے پایہ بلند — سیر رہتی ہے ان مکانوں پر
ٹک دل سے آنکھوں میں آ، ہے دید کی جگہ — بہتر نہیں مکان کوئی اس مکان سے
آنکھوں سے آکے دل میں نہ ٹھہرا تو ایک دم — جاتا ہے کوئی دید کے ایسے مکان سے
کیا کہوں اس سے کچھ تو چھوٹا ہے — تنگ دل ان نے صاف لوٹا ہے

درجِ بالا کم و بیش ایک سو اشعار میں بہت کم ایسے ہیں جنہیں داخلی واردات سے تعبیر کیا جا سکے، کیونکہ بیشتر کے پس منظر میں خارجی و اجتماعی اور سیاسی و معاشی معاملات و واقعات ہی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے جس کا ذکر صفحاتِ ماقبل میں اختصار سے کیا جا چکا ہے۔

ذکرِ دل کے کچھ اور انداز

بحوالہ دیوانِ دوم

مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن میں دل کے لیے الفاظ تو وہی (مکان، قصر، شہر وغیرہ) استعمال کیے گئے ہیں لیکن بہ اندازِ دگر ۔۔۔! ان سے مفاہیم میں اضافی لطف پیدا ہو گیا ہے ۔ ؎

اڑتی ہے خاک یارب شام و سحر جہاں میں — کس کے غبارِ دل سے یہ خاکداں بنایا

گویا اس جہان خاکی ("خاکداں") سے قبل ہی دل اپنے غبارِ غم والم سمیت موجود تھا اور اسی خاک (غبارِ دل) کو مصرف میں لاتے ہوئے اس دنیا (خاکداں) کی تخلیق عمل میں آئی! ؎

نقشہ الٰہی دل کا مرے کون لے گیا — کہتے ہیں ساری عرش میں ہے اس مکاں کی طرح

دل کو اس سنجیدگی سے مکان کہا جارہا ہے کہ اس کے "نقشے" تک کا ذکر ہو رہا ہے جس کی نقلِ ثانی نہیں مل سکتی کیونکہ اس کی طرح صرف عرش میں محفوظ ہے! ؎

آنکھوں سے ہوئی خانہ خرابئ دل اے کاش — کرلیتے تبھی بند ہم ان دونوں دَروں کو

آنکھوں کو خانۂ دل کے دو دروازے کہتے ہوئے انہی کو خانہ خرابی کا سبب قرار دیا ہے اور افسوس سے کہا ہے کہ کاش ان دروازوں کو ہم نے تبھی بند کرلیا ہوتا۔ تبھی میں وقت کے عدمِ تعین نے خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔

دیوانِ سوم

؎ ثباتِ قصر و در و بام و خشت و گِل کتنا — عمارتِ دلِ درویش کی رکھو بنیاد

اقبالؔ نے کہا ہے ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود — کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اقبالؔ کے ہاں در و بام و قصر محذوف ہیں جس سے شعر میں زیادہ حُسن پیدا ہو گیا ہے لیکن میرؔ نے تفصیلی ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہ قصرِ شاہی کے مقابلے میں عمارتِ درویش کی برتری نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ اقبالؔ نے جہانِ تازہ کی اساس افکار یعنی دماغ کو قرار دیا ہے جب کہ میرؔ کے نزدیک دماغ کی حیثیت کارفرما کی نہیں بلکہ مشیر کی ہے اور شرفِ کارفرمائی دل کو حاصل ہے ؎

یہ بنا رہتی سی آتی ہے نظر یاں کچھ مجھے — اچھی ہے تعمیرِ دل کی اس خراب آباد میں

اسی مضمون کو ایک جگہ یوں باندھا گیا ہے ؎

کب ہے عمارتِ دل کی جنہوں نے ان کی بنا کچھ رکھی ہے — اور تو خانہ خراب ہی دیکھے اس بستی کے معمار

خراب آباد، خانہ خراب، تعمیرِ دل اور عمارت کرنا کی تراکیب کا لطف محتاجِ بیان نہیں۔ میرؔ کے نزدیک عمارتِ دل ہی اس وسعت کی حامل ہے جس میں پورا عالم سما سکے۔ بظاہر یہ چھوٹا سا گھر ہے مگر پوری دُنیا کو اپنے اندر بسانے کی گنجائش رکھتا ہے (ایسے دل رکھنے والوں کو میرؔ صاحبدل کہتے ہیں) ؎

گھر دل کا بہت چھوٹا پر جائے تعجب ہے — عالم کو تمام اس میں کس طرح ہے گنجائی

لفظ منزل کے لغوی معنی تو ظاہر ہی ہیں لیکن یہ لفظ گھر یا مکان کے لیے بھی استعمال کیا کرتے ہیں، میرؔ نے اس سلسلے میں یہ ذو معنی شعر کہا ہے ؎

عمرِ انساں راہ تو ہے تشویش سے طے ہوتی ہے دے   دل کے تئیں پہنچے جو کوئی چین کی پھر منزل ہے دل

اس منزل تک رسائی کے لیے سعی و جد و جہد درکار ہے چنانچہ عظمتِ دل کے ساتھ شانِ سعی یوں بیان کی ہے ؎

دل کا مکاں پھر اس کا کیا صحن میرؔ لیکن   غالب ہے سعی میں تو میدان لامکاں پر

اقبالؔ نے کہا ہے ؏ چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب!

میرؔ کے ہاں اس بے حجابی کا جلوہ یوں دکھائی دیتا ہے ؎

دل دل لوگ کہا کرتے ہیں، تم نے جانا کیا ہے دل   چشمِ بصیرت وا ہووے تو عجائب دید کی جا ہے دل

کہیں کہیں وہ دل کی خرابی کو ویرانہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں، اس دلیل کے ساتھ کہ جو کبھی معمور تھا وہ اگر خالی ہو بھی جائے تو اسے خالی نہ کہو، اس میں اشارۂ پوشیدہ یہ ہے کہ اہلِ ہمت کے لیے ویرانوں کو آباد کرنا کوئی مشکل بات نہیں ؎

شہرِ دل کی کیا خرابی کا بیاں باہم کریں   اس کو ویرانہ نہ کہئے جو کبھو معمور ہو

بلکہ انہیں تو معمورۂ عالم بھی تنگ سا دکھائی دینے لگتا ہے اور وہ مکاں کو بھی لامکاں کی وسعتوں کا حامل دیکھنے کے متمنی نظر آتے ہیں ؎

صاف میداں لامکاں سا ہو تو میرا دل کھلے   تنگ ہوں معمورۂ دنیا کی دیواروں کے بیچ

معمورۂ دنیا کی دیواریں کسی صاحبِ نظر ہی کو دکھائی دے سکتی ہیں، عام نظریں تو اس کی وسعتوں ہی میں کھو کر رہ جاتی ہیں!

اعزازِ خاص میں دیگر اعضا کا حصّہ

دل کو جو خاص اعزاز و مقام حاصل ہے اس سے انہوں نے دیگر اعضا کو یکسر محروم نہیں رکھا، بعض جگہ ان کو بھی مقامِ بلند پر دکھایا گیا ہے مثلاً

چشم ؎

گھر چشم کا ڈبو مت، دل کے گئے پہ رو رو

کیا میرؔ ہاتھ سے تو یہ بھی مکان دے گا

یہاں چشم کو بھی گھر کہا گیا ہے اور دل کا متبادل مکان قرار دیا ہے!

بعض جگہ دیگر اعضا میں کسی کو یہ شرف بھی حاصل دکھائی دیتا ہے کہ وہ دل جیسے عظیم ٹھکانے کا ٹھکانا بن جاتا ہے، مثلاً درج ذیل شعر میں وہ گوشۂ چشم یا کنجِ لب میں سے کسی کو بھی دل کا ٹھکانا بنانے پہ آمادہ ہیں ؎

گوشۂ چشمِ بتاں یا کنجِ لب اس وقت میں

جا کہیں ہو تو دل اپنے کا ٹھکانہ کیجئے

چشمِ تر ؎
منظر خراب ہونے کو ہے چشمِ تر کا میرؔ
پھر دید کی جگہ نہیں جو یہ مکاں گرا

چشمِ شوق ؎
یہ چشمِ شوق طرفہ جگہ ہے دکھاؤ کی
ٹھہر و بقدرِ یک مژہ تم اس مکان پر

ایک جگہ آنکھوں کو گھر سے تعبیر کرتے ہوئے ان کی خانہ خرابی کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں —— یعنی یہ آنکھوں کی حماقت تھی کہ سیلابِ اشک کے سامنے گھر بنانے کی کوشش کی حالانکہ یہ بدیہی حقیقت ہے کہ راہِ سیلاب میں گھر تعمیر نہیں کیا کرتے ؎

آنکھیں ؎
ہوا خانہ خراب آنکھوں کا اشکوں سے تو بر جا ہے
رہِ سیلاب میں کوئی بھی گھر بنیاد کرتا ہے

ایضاً ؎
رونے سے پھوٹیں آنکھیں دل کو غموں نے خراب کیا
دیکھنے قابل اس کے ہوئے ہیں اب تو یہ ویرانے دو

(ضبطِ) گریہ / چشم ؎
کریں ضبطِ گریہ سے دل کی عمارت
ہوئی چشمِ تر اس خرابے کی بانی

جی ؎
صبر کیا نہیں جاتا ہم سے ضعف بھی ہے بیتابی ہے
سہل نہیں ہے جی کا ڈھینا کیسی خانہ خرابی ہے

بدن ؎
ویرانیٔ بدن سے مرا جی بھی ہے اداس
منزل خراب ہووے تو مہمان کیا کرے

بدن کو مکان اور جی کو مہمان کہنا محض رعایتِ لفظی نہیں —— کچھ اور بھی ہے یعنی حقیقتِ حیاتِ فانی! اور منزل کی خرابی سے مراد وہی خرابیٔ دل ہے جسے درد و غم نے پامال کر رکھا ہے —— اسی پامالی کا رونا وہ جگہ جگہ روتے دکھائی دیتے ہیں ؎

خرابی دل کی کیا انبوہِ درد و غم سے پوچھو ہو
وہی حالت ہے جیسے شہر لشکر لوٹ جاتا ہے

البتہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ میرؔ کی خرابیٔ دل کا باعث محض شخصی اور ذاتی درد و الم نہیں بلکہ روحِ انسانیت کا بے دردانہ قتل اس کا حقیقی سبب ہے!

اجزا بدن کے جتنے تھے پانی ہو بہہ گئے
آخر گدازِ عشق نے ہم کو بہا دیا
(دیوان اول)

بدن نامۂ میر

کچھ ترتیبِ "بدن نامہ" کے بارے میں

ابتدا میں بتایا جاچکا ہے کہ غزلیاتِ میر کے ۱۳۵۷۸ اشعار میں سے ۶۷۴۶ اشعار کا تعلق ہی اصل میں ہمارے موضوع سے ہے یعنی وہ جن میں مختلف اعضائے بدن کا ذکر ہوا ہے۔ اسی کثیر تعداد کو دیکھ کر اسے موضوعِ تحریر بنانے کی تحریک ہوئی اور ایسے تمام اشعار کو یکجا کرنے کا خیال ہمارے ذہن میں پیدا ہوا۔ ان اشعار کی تفصیل صفحۂ اوّل کے فٹ نوٹ میں بلحاظِ دواوین درج کی جاچکی ہے۔

ان اشعار کو یکجا کرنے کا سہل ترین طریقہ یہ ہوسکتا تھا کہ آغازِ دیوان اوّل سے لے کر اختتامِ دیوانِ ششم تک جیسے جیسے یہ اشعار سامنے آتے ہم انہیں درج کرتے چلے جاتے۔ اس سے کام بلاشبہ بہت ہی آسان ہوجاتا لیکن اس کی افادیت اتنی ہی کم رہ جاتی۔ یعنی حوالہ یا مثال کے متلاشیوں کو خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا اور جو مشقت ہمیں کرنا پڑی ہے وہی ان میں سے ہر کسی کو کرنا پڑتی اور تحقیقی کام میں یہ مجموعہ کسی خاص سہولت کا وسیلہ نہ بن سکتا۔ چنانچہ ہمیں اس کی احسن ترین صورت یہ معلوم ہوئی کہ ہر عضوِ بدن کے لیے علیحدہ عنوان قائم کیا جائے اور یوں جملہ اعضاء سے متعلق الگ الگ عنوانات کے تحت ان سے متعلق اشعار ترتیبِ دواوین کے مطابق درج کیے جائیں تاکہ تمام اشعار بہ ترتیبِ کامل یکجا دستیاب ہوسکیں۔ اسی ترتیب کے مطابق عمل کرتے ہوئے ہم نے "بدن نامۂ میر" مرتّب کیا ہے۔

یہ طریقِ ترتیب بہتر تو ضرور ہے لیکن بہت وقت طلب اور صبر آزما ثابت ہوا۔ وجہ یہ کہ اعضاء کا ذکر دواوین میں تو ترتیب وار نہیں کیا گیا اور نہ ایسا ہی ہے کہ ایک شعر میں کسی ایک ہی عضو کا ذکر ہر جگہ کیا گیا ہو بلکہ بیشتر اشعار میں دو یا تین یا چار اعضاء کا ذکر دکھائی دیتا ہے یہاں تک کہ بعض جگہ یہ کیفیت ایک مصرعے ہی میں دکھائی دے جاتی ہے۔ ع ہاتھوں میں دل کو رکھا دانتوں تلے جگر کو ! ایسی صورتوں میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا تھا کہ شعر کا اندراج کس عنوان کے تحت کیا جائے ؟ مثلاً درج بالا مصرعے سے متعلق شعر کو اگر ہاتھ، دل، دانت، جگر سے متعلق ہر عنوان کے تحت درج کیا جائے تو گویا ایک ہی شعر کو چار مرتبہ درج کرنا پڑتا اور ایسے جملہ اشعار کو بار بار درج کرنے سے "بدن نامہ" کی ضخامت بے ہنگم طور پر بڑھ جاتی اور ان کی جو اصل تعداد چھ ساڑھے چھ ہزار ہے وہ کم و بیش دوگنا ہوجاتی۔ بلاشبہ اس میں یہ خوبی موجود ہے کہ ہر عضو سے متعلق پورے کے پورے اشعار اپنے متعلقہ عنوان کے تحت یکجا ہوجاتے اور افادیت میں بھی اضافہ ہوجاتا لیکن ہماری ایک مجبوری اختصار بھی ہے زیادہ سے زیادہ اختصار ! ہم نے مکمل اندراجات کا اہتمام کسی آنے والے خوش نصیب پر چھوڑتے ہوئے اس ضمن میں اصولِ انتخاب کو ترجیح دی ہے یعنی ایسی صورت میں ہر بار یہ دیکھنا پڑا کہ شعر میں مذکور مختلف اعضاء

میں سے مرکزی یا اہم ترین حیثیت کس عضو کو حاصل ہے؟ یوں اہم ترین عضو کا انتخاب کر کے اسی عضو سے متعلق عنوان کے تحت اسی شعر کا اندراج کر دیا گیا ہے۔ اس طرح اس قسم کے ہر شعر کو کم سے کم کسی ایک عنوان کے نیچے تو جگہ مل ہی گئی ہے اور ایسے تمام اشعار جن میں اعضائے بدن کا ذکر آیا ہے مجموعے میں شامل تو ہو گئے ہیں۔ مثلاً ؎

ان ابرو و مژہ سے کب میرے جی بیں ڈر تھا   تیغ و سناں کے منہ پر اکثر مرا جگر تھا

اس شعر میں ابرو، مژہ، منہ اور جگر کا ذکر آیا ہے لیکن ابرو سے محبوب کی تیغ ابرو اور مژہ سے سنانِ مژہ مراد ہے اور منہ کا ذکر محض محاورے کے طور پر آیا ہے۔ آفت رسیدہ صرف جگر ہے جو تیغ و سناں کی زد میں ہے اور اسی کی بپتا بیان کرنا شاعر کا مقصود ہے لہٰذا اس شعر کا اندراج جگر سے متعلق عنوان میں کیا گیا ہے اور ابرو، مژہ، منہ کے عنوانات میں اس کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ہر بار مرکزی اہمیت کے حامل عضو کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ تسلیم کہ یہ انتخاب و ترجیح ہماری صوابدید کے مطابق ہے جس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارا مقصد شعر کو یکسر حذف کرنا تو کسی بھی صورت میں نہیں رہا، بس موزوں ترین عنوان کے تحت درج کرنا رہا ہے یعنی وہ شعر مجموعے میں تو بہر حال شامل رہا ہے۔ ہاں اس عیب یا خامی کا ہمیں اعتراف ہے کہ ہر عنوان سے متعلق مجموعی تعداد اس کے تحت برقرار نہیں رہ سکی! مثلاً مجموعی طور پر میر کے ہاں ۲۳۵۴ شعر ایسے ہیں جن میں لفظِ دل کا ذکر آیا ہے لیکن دل کے عنوان سے جو اشعار "بدن نامۂ میر" میں درج کیے گئے ہیں ان کی تعداد صرف ۱۶۵۹ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بہر حال نہیں کہ بقیہ ۶۹۵ شعر مجموعے ہی سے خارج کر دیے گئے ہیں۔ وہ سب کے سب بھی درج ہیں مگر دیگر عنوانات کے تحت جہاں ان کا اندراج موزوں تر تھا مثلاً ؎

پتھروں سے سینہ کوبی میں نے کی   دل کے ماتم میں مری چھاتی سراہ

یہ شعر "سینہ (چھاتی)" کے عنوان کے تحت درج شدہ اشعار میں شامل ہے۔ اسی طرح یہ شعر ؎

زخم نہ ہو ویں کیونکر غائر چھاتی میں دل خستوں کے   تیر نگاہِ یار جگر پر لگتے ہوئے پیہم دیکھے

"جگر (کلیجہ)" کے عنوان کے تحت درج کیا گیا ہے۔ گویا دل سے متعلق جو شعر اپنے متعلقہ عنوان کے تحت درج نظر نہیں آتا وہ کسی دوسرے عنوان کے تحت درج بہر حال کیا گیا ہے۔ یہی صورت دیگر اعضاء سے متعلق اشعار کے سلسلے میں پیدا ہو گئی ہے یعنی ان کی اصل تعداد زیادہ ہے لیکن اپنے عنوان کے تحت کم رہ گئی ہے لیکن کسی نہ کسی عنوان میں چونکہ شامل ضرور ہیں اس لیے یہ مجموعی تعداد قریب قریب برقرار رہی ہے ـــ اور ہر شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے موزوں ترین عنوان کے نیچے درج بھی ہو گیا ہے۔

مجموعی تعداد کے بارے میں جو کہا گیا کہ "قریب قریب برقرار رہی ہے" اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ۶۴۷۷ نہیں رہی بلکہ کچھ کم چھ ہزار رہ گئی ہے کیونکہ کئی اشعار ایسے ہیں جن میں مذکور اعضاء کا اعادہ قابلِ توجہ نہیں لہٰذا ان کو حذف کر دینا مناسب تر معلوم ہوا مثلاً ساق، دوش، ساعد، ران، ذقن، خال، ٹھوڑی، استخوان، تالو، گوڑے، کاسہ، ایڑی، تلوے، زانو، باچھیں وغیرہ، وغیرہ کا ذکر اگرچہ کئی بار آیا ہے لیکن بہت نمایاں نہیں ہو پایا لہٰذا ان کو بھی

حذف کر دینا ہی بہتر نظر آیا۔ اسی طرح منہ (دہن، دہان)، لب (ہونٹ)، چہرہ (رُو، رُخ) رُخسار، کمر، دانت وغیرہ سے متعلق کل اشعار کی تعداد تو اچھی خاصی ہے لیکن ان میں سے بیشتر کا تعلق سراپائے محبوب سے ہے جب کہ ہمارا موضوع اعضائے بدنِ میرؔ کی خستگی و شکستگی سے متعلق ہے چنانچہ ان کو بھی شامل نہیں کیا گیا، یہی نہیں ہم نے ایک ہزار سے زائد ان اشعار کو بھی شامل نہیں کیا جن میں لفظ لہو، لوہو، خون، زخم، جراحت وغیرہ استعمال ہوا ہے اور اس طرح حذف و اخراج کے باعث درج شدہ اشعار کی تعداد چھ ہزار تک ہی پہنچ پائی ہے۔

متفرق کے عنوان نیز منہ، لب، پلک، مژہ، زبان، گردن کے باقاعدہ عنوانات کے تحت جن اشعار کو بدن نامہ میں شامل کیا گیا ہے ان کی نشاندہی بلحاظ دواوین اس لیے نہیں کی گئی کہ مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر ان سے متعلق بہت سے اشعار خارج کر دیے گئے اور بقیہ تعداد کا دیوان وار اندراج غیر ضروری معلوم ہوا لہٰذا ان کا اندراج "دیوان اوّل تا دیوانِ ششم" یکجا کر دیا گیا ہے۔ جدول میں کل اشعار کی تعداد دس ہزار سے زائد دکھائی دیتی ہے کیونکہ اگر ہر ہر شعر میں مذکور ہر عضوِ بدن کا اندراج اس کے متعلقہ عنوان کے تحت کر دیا جاتا تو واقعی یہ تعداد دس ہزار سے تجاوز کر جاتی حالانکہ اصل تعداد تو وہی ۶۴۷۶ ہے جو حذف و اخراج کے بعد چھ ہزار سے بھی کچھ کم ہی رہ گئی ہے۔ جدول میں "کل اشعار" کا خانہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ فلاں عضو سے متعلق کل اتنے اشعار دواوینِ میرؔ میں موجود ہیں "مندرج اشعار" کے خانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگرچہ کل اشعار تو زیادہ تھے مگر ان میں سے درج صرف اتنے ہی کیے گئے ہیں اس لیے کہ ان اشعار میں اس عضو کے علاوہ بعض دیگر اعضاء کا ذکر بھی آیا ہے اور اندراج ان میں سے ہر شعر کا ایسے عنوان کے تحت کیا گیا ہے جہاں وہ موزوں ترین معلوم ہوا (بلحاظِ مفہوم و اہمیتِ عضو)۔ پس ہر عنوان کے تحت "مندرج اشعار" کی تعداد "کل اشعار" کی نسبت کم دکھائی دے گی جو چھ سات سو اشعار کے حذف و اخراج کے بعد اور بھی کم ہو گئی ہے یعنی ۶۴۷۶ کی بجائے کچھ کم چھ ہزار رہ گئی ہے۔

اعتذار

میری تمام احتیاطوں کے باوجود کئی خامیاں اس تالیف میں رہ گئی ہوں گی خصوصاً بدن نامہ کے اندراجات میں یعنی بعض اشعار ایک سے زیادہ عنوانات کے تحت درج ہو گئے ہوں گے جن کی نشاندہی میری نسبت قاری آسانی سے کر سکتا ہے۔ ایسی نشاندہی کرنے والوں کو مَیں اپنا محسن تصور کروں گا اور اگر وہ میری لغزش سے درگزر بھی فرما دیں تو یہ ان کا دوہرا احسان مجھ پر ہوگا۔ اگر اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن میری زندگی میں شائع ہوا تو مَیں ان محسنوں کے اسمائے گرامی کے حوالے سے جملہ خامیوں کی اصلاح شکریے کے ساتھ کر دوں گا۔

یزدانی

جدوَل

نام عضو	تعداد اشعار	دیوان اوّل	دیوان دوم	دیوان سوم	دیوان چہارم	دیوان پنجم	دیوان ششم	میزان کل اشعار	میزان مندرج اشعار
دل	کل اشعار	۷۰۸	۵۶۶	۳۲۵	۲۸۶	۲۶۷	۲۰۲	۲۳۵۴	
	مندرج اشعار	۴۷۱	۴۴۰	۲۴۳	۱۷۳	۲۱۱	۱۲۱		۱۶۵۹
جگر	کل اشعار	۱۷۲	۸۵	۴۹	۴۲	۴۴	۲۶	۴۱۸	
	مندرج اشعار	۹۸	۵۲	۲۹	۲۸	۲۲	۱۰		۲۳۹
سینہ	کل اشعار	۹۵	۸۳	۴۸	۴۶	۴۸	۲۵	۳۴۵	
	مندرج اشعار	۶۸	۵۹	۲۸	۲۹	۲۸	۱۳		۲۲۵
مُنہ	کل اشعار	۱۱۸	۱۰۴	۸۸	۵۹	۴۹	۴۲	۴۶۰	
	مندرج اشعار	دیوان اوّل تا دیوان ششم							۹۷
لب	کل اشعار	۶۵	۸۷	۵۸	۳۱	۱۹	۱۶	۲۸۶	
	مندرج اشعار	دیوان اوّل تا دیوان ششم							۸۲
ہاتھ	کل اشعار	۱۲۰	۶۳	۴۸	۲۴	۴۲	۲۰	۳۵۷	
	مندرج اشعار	۷۶	۶۵	۳۵	۱۲	۱۵	۵		۲۰۸
پاؤں	کل اشعار	۷۵	۵۲	۵۰	۳۲	۳۲	۱۵	۲۵۶	
	مندرج اشعار	۵۸	۳۹	۲۸	۱۲	۱۹	۵		۱۶۱
جان	کل اشعار	۳۷۵	۳۲۷	۱۷۴	۱۴۴	۱۱۹	۹۸	۱۲۳۷	
	مندرج اشعار	۲۵۳	۲۹۸	۱۴۹	۹۹	۹۰	۹۰		۹۷۹
سر	کل اشعار	۸۵	۷۸	۵۴	۶۸	۶۷	۵۱	۴۰۳	
	مندرج اشعار	۶۸	۶۶	۳۲	۵۶	۵۲	۲۲		۲۹۶
آنکھ	کل اشعار	۲۰۱	۱۸۱	۱۰۴	۸۷	۹۶	۶۲	۷۳۱	
	مندرج اشعار	۱۱۲	۱۲۰	۸۴	۶۸	۷۸	۳۲		۳۹۴
میزان								۶۸۴۷	۴۴۳۰

نام عضو	تعداد اشعار	دیوانِ اوّل	دیوانِ دوم	دیوانِ سوم	دیوانِ چہارم	دیوانِ پنجم	دیوانِ ششم	میزان کل اشعار	میزان مندرج اشعار
چشم	کل اشعار	۱۷۱	۱۰۴	۵۱	۳۹	۶۲	۳۴	۴۵۱	
	مندرج اشعار	۱۵۰	۶۸	۲۶	۲۴	۲۸	۱۶		۳۲۲
مژہ	کل اشعار	۸۱	۵۲	۲۵	۲۲	۱۹	۱۷	۲۱۶	
	مندرج اشعار	دیوان اوّل تا دیوان ششم							۴۸
دیدہ/نگاہ	کل اشعار	۱۵۷	۸۲	۵۷	۳۹	۵۸	۳۸	۴۳۱	
	مندرج اشعار	۴۵	۳۵	۲۷	۱۷	۱۷	۸		۱۴۹
پلک	کل اشعار							۱۲۲	
	مندرج اشعار	دیوان اوّل تا دیوانِ ششم							۵۶
نظر	کل اشعار	۸۴	۴۷	۴۶	۲۳	۴۵	۳۴	۲۷۹	
	مندرج اشعار	۶۰	۳۰	۲۸	۱۰	۲۴	۱۲		۱۶۴
اشک	کل اشعار	۱۵۷	۹۹	۵۱	۴۵	۲۷	۲۸	۴۰۷	
	مندرج اشعار	۸۵	۶۹	۲۶	۲۵	۱۰	۱۵		۲۳۰
زبان	کل اشعار	۵۳	۵۸	۲۴	۲۷	۲۲	۱۹	۲۰۳	
	مندرج اشعار	دیوان اوّل تا دیوان ششم							۹۰
دماغ	کل اشعار	۴۱	۳۱	۳۴	۲۴	۱۴	۲۰	۱۶۴	
	مندرج اشعار	۳۰	۱۶	۱۸	۱۳	۱۰	۱۷		۱۰۴
گردن	کل اشعار	۲۴	۲۸	۲۹	۳۰	۲۳	۱۸	۱۵۲	
	مندرج اشعار	دیوان اوّل تا دیوان ششم							۷۹
متفرق: چہرہ، رخسار، پیشانی، ناخن، گوش، بغل، تن، بدن۔		دیوانِ اوّل تا دیوانِ ششم						۸۹۲	۱۸۴
اعضاء، حواس، پیکر وغیرہ سے متعلق اشعار جن کا اندراج ابتدائے متن میں بطور مثال کیا گیا ہے۔		دیوانِ اوّل تا دیوانِ ششم						۱۰۶	۳۵
میزان								۳۴۲۳	۱۴۶۱
میزان صفحہ گزشتہ								۶۸۴۷	۴۴۴۰
میزان کُل								۱۰۲۷۰	۵۹۰۱

فہرست بدن نامہ

دِل

دیوانِ اوّل

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل
دل سے مرے لگا نہ ترا دل ہزار حیف
طائرِ رنگِ حنا کی سی طرح
میں نہ کہتا تھا کہ منہ کر ... کی اُور
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
سب کھلا باغ جہاں الاّ یہ حیران وخفا
میر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
شب کو اس کا خیال تھا دل میں
خراب مجھ کو کیا اضطراب دل نے میرؔ
کافر ہمارے دل کی نہ پُوچھ اپنے عشق میں
بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا
وہ دل کہ شام و سحر جیسے پکتا پھوڑا تھا
تمام عمر گئی اس پہ ہاتھ رکھتے ہمیں
تا بمقدور انتظار کیا
دل کے تئیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا
دل میں رہ دل میں کہ معمارِ قضا سے اب تک
دل جو دیدار کا قاتل کے بہت بھُوکا تھا
شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اس کے گئے
آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدّت
آگ سی اک دل میں سُلگے ہے کبھی بھڑکی جو میرؔ

تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا
یہ شیشہ ایک عمر سے مشتاقِ سنگ تھا
دل نہ اس کے ہاتھ سے چھُوٹا گیا
اب کہاں وہ آئینہ ٹُوٹا گیا
یہ جگر سو مرتبہ ٹُوٹا گیا
جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا
جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا
یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا
گھر میں مہماں عزیز تھا کوئی
کہ ٹک بھی اس کنے اس بن رہا نہیں جاتا
بیت الحرام تھا سو وہ بیت الضم ہوا
وہ دل کہ جس کا خدائی پہ اختیار رہا
ق وہ دل کہ جس سے ہمیشہ جگر فگار رہا
وہ درد ناک علی الرغم بے قرار رہا
دل نے اب زور بے قرار کیا
گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا
ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا
اس ستم کشتہ سے اِک زخم بھی کھایا نہ گیا
ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بنایا نہ گیا
اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب پایا
دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار
جا پھنسا دام زلف میں آخر
شاید کسُو کے دل کو لگی اس گلی میں چوٹ
شہر دلِ ایک مدت اُجڑا بسا غموں میں
آشنا نہ تجھ سے ملتے نے دل کو کسو کے روتے
ملا زمیں میں گاڑا تب اس کو صبر آیا
دل نے ہم کو مثالِ آئینہ
دل سے مت جا کہ حیف اس کا وقت
ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تڑپ کے مرنے سے دل کے کہ مغفرت ہو اسے
اک قطرہ خون ہو کر پلک سے ٹپک پڑا
دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
سب گئے ہوش و صبر تاب و تواں
دل میں کتنے مسودے تھے ولے
تیرہ عالم ہوا یہ روز سیاہ
کئی دن سلوک وداع کا مرے درپئے دلِ زار تھا
دلِ خستہ جو لہو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
نہیں تازہ دل کی شکستگی یہی درد تھا یہی خستگی
دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
بے طاقتی کریں تو تم بھی معاف رکھیو
چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
وصل و ہجراں سی جو دو منزل ہیں راہ عشق کی
دل نے سر کھینچا دیارِ عشق میں اے بوالہوس
کھینچے عہدِ خط میں بھی دل تیری جانب
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش

یادِ ایام جب تحمل تھا
دل نہایت ہی بے تامل تھا
میری بغل میں شیشۂ دل چور ہو گیا
آخر اُجاڑ دینا اس کا قرار پایا
جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا
اس دل نے ہم کو آخر یوں خاک میں ملایا
ایک عالم کا روشناس کیا
جو کوئی اس مکان سے نکلا
تیوڑی چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا
جہاں میں کچھ تو رہا نام بے قراروں کا
قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا
ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا
اپنے دل کے غبار میں دیکھا
کبھو درد تھا کبھو داغ تھا کبھو زخم تھا کبھو وا تھا
کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا کبھو درد و غم سے فگار تھا
اسے جب سے شوقِ شکار تھا اسے زخم سے سرکار تھا
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
کیا کہیئے کہ دل بھی مجبور ہے ہمارا
کہ ہر غنچہ دل پُر آرزو تھا
تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
وہ سراپا آرزو آخر جہاں مارا گیا
کبھو تو قیامت طرحدار ہو گا
گھبیہ کچھ بے سبب نہیں آتا

کب تک تو امتحاں میں مجھ سے جُدا رہے گا
یاں ہجر اور ہم میں بگڑی ہے کب کی صحبت
غافل نہ رہیو ہرگز نادان دردِ دل سے
عمرِ عزیز ساری دل ہی کے غم میں گزری
جو یہ دل ہے تو کیا سرانجام ہو گا
قدر رکھتی نہ متاعِ دل
دل کہ اک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
مذکورِ یار ہم سے مت ہم نشیں کیا کر
دانستہ ہے تغافل غم کہنا اس سے حاصل
تفحص فائدہ ناصح تدارک تجھ سے کیا ہوگا
یہ دل کہ خون ہووے بر جا نہ تھا وگرنہ
مَیں بھی دنیا میں ہوں اک نالہ پریشاں یکجا
تو بھی رونے کو بلا دل بھی ہمارا ہے بھرا
منزل اس مہ کی رہا جو مدتوں اے ہمنشیں
اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
روز و شب گزرے ہے پیچ و تاب میں رہتے تجھے
نے دل بجا رہا ہے نہ صبر و حواس و ہوش
کچھ مَیں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث
چوری میں دل کی وہ ہنر کر گیا
دل نہیں ہے منزلِ سینہ میں اب
حیف جو وہ نسخۂ دل کے اُوپر
ہر حرفِ غم نے میرے مجلس کے تئیں رُلایا
ایسے بتِ بے مہر سے ملتا بھی ہے کوئی
دل جو زیرِ غبار اکثر تھا
دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم
گم ہے یہ بیقراری دل رہ چکا بغل میں

جیتا ہوں تو تجھی میں یہ دل لگا رہے گا
زخمِ دل و نمک میں کب تک مزا رہے گا
بھڑکے گا جب یہ شعلہ تب دل جلا رہے گا
بیمارِ عاشقی یہ کس دن بھلا رہے گا
تہِ خاک بھی خاک آرام ہو گا
سارے عالم کو مَیں دکھا لایا
ایک عالم کے سر بلا لایا
اور بھی خاک میں ملا لایا
دل جو بجا نہیں ہے پھر اس میں جا رہے گا
تم دردِ دل کہو گے وہ سر جھکا رہے گا
وہی یاد دے گا میرا دردِ دل جس کا لگا ہو گا
وہ کون سی جگہ تھی اس کو جہاں نہ پایا
دل کے سو ٹکڑے مرے پر سبھی نالاں یکجا
ہو جیسے ابر، بیابان میں گریاں یکجا
اب وہ دل گویا کہ اک مدت کا ماتم خانہ تھا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
اے دلِ صد چاک کس کی زلف کا تو شانہ تھا
آیا جو سیلِ عشق سب اسباب لے گیا
برہم ہی میرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا
دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر کر گیا
یاں سے وہ بے چارہ سفر کر گیا
سرسری سی ایک نظر کر گیا
گویا غبارِ دل کا پڑھتا کتاب نکلا
دلِ میر کو بھاری تھا جو پتھر سے لگایا
کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا
یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا
دو روز دل ہمارا مہماں ہے ہمارا

ہیں اس خراب دل سے مشہورِ شہر خوباں
ماہیتِ دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
کرتا ہے کام دل وہ جو عقل میں نہ آوے
بنجر زمین دل کی ہے میرؔ ملک اپنی
کب مصیبت زدہ دل مائلِ آزار نہ تھا
نرم تر موم سے بھی ہم کو کوئی دیتی قضا
خلش نہیں کسو خواہش کی رات سے شاید
کیا دن تھے وے کہ یاں بھی دلِ آرمیدہ تھا
دلِ بیقرار گریۂ خونیں تھا رات میرؔ
کثرتِ داغ سے دل رشکِ گلستاں نہ ہوا
برق مت خوشی کی اور اپنی بیل کر صحبت
مشتِ نمک کی خاطر اس واسطے ہوں حیراں
روتی ہے شمع اتنا ہر شب کہ کچھ نہ پوچھو
وہ بیکس کیا کرے گر تو رہی دل ہی کی دل ہی میں
صیاد دل ہے دردِ جدائی سے رشکِ باغ
خرابی دل کی اس حد ہے کہ پہچانا نہیں جاتا
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
گئی تسبیح اس کی نزع میں کب میرؔ کے دل سے
دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں
مانندِ حرف صفحۂ ہستی سے اٹھ گیا
عاشق ہیں ہم تو میرؔ کے بھی ضبطِ عشق کے
بھری ہے آگ تیرے دردِ دل میں میرؔ ایسی تو
کس شام سے اٹھا تھا مرے دل میں درد سا
آہ کی میں دلِ حیران و خفا کو سونپا
جوں برقِ خزاں دیدہ سب زرد ہوئے ہم تو
آہِ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا

اس ساری بستی میں گھر ویران ہے ہمارا
یک قطرہ خون یہ دل، طوفان ہے ہمارا
گھر کا مشیر کتنا نادان ہے ہمارا
پُر داغ سینہ مہری فرمان ہے ہمارا
کون سے دردو ستم کا یہ طرفدار نہ تھا
سنگ چھاتی کا، تو یہ دل ہمیں درکار نہ تھا
سرشکِ یاس کے پردے میں دل روانہ ہوا
رُو آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ تھا
آیا نظر تو بسمل درخوں طپیدہ تھا
میرا دلخواہ جو تھا وہ تو کبھو یاں نہ ہوا
شکر کر یہ کہ مرا واں دلِ سوزاں نہ ہوا
کل زخمِ دلِ نہایت دل کو مرے لگا تھا
میں سوزِ دل کو اپنے مجلس میں کیوں کہا تھا
نپٹ بیجا ترا دل میرؔ سے لے آرزو ٹوٹا
تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا
کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ ہے مدت کا
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا
اسی کے نام کی سمرن تھی جب منکا ڈھلکتا تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا
واں چیں جبیں پہ آئی کہ یاں رنگ زرد تھا
دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا
کہ کہتے روبرو اس شوخ کے قاصد کا منہ آیا
سو ہو چلا ہوں پیشتر از صبح زرد سا
میں نے یہ غنچۂ تصویر صبا کو سونپا
گرمی نے ہمیں دل کی آخر کو جلا رکھا
اس باد نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا

پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج
کیا کچھ نہ تھا ازل میں، نہ طالع جو تھے درست
تکلیف دردِ دل کی عبث، ہمنشیں نے لی
دل دینے کی ایسی حرکت ان نے نہیں کی
دل میں بھرا زبسکہ خیالِ شراب تھا
دل جو نہ تھا تو رات کو خود رفتگی میں میرؔ
جو سنا ہشیار اس میخانہ میں تھا بے خبر
بن اس کے ہم آغوشی بیتاب نہیں اب ہی
کیا کہیے آہ عشق میں خوبی نصیب کی
دل سمجھا نہ تھا محبت کو پھر ان نے کیا یہ خیال کیا
گزرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا
مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد
ہے قاعدۂ کلی یہ کوئے محبت میں
عالم میں کوئی دل کا طلب گار نہ پایا
بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ
کب میرؔ بسر آوے تم ایسے فریبی سے
پائے خطاب کیا کیا دیکھے عتاب کیا کیا
حیران رنگِ باغِ جہاں تھا بہت رُکا
عالم کی بے فضائی سے تنگ آ گئے تھے ہم
اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھیے
بدتر ہے زیست مرگ سے ہجرانِ یار میں
جانی نہ قدر اس گہرِ شب چراغ کی
گرمی چراغ کی سی نہیں وہ مزاج میں
تنگی لگا ہے کرنے دم اپنا بھی ہر گھڑی
اس کے گئے پہ دل سے گئی ایسی، ہمنشیں
لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تم نے
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے

بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اُٹھا دیا
ہم کو دل شکستہ قضا نے دلا دیا
دردِ سخن نے میرے سبھوں کو رُلا دیا
جب تک جیے گا میرؔ پشیماں رہے گا
مانند آسیہ کے مرے گھر میں آب تھا
گہ انتظار و گاہ مجھے اضطراب تھا
شوق ہی باقی رہا ہم کو دلِ آگاہ کا
مدت سے بغل میں دل آرام نہیں رکھتا
دلدار اپنا تھا سو دل آزار ہو گیا
خوں ہو بہ سبب آپ ہی گیا جو عشقِ حسن و جمال کیا
خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا
دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا
دل کم جو ہوا ہوگا، پیدا نہ ہوا ہوگا
اس جنس کا یاں ہم نے خریدار نہ پایا
ہے دیدِ چشم دل کے لیے عین ذات کا
دل کو تو لگا بیٹھے پر دل نہ لگا جانا
دل کو لگا کے ہم نے دیکھے عذاب کیا کیا
تصویر کی کلی کی طرح دل نہ وا ہوا
جا گہ سے دل گیا جو ہمارا بجا ہوا
جیسے کسو کا کوئی نگر ہو لُٹا ہوا
بیمارِ دل بھلا نہ ہوا تو بھلا ہوا
دل ریزۂ خذف کی طرح میں اُٹھا دیا
اب دل فسردگی سے ہوں جیسے بجھا دیا
کڑھنے نے دل کے جی کو ہمارے کھپا دیا
معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا
جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے حال کیا
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

حال دلِ میرؔ کا رو روکے سب اے ماہ سنا
سیکڑوں طرحیں نکالیں یار کے آنے کی لیک
مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا
درپئے دل ہی رہے اس چہرہ کے خالِ سیاہ
اب جھمکی اس کی تم نے دیکھی کبھی جو یارو
ہمارے ضعف کی حالت سے دل قوی رکھو
دنیا و دیں کی جانب میلان ہو تو کہیے
بعد اک عمر جو ہوا معلوم
جدا جو پہلو سے وہ دلبر یگانہ ہوا
دلِ بے رحم گیا شیخ لیے زیرِ زمیں
شاید ہماری خاک سے کچھ بھی ہوائے نسیم
چلو ہو راہ موافق کہے مخالف کے
کسو کی بات نے آگے مرے نہ پایا رنگ
کہیے جو تمیز اس کو کچھ اچھے برے کی ہو
سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
ناتواں ہم ہیں کہ ہیں خاک گلی میں اس کے
اپنے ہی دل کو نہ ہو واشد تو کیا حاصل نسیم
جنگل میں اب کی مجھے اپنے دل کا غم ہے حیف
خاک تک کوچۂ دلدار کی چھانی ہم نے
بارہا گور دل جھنکا لایا
وے پہلی التفاتیں ساری فریب نکلیں
دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
بسانِ راہ ہو پامالِ راہِ خلق اے میرؔ
دل کس کے رُو و مُو سے لگایا ہے میرؔ نے
شکوہ عبث ہے میرؔ کو کڑھتے ہیں سارے دن
گزرا کسے جہاں میں خوشی کا تمام روز
دل کی کدورت اپنی اک شب بیاں ہوئی تھی

شب کو القصہ عجب قصۂ جانکاہ سنا
عذر ہی جا ہے چلا اس کے دل بدخواہ کا
موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا
ڈر ہمیں ان چوٹوں کا روزِ روشن میں رہا
برسوں تلک اسی میں پھر دل سدا رہے گا
کہیں خیال نہیں یاں بحال آنے کا
کیا جانئے کہ اس بن دل ہے کدھر ہمارا
دل اس آئینہ رُو کا پتھر تھا
طپش کی یاں تئیں دل نے کہ دردِ شانہ ہوا
مر گیا پر یہ کہن گبر مسلمان نہ ہوا
غربال کر کے کوچۂ دلدار دیکھنا
طریق چھوڑ دیا تم نے دلنوازی کا
دلوں میں نقش ہے میری سخن طرازی کا
دل جس کسو کا پایا چٹ ان نے اڑا رکھا
دل سے اک داغ ہی جدا نہ ہوا
اب تو بے طاقتی سے دل کا بھی مقدور گیا
گو چمن میں غنچۂ پژمردہ تم سے کھل گیا
خبر لی جب کہ نہ جامے میں ایک تار رہا
جستجو کی پہ دلِ گم شدہ پایا نہ گیا
اب کے شرطِ وفا بجا لایا
دینا نہ تھا دل اس کو میں میرؔ آہ چوکا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا
رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا
پاتے ہیں اس جواں کو بیتاب روز و شب
یا دل کا حال رہتا ہے درہم تمام شب
کسی کی کٹی زمانے میں ہے بے غم تمام شب
رہتا ہے آسماں پر تب سے غبار ہر شب

شب سوزِ دل کہا تھا مجلس میں ہیں شمع سے
دل لے گیا تھا زیرِ زمیں میں بھرا ہوا
کس کے لگا ہے تازہ تیرِ نگاہ اس کا
تنگ ہو جاوے گا عرصہ خفتگانِ خاک پر
چُٹیلے[1] لگتی ہیں دل پر بلبلوں کے باغباں تو جو
وا شد ہوئی نہ دل کی فقیروں سے بھی ملے
زندگی کس کے بھروسے پہ محبت میں کروں
ہونے لگا گداز غمِ یار بے طرح
ہم سے بن مرگ کیا جدا ہو ملال
لگتی ہے کچھ سموم سی تو نسیم
جاتی نہیں ہے دل سے تری یادِ زلف و رُو
نہ وعدہ تیرے آنے کا نہ کچھ امید طالع سے
کوچے کی اس کے راہ نہ بتلائی بعد مرگ
ہے ؟ ئے ہر دل میں ترے آدرگزر کر یہ وفا
سیکڑوں حرف ہیں گرہ دل میں
غالب کہ دیوے قوتِ دل اس ضعیف کو
نکلیں گے کام دل کے کچھ اب اہلِ ریش سے
دوری میں دلبروں کی کٹتی ہے کیونکہ سب کی
جورِ دلبر سے کیا ہوں آزردہ
کل رقصِ شیخ مطلق دل کو لگا نہ میرے
سبک کر دیا دل کی بے طاقتی نے
دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
کیا قصرِ دل کی تم سے ویرانی نقل کیجئے
برسوں عذاب دیکھے قرنوں تعب اٹھائے
ادل کار محبت تو بہت سہل ہے میرؔ

روتی ہے یاں تلک کہ بھرا ہے لگن میں آب
آتا ہے ہر مسام سے میرے کفن میں آب
اک آہ میرے دل کی ہوتی ہے پار ہر شب
گر ہمیں زیرِ زمیں سونپا دلِ نالاں سمیت
چمن میں توڑتا ہے ہر سحر کلیوں کے تئیں چٹ چٹ
کھلتی نہیں گرہ ہے کسو کی دعا سے آج
ایک دل غمزدہ ہے سو بھی ہے آفات کے بیچ
رہنے لگا ہے دل کو اب آزار بے طرح
جان کے ساتھ ہے دلِ ناشاد
خاک کس دل جلے کی کی برباد
روتے ہی مجھ کو گزرے ہے کیا شام کیا سحر
دلِ بیتاب کو کس منہ سے کہیے ٹک تامل کر
دل میں صبا رکھے تھی مری خاک سے غبار
کر رحم ٹک اپنے اُپر مت ہو دل آزار اس قدر
پر کہاں پاشیے لبِ اظہار
تنکے کو جو دکھا دے ہے پل میں پہاڑ کر
کچھ ڈھیر کر چکے ہیں یہ آگے اکھاڑ کر
آدھا نہیں رہا ہوں تجھ سے تو میں بچھڑ کر
میرؔ اس چار دن کے جینے پر
آیا وہ حیز شرمی کتنا مٹک مٹک کر
تجانا تھا اس کی طرف ہم کو ہر بار
پچھتاؤ گے ، سنو ہو ، یہ بستی اجاڑ کر
ہو ہو گئے ہیں ٹیلے سارے مکان ڈھ کر
یہ دل حزیں ہوا ہے ، کیا کیا جفائیں سہہ کر
دل سے جاتا ہے دے صبر و قرار آخر کار

---

[1] چوٹیں

کوئی ہوتا ہے دل طپش سے بڑا
دل سے میرے شکستیں الجھی ہیں
اس کے اوپر کہ دل سے تھا نزدیک
میرؔ صاحب ہی چوُکے اے بدعہد
دل کام چاہتا ہے اب اس کے گیسوؤں سے
سیاہ کر دوں گا گلشن دودِ دل سے باغباں میں بھی
عبث پوچھے ہے مجھ سے میرؔ میں صحرا کو جاتا ہوں
غنچے چمن چمن کھلے اس باغ دہر میں
غنچہ نہ بوجھ، دل ہے کسو مجھ سے زار کا
توڑا تھا کس کا شیشۂ دل تو نے سنگدل
عمر گزری دعائیں کرتے میرؔ
ایک دن بال فشاں ٹک ہوئے تھے خوش ہو کر
دل جلوں پیرو تے ہیں جن کہ ہے کچھ سوزِ جگر
مجنوں کا دل ہوں محملِ لیلیٰ سے ہوں جدا
حیراں ہوں میرؔ نزع میں اب کیا کروں بھلا
کیونکہ بحرِ غم سے نکلا جائے مجھ بے دل کے پاس
دُور اس سے جس ہوا، دل پر بلا ہے مضطرب
یوں گنواتا ہے دل کوئی، مجھ کو
دل تو افگار ہے جگر ہے ریش
کل ہم نے سیرِ باغ میں دل ہاتھ سے دیا
شب اس دل گرفتہ کو وا کر بزور سے
آہ برچھی سی لگی تھی تیر سی دل کی طپش
محبت نے شاید کہ دی دل میں آگ
کوئی داد دل آہ کس سے کرے
آسودگی جو چاہے تو مرنے پہ دل کو رکھ
کب سے متمنّی ہے جفاؤں کا دلِ زار
بھلا تم نقد دل لے کر ہمیں دشمن سمجھو اب تو

ایک دم کے لہو نہ پینے پر
سنگ باراں ہے آبگینے پر
غم دُوری چلے ہیں ہم لے کر
ورنہ دینا تھا دل قسم لے کر
ہاں مر گئے ہیں کتنے برسوں اٹک اٹک کر
جلا آتش میں میرے آشیاں کے خار و خس بہتر
خیالی ہے یہ دل کھلا ہے جو تو نے تو بس بہتر
دل ہی بڑا ہے جو نہیں ہوتا ہے وا ہنوز
کھلتا نہیں جو سعی سے تیری صبا ہنوز
ہے دل خراش کوچے میں تیرے صدا ہنوز
دردِ دل کا ہوا نہ چارہ ہنوز
ہیں غم دل کی اسیری میں گرفتار ہنوز
شمع رکھتی ہے ہماری گور پر ماتم ہنوز
تنہا پھروں ہوں دشت میں جوں نالۂ جرس
احوال دل بہت مجھے فرصت ہے یک نفس
آ کے ڈوبی جاتی ہے کشتی مری ساحل کے پاس
اس طرح تڑپا نہیں جاتا کسو بسمل کے پاس
یہی آتا ہے بار بار افسوس
اک مصیبت ہے میرے تئیں درپیش
اک سادہ گلفروش کا آ کر سبد فروش
بیٹھے تھے شیرہ خانے میں ہم کتنے ہرزہ کوش
ہجر کی شب مجھ پہ گزری غیرتِ روزِ مصاف
دھوکن سا ہے کچھ اس نگر کی طرف
ہر اک سے ہے اس فتنہ گر کی طرف
آشفتگیٔ طبع بہت کم ہے زیرِ خاک
زنہار وفا ہو نہ سکی یار سے اب تک
کبھو کچھ ہم بھی کر لیں گے حساب دوستاں در دل

یہ دطراش تلے ہر شب کے میرؔ تیرے
متدلہے اختلاط کا بازار آج کل
ٹھوکر دلوں کو لگنے لگی ہے خرام میں
مدّت ہوئی کہ چاکِ قفس ہی سے اب تو میرؔ
ہوس تھی عشق کرنے میں ولیکن
شہرِ خوبی کو خوب دیکھا میرؔ
پُوچھو نہ دل کے غم کو ایسا نہ ہووے یاراں
جاؤ گے بھول عہد کو فرہاد و قیس کے
کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں
اہلِ دل چشم سب تری جانب
گو دھوآں دل سے مرے اٹھنے لگا پیچ و تاب
مضطرب ہو کر کیا سب میں سبک
ہووے نہ اتنا کچھ سے کچھ چھوٹے ہے دل لگا مرا
کیا جزا ٹھہرتی ہے دیکھیے کل حشر کو میرؔ
لیتے ہیں سانس یوں ہم جیوں تار کھنچتے ہیں
کرے ہیں حادثے ہر روز وار آخر تو
سوزشِ دل سے مفت جلتے ہیں
دل لے کے رُو بھی ٹک نہیں دیتے کہیں گے کیا
متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل
دل خواہ جلا اب تو مجھے اے شبِ ہجراں
نہ کہا تھا اے رفوگر تیرے ٹانکے ہوں گے ڈھیلے
تو جہاں سے دل اٹھا یہاں نہیں رسمِ دردمندی
جلئے ہی نہ مرضِ دل تو نہیں اس کا علاج
تو پری شیشے سے نازک ہے نہ کر دعوئ مہر
مشہور ہیں دلوں کی مرے بے قراریاں
گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے
رہتا ہے سوزِ عشق سے دوزخ میں روز و شب

کردیں کے بے نمک ہی شورِ نوائے بلبل
لگتا نہیں ہے دل کا خریدار آج کل
لاوے گی اک بلا تری رفتار آج کل
دکھلا رہے ہیں گل کو دلِ چاک چاک ہم
بہت نادم ہوئے دل کو لگا ہم
جنسِ دل کا کہیں رواج نہیں
مانند روضہ خواں کے مجلس کے تئیں رلاؤں
گر پنچیں ہم شکستہ دلوں کی بھی یاریاں
اس غمکدہ میں آہ ! دلِ خوش کہیں نہیں
آئینہ کی مثال رکھتے ہیں
میرؔ اس پہ قطعِ ربطِ زلف خم در خم کریں
دل نے آخر نخفتیں دلوائیاں
شوخ کسی ہی آن میں تجھ سے تو ئیں جدا نہیں
داغ ہر ایک مرے دل پہ ہے خوندار چمن
اب دل گرفتگی سے آزار کھینچتے ہیں
سنان آہ دل شب کو ہم بھی پار کریں
داغ جیسے چراغ جلتے ہیں
خوبانِ بد معاملہ یوم الحساب میں
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں
مَیں سوختہ بھی منتظرِ روزِ جزا ہوں
نہ سیا گیا نہ آخر دلِ چاک بے قراراں
کسی نے بھی یوں نہ پوچھا ہوئے خاک یاں ہزاراں
اپنے مقدور تلک ہم تو دوا کرتے ہیں
دل ہیں پتھر کے انھوں کے جو دفا کرتے ہیں
جاتی ہیں لامکاں کو دلِ شب کی زاریاں
دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں
لے جائے گا یہ سوختہ دل کیا بہشت میں

کب تک خراب سعیٔ طواف حرم رہوں
مَیں یہ کہتا تھا کہ دل جن نے لیا کون ہے وہ
وے دن گئے کہ آتشِ غم دل میں تھی نہاں
جلے دل کی مصیبت اپنی سن کر
تو گلی میں اس کی جا آوے اے صبا نہ چنداں
ہے صفا کیا دل اتنا کہ دکھائی دیوے منہ بھی
چلا ہے آج ہوس میں ہفت آسمان کے اوپر
کیا تم کو اچنبھا ہے سختی کا محبت میں
کیا جو عرض کہ دل کا شکار لایا ہوں
نہ تنگ کر اسے اے فکرِ روزگار کہ مَیں
پھر اختیار ہے آگے ترا یہ ہے مجبور
یہ جو سر کھینچے تو قیامت ہے
ایک نے صورت نہ پکڑی پیشِ یار
زیارت کروں دل سے خستہ جگر کی
رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشاں
تری گلی میں مَیں رویا تھا دل جلا ایک شب
یہ درد اس کے کیونکہ کروں دلنشیں کہ آڈ
حسن کلام کیونکر کھینچے نہ دامنِ دل
یکساں ہے تیرے آگے جو دل اور آرسی
جی بکھرے دل ڈہے ہے سر بھی گرا پڑا ہے
صبر و طاقت کو رُوؤں یا خوش دلی کا کم کروں
تڑپ ہے قیس کے دل میں تہ زمیں اس سے
کوئی بھی زمزمہ کرے میرؔ آسا دلخراش
یونہی حیران و خفا ہوں غنچۂ تصویر ہوں
شرابِ خون بن تڑپھوں سے دل لبریز رہتا ہے
جو ٹوٹے دل کے ہیں بتاں مشہور
اس طرح دل گیا کہ اب تک ہم

دل کو اٹھا کے بیٹھ رہوں گا کنشت میں
یک بیک بول اٹھا اس طرف آ، مَیں ہی ہوں
سوزش رہے اب تو ہر ایک استخوان میں
لگی ہے آگ سارے تن بدن میں
کہ گڑے ہوئے پھر اکھڑیں دل چاکِ دردمنداں
وے مفت اس آئینہ کو نہیں لیتے خود پسنداں
دل کے مزاج میں بھی کتنی شتابیاں ہیں
دشوار ہی ہوتا ہے دل جن کے اٹکتے ہیں
کہا کہ ایسے تو مَیں مفت مار لایا ہوں
دل اس سے دم کے لیے مستعار لایا ہوں
کہ دل کو تجھ تئیں بے اختیار لایا ہوں
دل کو ہم پائمال رکھتے ہیں
دل میں شکلیں سیکڑوں ٹھہر ئیاں
کہاں ہوگا یارب مزارِ غریباں
ود پے نہ ہو، اس وقت خدا جانے کہاں ہوں
ہنوز واں سے دلِ داغدار پاتے ہیں
کہتا ہوں جس طرح سے کہے ہے نہیں نہیں
اس کام کو ہم آخر محبوب کر چکے ہیں
کیا خوب دزشت کی تجھے پہچان ہی نہیں
خانہ خراب تجھ بن کیا کیا خرابیاں ہیں
اس میں حیران ہوں بہت کس کس کا مَیں ماتم کروں
غزال دشت نشان مزار پاتے ہیں
یوں تو قفس میں اور گرفتار بہت ہیں
عمر گزری پہ نہ جانا مَیں کہ کیوں دلگیر ہوں
بھرے ہیں سنگریزے مَیں نے اس مینائے خالی میں
بس یہی اعتبار رکھتے ہیں
بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں

ہم اس سے آہ سوزِ دل اپنا نہ کہہ سکے
رکھا تھا ہاتھ دل پہ آہ کرتے

آتش ہے دل میں حالِ بد اپنا بھلا کہوں
صحبت رکھا کیا وہ سیفہ وضلال سے

ہم جلتے ہیں یا کہ دل آشنا زدہ
جب دردِ دل کا کہتا میں دل میں ٹھاتا ہوں

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں
یرق کم حوصلہ ہے ہم بھی تو

ہے اب کام دل جس پہ موقوف تو
ہوا مائل اس سروِ کا دل مرا

شاید نکل ہی آوے دل گم جو ہو گیا ہے
آب وہوائے ملکِ عشق تجربہ کی ہے میں بہت

اک زخم کو میں دیشۂ الماس سے چیرا
کم نہیں ہے دلِ پُر داغ بھی اے مرغِ اسیر

دامن پہ تیرے گرد کا کیونکر اثر نہیں
روز بدتر جیسے بیمارِ اجل ہے دل کا حال

بُرا کہنا بھی میر خوش نہ آیا اس کو تو ورنہ
جس جگہ ہو زمین تفتہ سمجھ

تسلی تو ہو دلِ بے قرار خوباں سے
ہم تو ہوئے تھے میرؔ سے اس دن ہی ناامید

رازِ پوشیٔ محبت کے تئیں چاہیئے ضبط
ہے فرش عرش تک بھی قلبِ حزیں کا اپنے

جو کوئی دم ہو تو لوہو سا پانی کے رہ جاؤں
صدائے آہ جیسے تیر دل کے پار ہوتی ہے

اس جینے سے اب دل کو اٹھا بیٹھیں گے ہم بھی
منظر میں بدن کے بھی یہ اک طرفہ مکاں تھا

شیخ پیرِ مغاں کی خدمت میں
تھے آتشِ دروں سے پھپھولے زباں میں

نہیں رہتا چراغ ایسی پَوَن میں
پھر آپ ہی سمجھ کر کے یہ کہتا ہوں کیا کہوں

دل ہی میں خوش ہوا کہیں مری نکتہ دانیاں
کہئے سو کس سے عشق کے حالات کے تئیں

کہتے ہیں بن سنے ہی میں خوب جانتا ہوں
تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں

دلکِ بے قرار رکھتے ہیں
وہ نالہ ہے جس میں اثر کچھ نہیں

بجز جور جس سے ثمر کچھ نہیں
اس کی گلی میں بیٹھا میں خاک چھانتا ہوں

کر کے دوائے دردِ دل کوئی بھی پھر جیا نہیں
دل پر ابھی جراحتِ ناکار بہت ہیں

گل میں کیا ہے جو ہوا ہے تو طلب گارِ چمن
ہم دل جلوں کی خاک جہاں میں کدھر نہیں

یہ سمجھ کر ہمنشیں اب ہمیں دوا کرتا نہیں
تسلی یہ دلِ ناشاد ہوتا ایک گالی ہیں

کہ کوئی دل جلا گڑا ہے یاں
یہ کاش ملتے نہ ملنے کا کچھ قرار کریں

جس دن سنا کہ ان نے دیا دل بتوں کے تئیں
سو تو بیتابیٔ دل بن مجھے آرام نہیں

اس تنگ گھر میں ہم نے دیکھی ہیں کیا فضائیں
غموں کی دل میں بھلا کب تلک سمائی ہو

کسی بے درد نے کھینچا کسو کے دل سے پیکاں کو
ہے تجھ کو قسم ظلم سے مت ہاتھ اٹھا تو

افسوس کہ ٹک دل میں ہمارے نہ رہا تو
دل سے اک اعتقاد ہے ہم کو

شوق ہی شوق ہے نہیں معلوم
آرام ہو چکا مرے جسمِ نزار کو
پانی پہ جیسے غنچۂ لالہ پھرے بہا
گر ساتھ لے گڑا تو دلِ مضطرب کو میرؔ
ہے سوزِ داغ دل پر گر یہی جلے بجا ہے
صد چشم داغ و آہیں دل پہ مرے ہیں وہ ہوس
دل کیونکہ راست آوے دعوائے آشنائی
نزدیک سوزِ سینہ کے رکھ اپنے قلب کو
سو دل سے بھی نہ کام چلے اس کے عشق میں
دل صاف ہو تو جلوہ گہِ یار کیوں نہ ہو
آوے جو کوئی آئینہ بازارِ دہر میں
مقصود وردِ دل ہے نہ اسلام ہے نہ کفر
گیسوئے مشکبو کو اسے ضد ہے کھولنا
بسانِ زر ہے مرا جسمِ زار سارا زرد
حالِ دلِ میرؔ کا اے اہلِ وفا مت پوچھو
صبر و ہوش و خرد و دین و حواس و دل و تاب
اشتعالک کی محبت نے مکاں درِ بست پھونکا
وقتِ قتل آرزوئے دل جو لگے پوچھنے لوگ
پوچھتے کیا ہو مرے دل کا تم احوال کہ ہے
کیا پھرے وہ وطن، آوارہ اگیا اب سو ہی
جوں قیس کر حالِ دل اک بار تو بیں عرض کیا
رنگِ رفتہ بھی دل کو کھینچے ہے
دل ہوا ہے طرف محبت کا
فرصت نہیں تنک بھی کہیں اضطراب کو
کہنے سے میرؔ اور بھی ہوتا ہے مضطرب
دل پُر خوں ہے یہاں تجھ کو گماں ہے شیشہ
جا کے پوچھا جو میں یہ کارگہِ مینا میں
ق

اس سے کیا دل نہاد ہے ہم کو
رکھے خدا جہاں میں دلِ بیقرار کو
دیکھا میں آنسوؤں میں دلِ داغدار کو
آرام ہو چکا ترے مشتِ غبار کو
اچھلے ہے اپنا گھر بے چراغ کس کو
دکھلا رہا ہے لالہ تو اپنا داغ کس کو
دریائے حسن وہ مہ، کشتی بکف گدا تو
وہ دل ہی کیمیا ہے جو گرمِ گداز ہو
اک دل رکھوں ہوں میں تو کدھر ہو کدھر نہ ہو
آئینہ ہو تو قابلِ دیدار کیوں نہ ہو
بارے متاعِ دل کا خریدار کیوں نہ ہو
پھر ہر گلے میں سبحہ و زنار کیوں نہ ہو
پھر زخم دل فگاروں کا ناسور کیوں نہ ہو
اثر نمام ہے دل کے گداز کرنے کو
اس ستم کشتہ پہ جو گزری جفا مت پوچھو
اس کے ایک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو
شہرِ دل کیا کہوں کس طور جلا مت پوچھو
میں اشارات کی ادھر، ان نے کہا مت پوچھو
جیسے بیمارِ اجل روز بتر مت پوچھو
دلِ گم کردہ کی اب خیر خبر مت پوچھو
میرؔ صاحب جی! بس اب بار دگر مت پوچھو
ایک شب اور یاں سحر دیکھو
خون کے قطرے کا جگر دیکھو
کیا آفت آگئی مرے اس دل کی تاب کو
سمجھاؤں کب تک اس دلِ خانہ خراب کو
شیخ کیوں مست ہوا ہے تو کہاں ہے شیشہ
دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ

کہنے لگے کہ کدھر پھیر تلب ہے بہکا اے مست
دل ہی سارے تھے یہ اک وقت میں جو کرے گداز
اب کیسا چاک چاک ہو دل اس کے ہجر میں
ذکر گل کیا ہے صبا اب کے خزاں میں ہم نے
کس کو ہر دم ہے لہو رونے کا ہجراں میں دماغ
تابِ دل صرف جدائی ہو چکی
جلایا شب اک شعلۂ دل نے ہم کو
طاقت دل برنگ نکہتِ گل
کہاں کا غبار آہ دل میں یہ تھا
تکلیف نالہ مت کر اے دردِ دل کہ ہوں گے
ان دلوں نکلے ہے آغشتہ بخوں رات کو
خرابی کچھ نہ پوچھو ملکتِ دل کی عمارت کی
دل تھا جو پکا پھوڑا بسیاریٔ الم سے
گرمی نے دل کی ہجر میں اس کے جلا دیا
میر جب سے گیا ہے دل تب سے
اب ضعف سے ڈھتا ہے بیتابیٔ شتابی کی
اب سوزِ محبت سے سارے جو پھپھولے ہیں
کب تھا یہ شورِ نوحہ ترا عشق جب نہ تھا
کتنے پیغام چمن کو ہیں سو ہیں دل میں گرہ
کتنے دل سوختہ ہم جمع ہیں اے غیرتِ شمع
تھی آبلۂ دل سے ہمیں تشنگی میں چشم
پژمردہ اس کلی کے تئیں واشدن سے کیا
اب دل کو آہ کرنی ہی صبح و مسا لگی
دل کو گئے ہی یاں سے بنی اب کہ ہر سحر
بیتابی و شکیب و صبر حاصلِ کلام
مدد مجھ نفس سے غیر کہ پھر جی ہی سے گیا
گو دکس دل جلے کی ہے یہ فلک

ہر طرح کا جو تو دیکھے ہے کہ یاں ہے شیشہ
شکل شیشے کی بنائی ہے کہاں ہے شیشہ
گنفواں تو لختِ دل سے نکلتی ہے میری آہ
دل کو ناچار لگایا ہے خس و خار کے ساتھ
دل کو اک ربط سا ہے دیدۂ خونبار کے ساتھ
یعنی طاقت آزمائی ہو چکی
کہ اس تند سرکش میں خو تھی کسو کی
پھیر اپنے مکان پر آئی
مری خاک بدلی سی سب چھا گئی
رنجیدہ راہ چلتے آزردہ ہم نشیں بھی
دھن ہے نالہ کو کسو دل میں اثر کرنے کی
غموں نے آج کل سنیو وہ آبادی سی غارت کی
دُکھتا گیا دوچنداں جوں جوں دوا لگائی
شاید کہ احتیاط سے یہ تپ بگڑ گئی
میں تو کچھ ہو گیا ہوں سودائی
اس دل کے تڑپنے نے کیا خانہ خرابی کی
ہے شکل مرے دل کی سب شیشہ حبابی کی
دل تھا ہمارے آگے تو ماتم سرا نہ تھی
کسو دن ہم تئیں بھی بادِ سحر آ دے گی
کر قدم رنجہ کہ مجلس ہے یہ پروانوں کی
پھوٹا تو نہ آیا نظر اک بوند بھی پانی
آہِ سحر نے دل پہ عبث التفات کی
پژمردہ اس کلی کے تئیں بھی ہوا لگی
کوچہ میں تیرے زلف کے آنے صبا لگی
اس دل مریضِ غم کو نہ کوئی دوا لگی
دل کو کسو ستم زدہ کی بددعا لگی
شعلہ اک صبح یاں سے اٹھتا ہے

خانۂ دل سے زینہار نہ جا
فرصت میں یک نفس کے کیا دردِ دل سنو گے
بات احتیاط سے کر ضائع نہ کر نفس کو
کیا کیا تعب اٹھائے کیا کیا عذاب دیکھے
بلا کا شکر کر اے دل کہ اب معلوم ہوتی ہے
نہیں خالی اثر سے تصفیہ دل کا محبت میں
ہدف اس کا ہوئے مدت ہوئی سینہ کو پیاب تک
کبکوں نے تیری چال جو دیکھی ٹھٹک گئے
کم ہیں شناسائے زرِ داغِ دل
آتشِ غم میں دل بھُنا شاید
نہیں اٹھتا دلِ محزوں کا ماتم
دِلا بازی نہ کر ان گیسوؤں سے
بے طاقتیٔ دل نے سائل بھی کیا ہم کو
پایا ہے نہ ہم نے دل گم گشتہ کو اپنے
کل صبح ہی مستی میں سرِ راہ نہ آیا
دل جو پڑ بے قرار رہتا ہے
جبر یہ ہے کہ تیری خاطر دل
دل کو مت بھول جانا میرے بعد
دل کو گو ہا تھ میں رکھواب تم
دل کھنچے جلتے ہیں سارے اس طرف
ترے دل جلے کو رکھا جس گھڑی
غارتِ دل کرے ہے ابرِ سیاہ
دہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے
بیکلی سے دلِ بیتاب کی مر گزرے تھے
بلا ہے ایسا طپیدن دل کہ صبر اس پہ ہے سخت مشکل
اس گلی کی زمینِ تفتہ سے
اس شہر دل کو تو بھی جو دیکھے تو اب کہے

کوئی ایسے مکاں سے اٹھتا ہے
آئے تو تم و لیکن وقتِ اخیر آئے
بالیدگیٔ دل ہے مانند شیشہ دم سے
تب دل ہوا ہے آشنا خوگر ترے ستم سے
حقیقت عافیت کی اس گلی کے رہنے والوں سے
کہ آئینہ کو ربط خاص ہے صاحب جمالوں سے
گھا نکلے ہے لختِ دل ترے تیروں کے بھالوں سے
دل ساکنانِ باغ کے تجھ سے اٹک گئے
اس کے پرکھنے کو نظر شرط ہے
دیر سے بُو کباب کی سی ہے
خدا ہی اس مصیبت سے نکالے
نہیں آساں کھلانے سانپ کالے
پر میر فقیروں کی یاں کون صدا مانے
خاک اس کی سرِ راہ کوئی کب تئیں چھانے
یاں آج مرا شیشۂ دل چوُر ہوا ہے
آج کل مجھ کو مار رہتا ہے
روز بے اختیار رہتا ہے
مجھ سے یہ یادگار رہتا ہے
کوئی یہ بے قرار رہتا ہے
کیونکہ کہیے حق ہماری اور ہے
دھواں سا اُٹھا کچھ لبِ گور سے
بے طرح گھر میں چور آیا ہے
ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے
سو تہِ خاک بھی آرام نہ پایا ہم نے
دماغ اتنا کہاں رہے گا کہ دست بر دل رہا کروگے
دل جلوں کا سراغ نکلے ہے
کیا جانئے کہ بستی یہ کب کی خراب ہے

مصائب اور تھے، پر دل کا جانا
عمر بھر ہم رہے شرابی سے
نالوں سے مرے رات کے غافل نہ رہا کر
گو دل ہے یہی مضطرب الحال تو اے میرؔ
دل کے معمورے کی مت کر فکر فرصت چاہیے
تنگ مت ہو ابتدائے عاشقی میں اس قدر
بے یار شہر دل کا ویران ہو رہا ہے
گر دل کی تاب و طاقت یہ ہے تو ہمنشیں ہم
فکر دہن میں اس کے کچھ بن نہ آئی آخر
گر دل کی بیقراری ہوتی یہی جو اب ہے
شاید کہ خونِ دل کا پنچا ہے وقتِ آخر
زلف کسی کی ہو کہ ہو خال و خط
رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے
کچھ نہ سمجھے کہ تجھ سے یاروں نے
ستم ہے تیری خوئے خشمگیں سے کچھ بھی دلجوئی
دی آگ دل کو محبت نے جب سے جلتا ہوں
مُوا ہوں ہو کے دلِ افسردہ رنج کلفت سے
ہزار حیف کہ دل خار و خس سے باندھے کوئی
مت کر زمینِ دل یوں تخمِ اُمید ضائع
حرم کو جائیے یا دیر میں بسر کریے
بھلے کو اپنے سب دوڑیں ہیں یہ اپنا بُرا چاہے
قرار دل کا یہ کاہے کو ڈھنگ تھا آگے
کب تلک گلیوں میں سودائی سے پھرتے رہیئے
نالے کا آج دل سے پھر لب تلک گزر ہے
ڈھایا جنھوں نے اس کو ان پر خرابی آئی
شب شمع پر پتنگے کے آنے کو عشق ہے
اخلاص دل سے چاہیئے سجدہ نماز میں

عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے
دل پُرخوں کی اک گلابی سے
اِک روز یہی دل میں ترے کام کریں گے
ہم زیرِ زمیں بھی بہت آرام کریں گے
لیکے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہیے
خیریت ہے میرؔ صاحب دلِ سلامت چاہیئے
دکھلائی دے جہاں تک میدان ہو رہا ہے
شام غم جدائی کیونکہ سحر کریں گے
اب یہ خیال ہم بھی دل سے اُٹھا رکھیں گے
تو ہم ستم رسیدہ کب ہے کو جینے پاتے
تھم جاتے ہیں کچھ آنسو آنکھوں میں آتے آتے
دل کو گرفتار ہوا چاہیئے
دل نے صدمے بڑے اُٹھائے تھے
کس توقع پہ دل لگائے تھے
دلآزاری کی باتیں کر تو دلداری کو کیا جانے
کہ جس طرح کسُو کا خانمان جل جاوے
اُگے ہے سبزۂ پژمردہ میری تربت سے
خزاں ہیں برق گرے آشیان جل جاوے
بوٹا جو یاں اُگا ہے سو اُگتے ہی جلا ہے
تری تلاش میں اک دل کدھر کدھر کریئے
چلن اس دل کا تم دیکھو تو دنیا سے نرالا ہے
ہمارے چہرے کے اوپر بھی رنگ تھا آگے
دل کو اس زلفِ مسلسل سے لگا بیٹھیں گے
ٹک گوش رکھیو ایدھر ساتھ اس کے کچھ خبر ہے
جانا گیا اسی سے دل بھی کسُو کا گھر ہے
اس دل جلے کی تاب کے لانے کو عشق ہے
بے فائدہ ہے ورنہ یوں جو وقت کھوئیے

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے
تمنائے دل کے لیے جان دی
دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج
کہیں جو تسلی ہوا ہو یہ دل
آزردہ دل الفت ہم چکے ہی بہتر ہیں
چھوڑے جاتے ہیں دل کو تیرے پاس
جا چکا دل تو یہ یقینی ہے
زخموں پہ زخم جھیلے داغوں پہ داغ کھائے
کام دل کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں کیونکہ بنے
غالب کہ یہ دل خستہ شب ہجر میں مر جائے
مت بیٹھ بہت عشق کے آزردہ دلوں میں
اب چاہتا نہیں ہے بوسہ جو تیرے لب سے
نہ پوچھو کہ احوال ناگفتہ بہ ہے
دلِ زخم خوردہ کے اور اک لگائی
تک ابرو کو میری طرف کیجیے مائل
رونے کی جگہ آہ کریے
صد کارواں وفا ہے کوئی پوچھتا نہیں
صورت جرس کی طرز بیاباں میں ہائے میرؔ
اسیری نے چمن سے میرے دل گرمی کو دھو ڈالا
ہمارے دل میں آنے سے تکلف اس کو بیجا ہے
برنگ بوئے غنچہ عمر اک ہی رنگ میں گزرے
بھرا ہے دل مرا جامِ لبالب کی طرح ساقی
لپیٹا ہے دل سوزاں کو اپنے میرؔ نے خط میں
حصول کام کا دل خواہ یاں ہوا بھی ہے
اداسیاں تھیں مری خانقاہ میں قابل سیر
کہاں تک آہ شب و روز دردِ دل کہیے
ہوس تو دل میں ہمارے جگہ کرے لیکن

زمیں سخت ہے آسماں دُور ہے
سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے
گرا گر یہ شیشہ تو پھر چُور ہے
وہی بے قراری بدستور ہے
سب رد اٹھے گی مجلس گر کرکے سخن بیٹھے
یہ ہمارا نشان ہے پیارے
کیا اب اس کا بیان ہے پیارے
یک قطرہ خون دل نے کیا کیا ستم اٹھائے
آئیے تا چند و ناامید پھر کر جائیے
یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے
نالہ کسو مظلوم کا تاثیر نہ کر جائے
جینے سے میرؔ شاید کچھ دل اٹھا رہا ہے
مصیبت کے مارے ہوئے دل کا اپنے
مداوا کیا خوب گھائل کا اپنے
کبھو دل بھی رکھیے لیجیے مائل کا اپنے
پھر دل میں ترے اثر نہ ہووے
گویا متاعِ دل کے خریدار مر گئے
تنہا چلا ہوں میں دلِ پرشور کو لیے
دگرنہ برق جاکر آشیاں میرا جلا آوے
یہ دولت خانہ ہے اس کا وہ جب چاہے چلا آوے
میسّر میرؔ صاحب گر دل بے مدعا آوے
گلے لگ خوب روؤں میں جو مینائے شراب آوے
الٰہی نامہ بر کو اس کے لے جانے کی تاب آوے
سماجت اتنی بھی سب سے کوئی خدا بھی ہے
صنم کدہ میں تو ٹک آکے دل لگا بھی ہے
ہر ایک بات کو آخر کچھ انتہا بھی ہے
کہیں ہجوم سے اندوہِ غم کی جا بھی ہے

صید افگنوں سے ملنے کی تدبیر کریں گے
فریاد اسیران محبت نہیں بے ہیچ
دل کی طرف کچھ آہ سے دل کا لگاؤ ہے
آہ یہ رسم دنا ہووے بر افتاد کہیں
دو سونپ دردِ دل کو میرا کوئی نشاں ہے
انجام دل غم کش کوئی عشق میں کیا جانے
ناصح کو خبر کیا ہے لذت سے غم دل کی
بے طاقتیٔ دل نے ہم کو کیا نہ رسوا
تا دم مرگ غم خوشی کا نہیں
دل میں ناسور پھر جدھر چاہے
رونا آتا ہے دم بدم شاید
نہ سجھے رحم نے اسے کچھ صبر
ہر چند ضبط کرئیے چھپتا ہے عشق کوئی
تم نے جو اپنے دل سے بھلایا ہمیں تو کیا
میرا جو بس چلے تو منادی کیا کروں
مشعر ہے اس پہ مردن دشوار رفتگاں
یہ راہ و رسم دل شدگاں گفتنی نہیں
پڑھایا اس کو بہتیرا کہ مت لا رازِ دل منہ پر
مر گئے ہم تو مر گئے ، تُو جیے
دلبرو دل چُراتے ہو ہر دم
بند ہو تجھ سے پھر کھلا نہ کبھو
دل میں اس شوخ کے نہ کی تاثیر
کہیے سو بار وہ گیا تو کیا
کرتا نہیں عبث تو پارہ گلو فغاں سے
شوخیٔ جلوہ اس کی تسکین کیونکہ بخشے
یہ دل عرش سے گزرے ہے ضعف میں بھی
واشد کچھ آگے آہ سے ہوتی تھی دل کے تئیں

اس دل کے تئیں پیش کش تیر کریں گے
یہ نالے کسو دل میں بھی تاثیر کریں گے
ٹک آپ بھی تو آئیے یاں زور باؤ ہے
اس ستم پر بھی مرا دل اسی کا ممنوں ہے
مَیں ہوں چراغ کشتہ باد سحر کہاں ہے
کیا جانیے کیا ہو گا آخر کو خدا جانے
ہے حق یہ طرف اس کے چکھے تو مزا جانے
ہے عشق سزا اس کی جو کوئی چھپا جانے
دل آزردہ گر سلامت ہے
ہر طرف کوچۂ جراحت ہے
کسو حسرت کی دل سے رخصت ہے
دل پہ میرے عجب مصیبت ہے
گزرے ہے دل پہ جو کچھ چہرے ہی سے عیاں ہے
اپنے تئیں تو دل سے ہمارے بھلائیے
تا اب سے کوئی دل نہ کسو سے لگا سکے
یعنی جہاں سے دل کو نہ آساں اٹھا سکے
جانے دے میر صاحب و قبلہ جدھر گئے
پہ طفل اشک کو دیکھا تو نا قابل ہے کیا جانے
دل گرفتہ تری بلا جانے
یوں کہیں اعتبار رہتا ہے
دل ہے یا خانۂ مقفل ہے
آہ نے آہ نارسائی کی
جس نے یاں ایک دل میں راہ نہ کی
گزرے ہے پار دل کے اک نالۂ حزیں بھی
آئینوں میں دلوں کے جو ہے بھی پھر نہیں بھی
یہ زور آوری دیکھو زاریٔ شب کی
اقلیم عاشقی کی ہوا اب بگڑ گئی

بغیر دل کے یہ قیمت ہے سارے عالم کی
صد حرف زیرِ خاک تہِ دل چلے گئے
خوباں تمہاری خوبی تا چند نقل کریے
بات احتیاط سے کر ضائع نہ کر نفس کو
دل دد ہو میرؔ صاحب اس بدمعاش کو تم
مطلق اثر نہ اس کے دل نرم میں کیا
سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
چمن یار تیرا ہوا خواہ ہے
کہو وادیِ عشق دکھلائیے
یہ وہ کارواں گاہِ دلکش ہے میرؔ
مول ہے بازار کا ہستی کے یہ
نہ کی نشوونما کامل نہ کام اپنا کیا حاصل
دو رنگی دہر کی پیدا ہے یاں سے دل اٹھا اپنا
چھاتی سراہ اُن کی پائیز میں جنھوں نے
وعدہ وعید پیارے کچھ تو قرار ہوئے
تم جو دل خواہ خلق ہو ہم کو

کسو سے کام نہیں رکھتی جنس آدم کی
مہلت نہ دی اجل نے ہمیں ایک بات کی
ہم رنجہ خاطروں کی کیا خوب دلبری کی
بالیدگی دل ہے مانندِ شیشہ دم سے
خاطر تو جمع کر لو ٹک قول سے قسم سے
ہر چند نالہائے حزیں عرش تک گئے
دگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے
گل اک دل ہے جس میں تری چاہ ہے
بہت خضر بھی دل میں گمراہ ہے
کہ پھر یاں سے حسرت ہی ہمراہ ہے
دل کے خریدار ہوا چاہیے
فلک کوئی بھی دل سے تخم کب بے وقت بوتا ہے
کسو کے گھر میں شادی ہے کہیں ہنگامۂ غم ہے
خار و خس چمن سے ناچار دل لگائے
دل کی معاملت ہے کیا کوئی خوار ہوئے
دشمنی ہے تمام عالم سے

دل

دیوانِ دوم

لگ جاوے دل کہیں تو اسے جی میں اپنےکہ
کب اس کا نام لیے غش نہ آگیا مجھ کو
موئے توہم پہ دلِ پُر کو خوب خالی کر
تلوار کے سایہ ہی میں تو کاٹے ہے دن میرؔ

غافل نہ سوزِ عشق سے ہو پھر کباب ہے
عشق ان شہری غزالوں کا جنوں کو اب کھنچا
مَیں جو کہا اک آگ سی سلگے ہے دل کے بیچ
دل فرطِ اضطراب سے سیماب سا ہوا
قصّہ تو مختصر تھا وے طول کر کھنچا

ہے کیمیاگرانِ محبت میں قدرِ خاک
طرفہ آتش خیز سنگستاں ہے دل
رہے نہ کیونکہ یہ دل باختہ سدا تنہا
تو کوئی روڈ ہی نسخہ ہے اے مفرحِ دل
ہوئے آخر کو سارے کام ضائع بے شکیبی سے

وہ شوخ ہم کو پاؤں تلے ہی مَلا گیا
ہم تو گمانِ دوستی رکھتے تھے پر یہ دل
وہ دل کہ تیرے ہوتے رہے تھا بھرا بھرا
مدّت ہوئی کہ دل سے قرار و سکوں گئے

اک آن اس زمانے میں یہ دل نہ وا ہوا
ظاہر کو گو درست رکھا مرکے میں پڑے
جوں صیدِ نیم کشتہ تڑپتا ہے ایک سا

رکھتا نہیں شگون کچھ اظہارِ عشق کا
دل ستم زدہ کس وقت اس میں جا نہ رہا
ہزار شکر کسُو سے ہمیں گلہ نہ رہا
کس دل زدہ کو ہووے ہے یہ ذوقِ فنا کا
گر لائحہ اس آگ کا لُک دل کو جا لگا

وحشت دل بڑھ گئی آرامِ جاں جم ہو گیا
کہنے لگا کہ یونہی کوئی دن تو جل پڑا
چہرہ تمام زرد زرِ ناب سا ہوا
ایجاز دل کے شوق سے التہاب سا ہوا
پر دقر کچھ نہیں ہے دلِ بے گداز کا
مقتبس یاں سے ہے شعلہ طوُر کا

کہ کوئی آوے کہاں مَیں تو گھر نہیں رکھتا
کہ طبعِ عشق میں ہرگنہ ضرر نہیں رکھتا
کوئی دن اوزنابِ ہجر دل لاتا تو کیا ہوتا

اس دل نے کس بلا میں ہمیں مبتلا کیا
دشمن عجب طرح کا بغل میں پلا کیا
اب اس دل کو دیکھیے تو ہے اک گھر خراب سا
رہتا ہے اب تو آٹھ پہرا اضطراب سا
کیا جانیے کہ میرؔ زمانے کو کیا ہوا
دل کا لگاؤ کوئی رہے ہے چھپا ہوا
کیا جانیے کہ دل کو مرے کیا بلا ہوا

کل دلِ آزردہ گلستاں سے گزر ہم نے کیا
وصل و ہجراں سے نہیں ہے عشق میں کچھ گفتگو
جوں ابرِ قبلہ دل ہے نہایت ہی بھر رہا
تسکینِ دل ہو تب کہ کبھو آ گیا بھی ہو
کاہے کو میں نے میرؔ کو چھیڑا کہ ان نے آج
دل دفعتہً جنوں کا مہیّا سا ہو گیا
ٹک جوش سا اٹھا تھا مرے دل سے رات کو
جلوہ ترا تھا جب تئیں، باغ و بہار تھا
عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
صد رنگ ہے خرابی کچھ تو بھی رہ گیا ہے
جب نالہ کش ہوا وہ تب مجلسیں رُلائیں
دردِ دل کو ہمارے ٹک دیکھو
ایک دل کو ہزار داغ لگا
کاہش کا مری اب یہ کیا تجھ کو تعجب ہے
کہہ دل کو گنوایا ہے یا رنج اٹھایا ہے
عزت و عشق کہاں جمع ہوئے ہیں ہمدم
دل نے خوش ہو عشقِ خوباں میں بھی کیا بسلے لیکن رنگ
اس راہزن سے مل کر دل کیونکہ نہ کھو بیٹھیں
کل صبح سیرِ باغ میں دل اور میرا رک گیا
وے دن گئے جو یاں کبھو اٹھتا تھا دل سے جوش سا
اڑتی ہے خاک یارب شام و سحر جہاں میں
اس صحن پر یہ وسعت اللہ رے تیری صنعت
غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے
دل نہ تھا ایسی جگہ جس کی نہ پھر سدھ لیتے
دل سے خوش طرح مکاں پھر بھی کبھو بنتے ہیں
ثابت ہے اس کے پہلو سے پہنچے ہے ہم کو رنج
دل دے کے ہم جو ہو گئے مجبور

گل کہنے لگے کہو منہ نہ ادھر ہم نے کیا
لاگ دل کی چاہیے ہے یاں قریب و دُور کیا
رونا مرا سنو گے کہ طوفان کر رہا
بوسوں سے اس کا آنا یہی صبح پر رہا
وہ دردِ دل کہا کہ مجھے دردِ سر رہا
دیکھی کہاں وہ زلف کہ سودا سا ہو گیا
دیکھا تو ایک پل ہی میں دریا سا ہو گیا
اس دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا
لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھنک گیا
کیا نقل کیجیے یارو دل کوئی گھر سا گھر تھا
تھا میرؔ دل شکستہ یا کوئی نوحہ گر تھا
یہ بھی پُرپیچ اب ہے کاکل سا
اندرونے میں جیسے باغ لگا
بیمارئ دل والا کوئی بھی بھلا دیکھا
اے میرؔ تجھے ہم نے کچھ آج خفا دیکھا
ننگِ خواری تھا اگر دل کا لگانا کیا تھا
چہروں کو غازہ ہوا ہونٹوں کو رنگِ پاں ہوا
انداز و ناز اپنے غمزہ اٹھائی گیرا
بلبل نہ بولا منہ سے کچھ گل کھل نہ مجھ سے وا ہوا
اب لگ گئے رونے جہاں پل مارتے دریا ہوا
کس کے غبارِ دل سے یہ خاکداں بنایا
معمار نے قضا کے دل کیا مکاں بنایا
وہ گنج کہ اس کنجِ خرابی میں نہاں تھا
اجڑی اس بستی کو پھر تو نے بسایا ہوتا
اس عمارت کو ٹک اک دیکھ کے ڈھایا ہوتا
دیکھا نہ دردِ دل کے کہے سر جھکا دیا
اس میں کیا اختیار ہے اپنا

طاقت دل تلک تعب کھینچے
نہیں رہتے عاقل غلاقے بغیر
کہتے نہ تھے میرؔ مت کڑھا کر
صد شکر کہ داغ دل افسردہ ہوا ورنہ
اس رخ سے دل اٹھایا تو زلفوں میں جا پھنسا
برسوں سے اپنے دل کی ہے دل میں یار سے
تشویش سے اب خالی کس دن ہے مزاج اپنا
خراب مجھ کو کیا دل کی لاگ نے ورنہ
گئے پہ تیرے نہ تھا کوئی ہم نفس اے گل
دل سے مت جا کر پھر وہ پچھتایا
دل میں رہا نہ کچھ تو کیا ہم نے ضبط شوق
دشمنو لیتے ہیں گے جیب ڈھب پھٹے ہے جیب
بلبل کی اور گل کی جو صحبت کی سیر میرؔ
دفتر لکھے ہیں میرؔ نے دل کے الم میں یہ
دل بے تاب و بے طاقت سے کچھ چلتا نہیں ورنہ
ربط دل زلف سے اس کی جو نہ چسپاں ہوتا
ہر سحر آئینہ رہتا ہے ترا منہ تکتا
دل میں کیا کیا تھا ہمارے جو نہ ہو جاتی یاس
دیکھے اس ماہ کو جو اتنے مہینے گزرے
کیا ہے جو راہ دل کی طے کرتے مر گئے ہم
آگاہی پائی ہم نے کھوئے گئے سے یعنی
لوگوں کا پاس ہم کو مارے رکھے ہے ورنہ
تلاشِ دل نہیں کام آتی اس زنخ میں گئے
اس مہ سے دل کی لاگ وہی متصل ہی
آزارِ دل نہیں ہے کشو دین میں درست
گئی نیند شیون سے بلبل کی رات
یہی جنس دل کی گراں قدر تھی

اب ستم تک سہا نہیں جاتا
کہیں میرؔ دل کو دوانے لگا
دل ہو گیا نہ گداز تیرا
یہ شعلہ بھڑکتا تو گھر بار جلا جاتا
القصہ اپنے روز کو ہم نے بھی شب کیا
اِک دن جدا نہ غیر سے ہم کو طلب کیا
اس دل کی خلش نے بھی کیا آہ خلل ڈالا
فقیر تکیے سے کب ہے کو یوں اٹھا کرتا
کبھو نسیم سے مَیں دردِ دل کہا کرتا
ہاتھ سے جس کے یہ مکان گیا
یہ شہر جب تمام لٹا تب نسق ہوا
بے طوریوں سے اس کی دل اپنا تو پھٹ گیا
دل اپنا دلبروں کی طرف سے اچٹ گیا
یاں اپنے طور و طرز میں وہ فرد ہو گیا
کمتر ابھی واں نہ جا کر ہیں اگر ہو اختیار اپنا
اس قدر حال ہمارا نہ پریشاں ہوتا
دل کی تقلید نہ کرتا تو نہ حیراں ہوتا
یہ جگر کاہے کو اس طرح سے ویران ہوتا
بڑھ گئی کاہش دل ایسی کہ بیمار کیا
جوں نقش پا ہمارا تا دیر اثر رہے گا
پہنچی خبر ادھر کی دل بے خبر رہے گا
ماتم میں دل کے شیون وہ دوپہر رہے گا
کر چاہ میں تو ہے مرنا بُرا شنادر کا
گو چرخ نے بصورتِ ظاہر جدا رکھا
کیا جانوں ان بتوں نے ستم کیوں روا رکھا
کہیں دل ہمارا گرفتار تھا
وے جب تک تو خریدار تھا

مجھے اے دل چاک کیا شانے سے
دل گیا مفت اور دکھ پایا
چاک کر سینہ، دل میں پھونک دیا
اندوہ وغم کے جوش سے دل رک کے خوں ہوا
سو بار اس کے کوچے تلک جاتے ہیں چلے
دل چلے جائیں ہیں خرام کے ساتھ
مَیں تو افسردہ ہر چمن میں پھرا
یہ چوٹ کھائی ایسی دل پر کہ جی گنوایا
باقی نہیں رہا کچھ گھلتے ہی گھلتے ہم میں
کس دن ملامت کی اس بت نے میرؔ ہم سے
عشق سے دل پہ تازہ داغ جلا
یوں پھر اٹھانہ جائے گا اے ابو وحشت سے
مَیں تو دیکھوں ہوں تمہارے منہ کو تم نے دل لیا
جس کو تم آسمان کہتے ہو
فلک نے بہت کھینچے آزار لیک
کل مَیں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا
یہ نقش دلوں پر سے جانے کا نہیں اس کے
پہنچایا مجھ کو عجز نے مقصودِ دل کے تئیں
خاطر اگر ہو جمع پریشانی بھی نبھے
بیچ سے کب کا گیا اب ذکر لب
یہ روش ہے دلبروں کی نہ کسی سے ساز کرنا
پایا مجھے رقیب نے آ اس کے زیر تیغ
کبھو بھی اس کو تہِ دل نہ ملتے پھر پایا
مدعی جھوٹے ہیں اک آن میں اب تو دلدار
وارد گلشن غزل خواں جب وہ دلبریاں ہوا
کتنوں کے دل بے جا ہوئے کتنے نہ جانے کیا ہوئے
جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی سے نکلتا

کسی زلف سے کچھ سروکار تھا
ہو کے عاشق بہت مَیں پچھتایا
کھینچے ایذا ہمیشہ کس کی بلا
اب کے مجھے بہار کے آگے جنوں ہوا
دل ہے اگر بجا تو یہ اضطراب کیسا
دیکھی چلنے میں ان بتوں میں ادا
غنچۂ دل مرا کہیں نہ کھلا
یعنی جدائی کا ہم صدمہ بڑا اٹھایا
بیماریٔ دلی نے چنگا بہت بنایا
سختی کھینچے نہ کیونکر پتھر سے دل لگایا
اس سیاہ خانے میں چراغ جلا
گر کوئی روتے بیٹھ گیا دل بھرا ہوا
تم مجھے رہتے ہو اکثر مجلسوں میں گھور کیا
سو دلوں کا غبار ہے اپنا
نہ پہنچا بہم اس دلآزار سا
دل نے جگر کی اور اشارت کی یاں گرا
عاشق کے حقوق اگر ناحق بھی مٹا جانا
یعنی کہ اس کے در ہی پہ مَیں ناتواں گرا
سو دل تو وہ طرف تری زلفوں میں بٹ گیا
اس دلِ مرحوم کا مغفور کا
کوئی خاک سے ہو یکساں وہی ان کو ناز کرنا
دل خواہ بارے مدعی کا مدعا ہوا
فریب تھا وہ کوئی دن جو ہم سے یار رہا
مہر جب رسم تھی یارب وہ زمانہ کیا تھا
دامن گل گریۂ خونیں سے سب افشاں ہوا
چلنے میں اس کے دو قدم ہنگامہ اک برپا ہوا
ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

عشق کو بیچ میں یارب تو نہ لایا ہوتا
سوزِ دروں سے آخر بھسمنت دل کو پایا
دریا دلی جنہیں ہے نہیں ہوتے کاسہ لیس
سخت ہم کو میرؔ کے مرجانے کا افسوس ہے
الکھیلی سی کی بھی دل اس کی تاب نہیں لاتا
یاروں نے اٹھ کے مرنے سے میرے کیا خطاب
کہاں سے نکلی یہ آتش نہ مانتا تھا میں
نالۂ بلبل بے دل ہے پریشان بہت
اب رفتگی روّیہ اپنا کیا ہے میں نے
پندگو مشفق عبث میرا نصیحت گر ہوا
قریب خط کا نکلنا ہوا سو خط موقوف
نہ ٹھہرا مرے پاس دل ورنہ اب تک
اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب
سنبھلتے سے دل کے گزر جائیں سو کہاں
در ہوں جلتا ہے دل بے طور اب
زخم دل خاطر ہو پہنچاتا جگر
زردئی رنگ ہے غم پوشیدہ پہ دلیل
تھا گوش زد کہ گوروں میں لگ لگ اٹھے ہے آگ
سن سوزِ دل کو میرے بہت روئی رات شمع
جیسا مزاج میرا تھا پہلے وہ کب ہے اب
عشاق کے تئیں ہے عجز و نیاز واجب
ٹک دل کے نسخے ہی کو کیا کر مطالعہ
مجنوں نے ریگِ بادیہ سے دل کے غم گنے
گزرے ہے میرؔ لوٹتے دن رات آگ میں
زباں خامہ کے ہلتے ہی ہزاروں اشک گرتے ہیں
حق و ملک زمین و فلک سب نکل گئے
دیکھنے والے ترے دیکھے ہیں سب جلے اشک شمع

یا تنِ آدمی میں دل نہ بنایا ہوتا
اس آگ نے بھڑک کر دربست گھر جلایا
دیکھا ہے واژگوں ہی پیالہ حباب کا
تم سے دل پھر گیا وہ جان سے آخر گیا
کیا پگڑی کے پیچ میں بالوں کو بل ڈالا
روتے تھے ہم تو دل ہی کو توجہ بھی کمو رہا
شروعِ ربط میں اس کے جو دل جلا کرتا
موسم گل نے مگر رحلت سفر یاد کیا
میرا یہ ڈھب دلوں میں کچھ راہ کرے گا
سختیاں جو میں بہت کھینچیں سو پتھر دل ہوا
غبار دور ہو کس طور میرے دلبر کا
اسے ایسا ہی میں تو جانباز کرتا
مجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب
بلبل بے گوکی نالہ سرائی تمام شب
دیکھئے کیا گل کھلے ہے اور اب
تم لگے کرنے ہماری غور اب
دل میں جو کچھ ہے منہ سے ہمارے عیاں ہے لب
یاں دل بھرے ہوئے کے سبب ہے کفن میں آب
بیرونِ بزم لاگے ہیں بھر بھر لگن میں آب
ہر روز دل کو سوز ہے ہر شب تعب ہے اب
ہے فرضِ عین رونا دل کا گداز واجب
اس درس گاہ میں حرف ہمارا ہے اک کتاب
ہم کیا کریں کہ غم میں ہمارے تو بے حساب
ہے سوزِ دل سے زندگی اپنی ہمیں عذاب
حقیقت اپنے دل کی آہ کیا ارقام کر ئیے اب
بارگرانِ عشق و دلِ ناتواں ہے اب
جوں چراغِ وقف دل سب کا جلا کرتا تھا رات

دیکھ خالی جا کہیں گے برسوں اہلِ روزگار
آزردہ دل کو حرف پہ لانے کا لطف کیا
دل کی ویسی ہے خرابی کثرتِ اندوہ سے
ہم تجھ سے چشم رکھتے تھے دلداریاں بہت
یہ کس آشفتہ کی جمعیتِ دل تھی منظور
ہمنشیں جا بیٹھ محنت کش کوئی دل چاہیے
دل کھو گیا ہوں میں نہیں دیوانہ پن کے بیچ
کیا جانے دل میں چاہتے تھے کیا کیا دمِ وصال
عشق ہے جس سے تر اس سے تو رکھ دل کو جمع
یہ شورِ دلخراش کب اٹھتا تھا باغ میں
نقشہ الٰہی دل کا مرے کون لے گیا
پیچ سا کچھ ہے کہ زلف و خط سے ہے ایسا بناؤ
تجھ بن اے نوبہار کے مانند
کوئی بھیجے کلی تو لالہ کی
برق تڑپی بہت دلے نہ ہوئی
آنکھ آئینہ رُو چھپاتے ہیں
لوہو آنکھوں میں اب نہیں آتا
سب پریشاں دلی میں شب گذری
قصرِ جناں تو ہم نے دیکھا نہیں جو کہیے
آغشتہ خونِ دل سے سخن تھے زبان پر
کیا کہیے دل کا حال جدائی کی رات میں
دل لے چکے دکھا کے رُخِ خوب کو تبھی
اس دل لگے کے روگ کو نسبت مرض سے کیا
بے بس ہے میرؔ تجھ بن رہتا نہیں دل اس کا
اس کی زیادہ گوئی سے دل داغ ہو گیا
یا دل وہ دیدنی تھی جگہ یا کہ تجھ بغیر
واہ کیا یہ دل لگی ہے فنا میں کہ رفتگاں

میرؔ اکثر دل کا قصہ یاں کہا کرتا تھا رات
کرتی جو خونچکاں مرے لب سے گزار بات
جیسے رہ پڑتا ہے دشمن کا کہیں لشکر بہت
سو التفات کم ہے دل آزاریاں بہت
بال بکھرے تیرے منہ پہ کہیں ہیں رات کی بات
عشق تیرا کام ہے تو ہے بغل پہ وہ بہت
تم بھی تو دیکھو زلفِ شکن در شکن کے بیچ
مقصود اس کا تھا ہمہ حسرت کفن کے بیچ
زندگی کی نہیں امید اس آزار کے بیچ
سیکھی ہے عندلیب نے ہم سے فغاں کی طرح
کہتے ہیں ساری عرش میں ہے اس مکاں کی طرح
ہے دلِ صد چاک میں بھی وہ سب شانے کی طرح
چاک ہے دل انار کے مانند
اس دلِ داغ دار کے مانند
اس دل بے قرار کے مانند
دل کو لے کر مکر گئے شاید
زخم اب دل کے بھر گئے شاید
بال اس کے بکھر گئے شاید
شاید نہ ہووے دل سا کوئی مکاں زمیں پر
رکھے نہ تم نے کان ٹک اس داستان پر
گزری ہے کب کہانی کہے سے یہ شب ہے اور
اب منہ چھپا جو بیٹھے یہ حسنِ طلب ہے اور
اپنا یہ جلتے رہنا ہے کچھ اور، تب ہے اور
تو بھی تو اے ستمگر جور و ستم کو بس کر
شکوہ کیا جب ان سے تب ان نے کہا کچھ اور
اب دیکھتا نہیں ہے کوئی اس مکاں کی اور
منہ کر کے بھی نہ سوئے کبھو پھر جہاں کی اور

ٹک سامنے ہو اکہ نہ ایمان نہ دین و دل
نہ دیکھی ایک وا شد اپنے دل کی اس گلستاں میں
وے دن گئے کہ طاقتِ دل کا تھا اعتماد
گو دل دھسک ہی جاوے آنکھیں اُبل ہی آویں
ہے خلش کیونکر نہ ہو گرم سخن گلزار میں
یہ دلبری کے فن و فریب اتنی عمر میں
کیا نسبت اس کے قامت دلکش سے سرو کو
یاں میرؔ ہم پہنچ ہی گئے مرگ کے قریب
سو عقدے فرطِ شوق سے پیش آئے دل کو یاں
خط نمودار ہوئے اور بھی دل ٹوٹ گئے
تم نے تو قدر کی ہے متاعِ وفا کی خوب
عزت نہیں ہے دل کی کچھ اس دلربا کے پاس
خندہ و چشمک و حرف و سخن زیرِ لبی
دل کو یوں لیتے ہیں کھٹکا نہیں ہونے پاتا
کیا جانے قدر غنچۂ دل باغبان پسر
اقلیم حسن سے ہم دل پھیرے چلے ہیں
کیا کہیے کیا رکھے ہیں ہم تجھ سے یار خواہش
کس اعتبار دل کے تئیں گل کہے ہیں لوگ
فرصت مرض سے دل کے ہمیں کب ہوئی تنک
مطلق ادھر نہیں ہے اس دلربا کی خواہش
وہ شوخ دشمنِ جاں لے دل تو اس کا خواہاں
میرے بھی حق میں کر ٹک ہاتھوں کو میرؔ اونچا
قلب یعنی کہ دل عجب زر ہے
دل کا دیتا ہے سہل کیا اے میرؔ
دل کی گرہ میں غنچۂ لالہ کے رنگ میرؔ
میلانِ دل ہے زلف سیاہ فام کی طرف
دل اپنا عدلِ داورِ محشر سے جمع ہے

کافر کو بھی نہ اس سے ابھی دو چار کر
کھلے پائے ہزاروں غنچۂ دلگیر بھی آخر
اب یوں کھڑے کھڑے نہ مرا امتحان کر
سب آمیچ پیچ کی ہے ہموار تیری خاطر
تھی قفس میں ہوس کہ میرا تھا دلوں میں خار خار
جھنجھلاہٹ اب تو آوے ہے اس کے سیاں پر
انداز اس کا اور کچھ اس کی ادا کچھ اور
واں دلبروں کو ہے وہی قصدِ جفا ہنوز
واں بند اس قبا کے نہیں ہوتے وا ہنوز
یہ بلا ہیکلی نئی زلفِ شکن دار کے پاس
پہنچیں گے اب یہ جنس کشو دل شناس پاس
رہتی ہے آرسی ہی دھری خود نما کے پاس
کہیے جو ایک دو افسونِ ہوس دلدار کے پاس
تربیت پائی ہے تم نے کشو عیار کے پاس
ہوتی گلابی ایسی کشو میرزا کے پاس
کیا کریئے یاں نہیں ہے جنسِ وفا کی خواہش
یک جان و صد تمنا یک دل ہزار خواہش
مجھ پاس تو مندی ہی کلی سا رہا ہمیشہ
تھوڑی بہت چلی ہی گئی ہے دوا ہمیشہ
کیا جانیے کہ یار دکیلا ہے خدا کی خواہش
کرتا ہے کوئی ظالم ایسی بلا کی خواہش
رکھتا ہے اہل دل سے ہر اک دعا کی خواہش
اس کی نقادی کو نظر ہے شرط
عاشقی کرنے کو جگر ہے شرط
سوزِ دروں سے کچھ نہیں ہے اب سوائے داغ
جاتا ہے صید آپ سے اس دام کی طرف
کرتا ہے کون عاشقِ بدنام کی طرف

دل پک رہے ہیں جن کے انھیں سے ہمیں ہے شوق
دلخواہ کوئی دلبر ملتا تو دل کو دیتے
خواری کا اپنی موجب ہے اضطراب ہر دم
اس پردے میں غم دل کہتا ہے میر اپنا
پھر کہیں کیا دل لگایا میر جب ہے زرد رُو
اس رشکِ مہ کے دل میں نہ مطلق اثر کیا
جو آرزو کی اس سے سو دل ہی میں خوں ہوئی
خوں ہوتے ہوتے ہو چلے آخر کہاں تلک
شاید کہ سر نوشت میں مرنا ہے گھٹ کے میر
ہے غبار اس کے خط سے دل میں بہت
ابرِ بہار نے شب دل کو بہت جلایا
طاقت ہو جس کے دل میں وہ دو چار دن رہے
چلی ہے باغ کی ہوا کیا خاک
بلا شور ہنگامہ ہے دل زدوں کا
دل تنگ ہو بہتے تو نہ ملیے کسو کے ساتھ
ہے گداز دل نہیں امکان رونا اس قدر
رونق تھی دل میں جب تئیں بستے تھے دلبراں
کیا عشق خانہ ساز کے دل میں چھپی ہے آگ
جل جل کے سب عمارتِ دل خاک ہو گئی
پوشیدہ کیا رہے ہے قدرت نمائیے دل
ہے تیرہ یہ بیاباں گرد و غبار سے سب
اندوہِ غم سے اکثر رہتا ہوں میں مکدر
پیش آوے کوئی صورت منہ موڑتے نہیں ہے
اس دام گہ میں اس کے سارے فریب ہی ہیں
گر رنگ بے چلا ہے اد لوٗ بھی تو ہوا ہے
ہوا دل عشق کی سختی سے ویراں
مدت تو وا ہوا ہی نہ یہ غنچہ وار دل

میلانِ طبع کب ہے کسو خام کی طرف
گر چاہنے میں ہوتا کچھ اختیارِ عاشق
دل سمجھے تو رہے بھی کچھ اعتبارِ عاشق
کیا شعر و شاعری ہے یار و شعارِ عاشق
منہ پر آیا تھا تب سے دو چار دن سے تو رنگ
ہر چند پہنچی میری دعا آسمان تک
نومید یوں بسر کرے کوئی کہاں تلک
اب دل جگر کہیں نہیں ہیں تیرے ہم شریک
کاغذ نہ محرمِ غم دل نے قلم شریک
باہم اب ہووے گی صفا کیا خاک
تھا برق کا چمکنا خاشاکِ آشیاں تک
ہم ناتوانِ عشق تمہارے کہاں تلک
دل جلا کوئی ہو گیا کیا خاک
قیامت کہیں جائے ہے اس کے گھر تک
ہوتے ہیں ایسے وقت میں یہ لوگ کم شریک
تہ کو پہنچو خوب تو پردہ ہے چشم گریہ ناک
اب کیا رہا ہے اُٹھ گئے سب اس مکاں کے لوگ
اک سارے تن بدن میں مرے پھک رہی ہے آگ
کیسے جگر کو آہ محبت نے دی ہے آگ
دیکھی نہ بستوں میں زور آزمائیے دل
دے راہ کب دکھائی بے رہنمائیے دل
کیا خاک میں ملی ہے میری صفائیے دل
آئینہ ساں جنھیں ہے کچھ آشنائیے دل
آتی نہیں نظر کچھ مجھ کو رہائیے دل
کہہ میر اس چمن میں کس سے لگائیے دل
ملائم چاہیے تھا یاں کا عالم
اب جو کھلا ہے جیسے گل بے بہار دل

ظالم بہت ضرور ہے ان بے کسوں کا پاس
داخل یہ اضطراب تنک آہیوں میں ہے
ہے غم میں یاد کس کی فراموش کار دل
دشوار ہے ثبات بہت ہجرِ یار میں
وہ کون سی امید بر آئی ہے عشق میں
تم پر تو صاف میری کدورت کھلی ہے آج
ہم سے جو عشق کشتہ جئیں تو عجب ہے میرؔ
کیونکہ گردِ علاقہ بیٹھ سکے
دل بجا ہو تو میرؔ کچھ کھادیں
نہ ٹک لا سکا تاب جلوے کی دل
تکلیف دردِ دل کی نہ کر تنگ ہوں گے لوگ
سوکھ غم سے ہوئے ہیں کانٹا سے
ہے تہ دل بتوں کا کیا معلوم
کس طور کوئی تجھ سے مقصود کرے حاصل
کیا سلاہیں ہم اپنی جنس کو لیک
ہوتا ہے شوق وصل کا انکار سے زیاد
دل جو پانی ہو تو آئینہ ہے رُوئے یار کا
تم دل سے جو گئے سو خرابی رہی بہت
بیٹھنے سے کشو دل صاف کے سر مت تو چڑھے
بس چلے تو رہ ادھر کی مَیں نہ جاؤں لیک میرؔ
رو دیں اس اضطرابِ دلی کو کہاں تلک
رووں تو آتشِ دل شمع نمط بجھتی نہیں
دل پریشانی مجھے دے ہے بکھیرے گل کے رنگ
کیا کو فتیں اٹھائیں ہجراں کے دردو غم میں
ہے گلی دل ہی کی تماشا تھی
داغ رہنا دل و جگر کا دیکھ
سن شور کل قفس میں دل داغ سب ہوا ہے

ناچار اپنے رہتے ہیں جو مار مار دل
رکتی نہیں ہے برق ہی کچھ بے قرار دل
اب آبنی ہے جی پہ رہا درکنار دل
یاں چاہیے ہے دل سو کہاں میرے یار دل
رہتا ہے کس امید پہ امیدوار دل
مدت سے ہے ملال کے زیرِ غبار دل
چھاتی ہے داغ ٹکڑے جگر کے فگار دل
دامنِ دل جھٹک رہے ہیں ہم
کڑھنے پچنے میں اشتہا معلوم
گر رکھتے ہیں صبر و طاقت سے ہم
یہ بات روز کہتے رہے ہمنشیں سے ہم
پر دلوں میں کھٹک رہے ہیں ہم
نکلے پردے سے کیا خدا معلوم
نے رحم تیرے جی میں نہ دل میں ترس ظالم
دل عجب ہے متاع جو تو تم
کب تجھ سے دل اٹھاتے ہیں تیری نہیں سے ہم
خانہ آبادی سمجھ اس خانہ ویرانی کے تئیں
پھر بھی بساؤ آکر اس اُجڑے نگر کے تئیں
خوب سا کرتے ہیں تامل تو اتر پانی میں
دل مرا رہتا نہیں ہر چند سمجھاتا ہوں مَیں
دن رات ہم کو ایک دم آرام بھی نہیں
مجھ کو لے جا کے ڈبو دیویں گمر پانی میں
آپ کو جوں غنچہ کیونکر آہ مَیں یک جا کروں
تڑپا ہزار نوبت دل ایک ایک دم میں
برق میں ایسے اضطراب کہاں
جلتے ہیں اس طرح کباب کہاں
کیا پھول گل کھلے ہیں اب کی بہاریں یاں

امیدِ دل وہی جن سے تھی وے آزار کرتے ہیں

الف کی رمز اگر سمجھا اٹھا دل بحثِ علمی سے
بلا آفت ہے کچھ دل پر کہ ایسا رنگ ہے ان کا
دیکھیاں بجلیاں کمانوں کی بھی خم محراب میں
دل کو لکھوں ہوں آہ وہ کیا مدعا لکھوں

دل کی خواہش ہو کسو کو تو کمی دل کی نہیں
خاک یاں چھانتے ہی کیوں نہ پھرو دل کے لیے
باغ گو سبز ہوا اب سرِ گلزار کہاں
رسم کہن ہے دوستی ہوتی بھی ہے الفت . ہم
چمن میں چل کے بھرو تم گلوں سے جیب و کنار
کعبہ تعمیرِ دل کسو کو نہیں
منظرِ دیدہ قصرِ دل اے میرؔ
سوزِ دروں سے کیونکر میں آگ میں نہ لوٹوں
ازل میں ملا کیا نہ عالم کے تئیں
دل کی پامالی ستم ہے قہر ہے
کیا دلِ مجروح و محزوں کا گلہ
دیکھ کر سبزہ ہی خرم دل کو رکھ
بل دیکھے ایسے دلبر ہرجائی سے کوئی
دل جہاں کھویا گیا کھویا گیا پھر دیکھئے
دل کو لے کر صاف یوں آنکھیں بلاتا ہے کوئی
گفتگو اتنی پریشاں حالی کی یہ درہمی
یہ دل جو شکستہ ہے سو بے لطف نہیں ہے
دیکھے خوباں کے بجا دل نہیں رہتا ہرگز
فردوس ہو نصیبِ پدر آدمی تھا خوب
تک دل کی بیقراری سے جاتے ہیں جی چلے
کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کر چلا بیخود خمِ زلفِ درازِ دلبراں

بہت پرہیز کر ہم سے ہمیں بیمار کرتے ہیں
اسی اک حرف کو بوسوں سے ہم تکرار کرتے ہیں
کسو بے مہر کے تئیں میرؔ شاید پیار کرتے ہیں
پر دلوں کو کھینچتے ہیں جیسے وے ابرو کہاں
دیوانے کو جو خط لکھوں بتلاؤ کیا لکھوں

اب بھی جنس بہت ہے پہ خریدار کہاں
ایسا پہنچے ہے ہم پھر کوئی غمخوار کہاں
دل کہاں وقت کہاں عمر کہاں یار کہاں
میں کشتنی ٹھہرا جو ہوں کیا دل لگایا ایک میں
ہم اپنے دل ہی کے ٹکڑوں سے گل بداماں ہیں
ایسی ویسی بنائیں کیا کیا ہیں
شہرِ تن میں بھی جائیں کیا کیا ہیں
جوں شیشۂ حبابی سب دل پہ کھلے ہیں
قضا نے یہی دل دلایا ہمیں
یوں کوئی ڈلتا ہے آخر دل ہے میاں
ایک غمگیں دوسرے گھائل ہے میاں
مزرعِ دنیا کا یہ حاصل ہے میاں

بے جا نہیں ہے دل جو ہمارا بجا نہیں
کون مرتا ہے جئے ہے کون ناپیدا ہو میاں
تب تلک ہی لطف ہے جب تک کہ کچھ پردا ہو میاں
میرؔ کچھ دل تنگ ہے ایسا نہ ہو سودا ہو میاں
ٹھہر دکھ لی دم آن کے اس لٹتے مکاں میں
لوگ جو کچھ انھیں کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
دل کو دیا نہ ان نے کسو خوش پسر کے تئیں
ہر دم طپش ، سراہیے مرے جگر کے تئیں
کچھ طرز ایسے بھی نہیں ایہام بھی نہیں
دور کا در پیش اے میرؔ اب سفر آیا ہمیں

کس کنے جاؤں الٰہی کیا دوا پیدا کروں
کاشکے دل تو دو ہوتے عشق میں
اس ڈھنگ سے ہلا کہ بجا دل نہیں رہے
ان دلبروں کی آنکھ نہیں جلتے اعتماد
سو رنگ وہ ظاہر ہوا کوئی نہ جاگہ سے گیا

گِلہ عشق کا یارو خلقت سے ہے
دل ہے کے کیسے کیسے جھگڑے مچادے ہیں
پانچوں حواس گم ہیں ہر اک کے اس سمے میں
سُٹھے ڈالے ہے دل کوئی عشق میں
دل لگے اتنے جہاں میں کس لیے
ہو تم جو میرے حیرتیٔ فرطِ شوقِ وصل
رنگ اور بُو تو دلکش و دلچسپ ہیں کمال
اس کے دل میں کام کرنا کام ہے
مدت سے تمہارا کب ادھر کو تہِ دل ہے
نہ اک دم صبح تک بھی آنکھ لگنے دے گا دل جلتا
کیا اس کے گئے ہے ذکر دل کا
کاہش دل بھی دوچنداں کیوں نہ ہو
دل گر ان جامہ زیبوں کو دیا ہے میرؔ نے
طنز ہیں عبث کرو ہو غش رہنے پر ہمارے
مطلبِ عمدہ ہے دل سے تو رکھو
نہ تو طالع نہ جذب پھر دل کو
طول رکھتا ہے دردِ دل میرا
نہ دل سے جا خدا کی تجھ کو سوگند
علاقہ دل کا لکھوائے گا دفتر ہا تجھ سے میرے
زنہار تیرے دل کی توجہ ہو نہ ادھر
تم اے نازک بُتاں ہو وہ کہ سب کے
ایسا ہی اس کے گھر کو بھی آباد دیکھیو

دل تو کچھ دھنسکا ہی جاتا ہے الٰہی کیا کروں
ایک رہتا ایک کھوتے عشق میں
اس گوش کے گہر سے دم آئے ہیں ناک میں
جب تک رہیں یہ چاہیئے پیش نظر رہیں
دل کو جو میرے چوٹ تھی طاقت نہ لایا ایک ہیں

حجم دل کی کچھ انتہا ہی نہیں
بد وضع یاں کے لڑکے کیا خوش معاملے ہیں
کیا میرؔ جی ہی تنہا ان روزوں وہ دنلے ہیں
یہ کیا روگ یارب لگایا ہمیں
رہ گزر ہے یہ تو کیا منزل ہے میاں
کیا جانو دل تمہارا کسو سے لگا نہیں
لیکن ہزار حیف کہ گل میں وفا نہیں
یوں فلک پر کیوں نہ جا اے آہ تو
کاہے کو تضنع سے یہ باتیں بناتے ہو
یہی پھر میرؔ سا سرگرم آہِ سرد ہوگا تُو
ویراں پڑا ہے یہ مکان تو
آنکھ میں آوے نہ دو دو ماہ تو

اس طرح پھرتے تھے وے چاک پیراہن کبھو
دو چار دن کسو سے دل کو لگا تو دیکھو
گاہ باشد تم کو بھی مطلوب ہو
کس بھروسے پہ ٹک تحمل ہو
لکھنے بیٹھوں تو خط ترسّل ہو
خدائی میں اگر ایسا مکاں ہو
تجرد کے جریدوں میں قلم سا فرد ہوگا تُو
آگے ترے ہم کاڑھ رکھیں گے جگروں کو
تمنائے دل و آرام جاں ہو
جس خانماں خراب کا یہ دل مشیر ہو

پُرخوں ہمارے دل سے کتنی ہے تو مشابہ
سختیاں دیکھیں تو ہم سے چند کھنچواتا ہے عشق
آزار کھینچنے کے مزے عاشقوں سے پوچھ
طرز سخن تو دیکھ ٹک اس بدمعاش کی
پُرپیچ وتاب دود دل اپنا ہے جیسے زلف
خطرہ بہت ہے میر رہِ صعب عشق میں
کیا وجہ کہیں خوں شدن دل کی پیارے
دل دینے سے اس طرح کے جی کاش کے دیتے
عنایت ازلی سے جو دل ملا مجھ کو
رہا تھا خوں تئیں ہمرہ سو آپ ہی خوں ہے حیف
ہوا ہوں خاک پہ دل کی وہی ہے ناصافی
دل کھول کے بل چلئے جو میرؔ سے ملنا ہے
تسکین دل کے واسطے ہر کم بغل کے پاس
مت التیام چاہے پھر دل شکستگاں سے
ٹھہراؤ تم کو شوخی سے جوں برق ٹک نہیں
لا میری اور یارب آج ایک خوش کمر کو
بے رحم کو راہ دل یار میں بارے
گئے وے سلیقے سارے خصوصیت رہی پیارے
جنوں میں سخت ہے اس زلف سے علاقۂ دل
چاہت میں دخل دے مت زنہار آرزو کو
کب تک وفا کرے گا یہ حوصلہ ہمارا
بننے کے دردِ دل کو کوئی نہیں پہنچتا
کیا وسوسہ ہے مجھ کو عزت سے جیسے کایاں
دقت کٹ جنے کے ہاتھ دل پر رکھ
کھینچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ
اس کی برہم زنیٔ مژگاں سے
کام کو مشکل دلِ پُرآرزو نے کر دیا

شاید کلی تجھے بھی اس گل کی آرزو ہو
دل کو ہم نے بھی کیا ہے اب تو پتھر ہو سو ہو
کیا جانے وہ کہ جس کا کہیں دل لگا نہ ہو
دل داغ کس طرح سے ہمارا بھلا نہ ہو
جب اس طرح سے جل کے درد نہ کباب ہو
ایسا نہ ہو کہیں کہ دل و دیں کو کھو رہو
دیکھو تو ہو آئینہ میں جنبش لب کو
یوں کھینچے کوئی کب تئیں اس رنج وتعب کو
محلِ شکر کہ آتا نہیں گلہ مجھ کو
رفیق تجھ سا ملے گا کہاں دلا مجھ کو
ابھی اس آئینہ کی کمی ہے جلا مجھ کو
آنکھیں بھی دکھاتے ہو پھر منہ بھی چھپاتے ہو
انصاف کریئے کب تئیں مخلص حقیر ہو
ممکن نہیں کہ شیشہ ٹوٹا ہوا رفو ہو
ٹھہرے تو ٹھہرے دل بھی مرا نکلے جو رہو
قدرت سے اس کے دل کی کل پھیر دے ادھر کو
جا گہ نہیں یاں ورنہ کہیں اس کے غضب کو
کبھو در تک تو آ بارے ہمارے دل کی تسکین کو
خوش آگیا ہے نہایت یہ سلسلہ مجھ کو
کر دے ہے دل کی خواہش بیمار رفتہ رفتہ
دل پیسے درد اکثر غم جی سے ملے ہمیشہ
ہر ایک بے حقیقت یاں ہے خدا رسیدہ
نکلا نہ میرے دل سے یہ خار نا خلیدہ
جان جاتی ہے نہ آہ کے ساتھ
ہے مزاجوں میں اپنے سودا کچھ
دل میں اب خار خار سا ہے کچھ
یاس کلی ہو چکی تو پھر نہیں اشکال کچھ

دل ترا آیا کسو کے پیچ میں جو شدہ گئی
ہم سے دیکھا کہ محبت نے ادا کیا کیا کی
دل ُسکا اس کنج لب سے دسے ہے نشاں
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو
اپنا بھی جی اسیر تھا آواز عندلیب
رہتی ہے چھت چڑھی ہی دن رات تیری صورت
دل بند ہے ہمارا موج ہوائے گل سے
دل بھی جلتا نہیں جدا دل سے
حسن سے دو دل نہیں خالی
دل کا جانا آج کل تازہ ہوا ہو تو کہوں
شوق دل ہم ناتوانوں کا لکھا جاتا ہے کب
لوہو پانی ایک دونوں نے کیا میرا ندان
بگڑتی ہی گئی صورت ہماری
قاصد کے تضع نے کیا دل کے تئیں داغ
متاع دل اس عشق نے سب جلا دی
دلیل اس بیاباں میں دل ہی ہے اپنا
اپنے ہی دل کا گنہ ہے جو جلاتا ہے مجھے
بن آہ دل کا رکنا بے جا نہیں ہمارا
بیان دل کے بھی جلنے کو کہیے مجلس میں
سختی بہت ہے پاس و مراعات عشق میں
خالی کروں ہوں راتوں کو رو رو کے دل تئیں
بے رحم وہ جو تجھ پاس لگا بیٹھنے جب دیر
دل اور عرش دونوں پہ گویا ہے ان کی سیر
ساتھ سونا جو گیا اس کا بہت دل تڑپا
مرا دل پیر و مرشد ہے مجھے ہے اعتقاد اس سے
نزاکت جیسی ہے ویسا ہی دل بھی سخت ہے اس کا
بھلا بس گھٹ کے مرئیے کب تلک دل خوں ہوا سارا

حصل بکھرے رہا کرتے ہیں تیرے بال کچھ
ایک دل قطرۂ خوں نس پہ جفا کیا کیا کی
بات لگتی تو ہے ٹھکانے کی
شہر دلی میں ہے ہر پاس نشانی اس کی
دل میں چبھا کی رات کو جوں نوک خار کی
صفحے پہ میں نے دل کے تصویر کیا نکالی
اب کی جنوں میں ہم نے زنجیر کیا نکالی
دُور مجھ سے کباب ہے وہ بھی
زلف پُر پیچ و تاب ہے وہ بھی
گزرے اس بھی سلنے کو ہمنشیں مدت ہوئی
اس تلک آپ ہی پہنچنے کی اگر طاقت ہوئی
یعنی دل لوہو ہوا سب چشم سیلانی ہوئی
گئے پر دل کے پھر کچھ بن نہ آئی
بے تاب مجھے دیکھ کے کچھ بات بنائی
کوئی دن ہی میں خاک سی سب اڑا دی
نہ خضر و بلد یاں نہ رہبر نہ ہادی
کس کو لے مریئے یہاں اور کسے تہمت دیجے
کیا حال ہووے اس کا جس کو ہوا نہ پہنچے
اچھلنے کو نے کو ترک اگر سپند کرے
پتھر کے دل جگر ہوں تو کوئی وفا کرے
انصاف کر کہ دن کوئی یوں کب تلک بھرے
ہم میر سے دل اپنا اٹھائے تھے تب ہی سے
کرتے ہیں باتیں میر جی کس کس مقام سے
برسوں پھر میر یہ پہلو نہ لگے بستر سے
فراموش آپ کو کرنا محبت میں ہے یاد اس سے
اگر یہ شیشۂ جاں ہے پہ بہتر ہے جدا اس سے
جو کوئی دادگر ہووے تو کہیے جا کے داد اس سے

کبھو میں عین رونے میں جگر سے آہ کرتا ہوں
دیوانگی میں گاہ ہنسے گاہ رو چکے
کہتا ہے میر سا تجھ ہی سے کج درد دل
اس چمن میں جا نکلتے ہیں تو جی لگتا نہیں
اس آستاں کی دُوری اس دل کی ناصبوری
کتنے روزوں سے نہ سونے کے ہیں نہ کھانے کے
اس باغ بے ثبات میں کیا دل صبا لگے
حرص و ہوا سے پاک رہے دل تو خوب ہے
کب تلک احوال یہ جب کوئی تیرا نام لے
پہلوئے عاشق نہ بستر سے لگے تو ہے بجا
اب دل نالاں پھر اس زلف سیہ میں جا چکا
دل کی آسائش نہیں امکان زلفِ یار میں
جیسے اندوہِ محرّم عشق میں کب دل ملے
دل دھڑکے ہے جلتے کچھ بت خانے سے کعبہ کو
ہے محو رخ اپنا تو آئینہ میں ہر ساعت
اے کاش قصہ میرا ہر فرد کو سنا دیں
شورش کدۂ عالم کہنے ہی کی جاگہ تھی
دل تو ہے عبث نالاں یاران گزشتہ بن
دل جا وے ہے جوں رو کے شبنم نے کہا گل سے
خط رسم زمانہ تھی ہم نے بھی لکھا اس کو
عزلت نشیں ہوئے جب دل داغ ہو گیا تب
کیا معاش اس غمکدہ میں ہم نے کی دس دن بہم
دل شتاب اس بزم عشرت سے اٹھایا چاہیے
ہے عزم جزم ترک و تجرد کا گر بنے
ان دنوں رنگ اور کچھ ہے اس دل پرُ خوں کا
دل کے ویراں کرنے میں بیداد کی ہے تو نے ہائے
رات دن رخسار اس کے چت چڑھے رہتے ہیں میر

کہ دل اُٹھ جائیں یاروں کے ہوائے زندگانی سے
وحشت بہت تھی طاقتِ دل ہائے کھو چکے
ایسی کہانی گرچہ نندھی ہے تو سو چکے
پھول گل سے میر اس بن دل بہت بہلا چکے
کیا کہیے آہ غم سے گھر کے ہوئے نہ در کے
دل جو یہ ہے تو ہم آرام نہیں پانے کے
کیا کیا نہال دیکھتے یاں پاؤں آ لگے
ہے قہر اس کلی کے تئیں گر ہوا لگے
عاشق بے تاب دونوں ہاتھ سے دل تھام لے
دل سی آفت ہو بغل میں جس کے کیا آرام لے
آج یہ بیمار دیکھیں کس طرح سے شام لے
یہ شکار مضطرب ہے دم نہ زیرِ دام لے
عید سی ہو جائے اپنے ہاں لگے جو تو گلے
اس راہ میں پیش آوے کیا ہم کو خدا جانے
صورت ہے جو کچھ دل کی سو تیری بلا جانے
تا دل کسو سے اپنا کوئی نہ یاں لگاوے
دل کیا کرے جو ایسے ہنگاموں میں پھنس جاوے
ممکن نہیں اب ان تک آوازِ جرس جاوے
اب ہم تو چلے یاں سے رہ تو جو رہا چاہے
تہ دل کی لکھے کیونکر عاشق جو لکھا چاہے
یعنی کہ عاشقی میں ہم گھر جلا کے بیٹھے
اٹھ کے جس کے ہاں گئے دل کا لیے ماتم گئے
ایک دن تہ کر بساطِ ناز جایا چاہیے
کیا اس جہانِ سفلہ سے دل کو لگائیے
حق میں میرے آپ ہی کچھ سوچ کر فرمائیے
خوش عمارت ایسے گھر کو اس طرح سے ڈھائیے
آفتاب و ماہ سے دل کب تلک بہلائیے

روئیے کیا دل و جگر کے تئیں
خرابی دل کی کیا انبوہِ دردو غم سے پوچھو ہو
شکست اس رنگ آئی بیخودی عشق میں دل پر
پھرتے ہو میر صاحب سب سے جُدے جُدے تم
دلِ بے تاب آفت ہے بلا ہے
دل میں پھرتے ہیں خط و خال و زلف
برچھیوں میں کہیں نہ بٹ جاوے
ٹک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ
کئی برسوں جگر ہی کا لہو اپنا پیا ہے
کس غم میں مجھ کو یارب یہ مبتلا کیا ہے
ان چار دن سے ہوں میں افسردہ کچھ وگرنہ
دل مرا مضطرب نہایت ہے
پیٹ لینا سر لیے دل کے شروعِ عشق تھا
سکھے تا چند خیال اس سرِ پرُ شور کا میر
میں روؤں تم ہنسو ہو کیا جانو میر صاحب
کثرتِ پیکاں سے تیری ہوگئی ہیئت ہی اور
نوحہ کر کر مجھ کو دکھلایا غم دل نے ندا ان
گلی میں اپنی قدغن کر رکھو آنے نہ پاؤں میں
ایسا نہ ہوا ہوگا کوئی واقعہ آگے
نہ چھوٹا دل میں کچھ اس کے گئے پہ غارت غم
ہوئی ہے دل کی محویت سے یکساں یاس غم و فرقت
آتش سی پھنک رہی ہے سارے بدن میں میرے
دیدنی ہے شکستگی دل کی
دل سے نزدیک اور اتنا دور
ہم کو تو دردِ دل ہے تم زرد کیوں ہوئے
خط افشاں کیا خونِ دل سے تو بولا
ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن

جی بھی یاں سے تو ہائے جاتا ہے
وہی حالت ہے جیسے شہر لشکر لوٹ جاتا ہے
نشے میں مست سے جیسے کہ شیشہ ٹوٹ جاتا ہے
شاید کہیں تمہارا دل ان دنوں لگا ہے
جگر سب کھا گیا اب کیا رہا ہے
مجھ کو اک سر ہزار سودا ہے
دل صنوفِ شہرہ میں تنہا ہے
دل بھی دامن وسیع صحرا ہے
تب دل کے تئیں خوگر اندوہ کیا ہے
دل ساری رات جیسے کوئی مَلا کیا ہے
پھوڑا سا دل بغل میں برسوں جلا کیا ہے
رنج و حرماں کی یہ بدایت ہے
سینہ کوبی متصل ہے اب یہ ماتم اور ہے
دل تو کانپا ہی کرے ہے کہ مبتو نازک ہے
دل آپ کا کسو سے شاید لگا نہیں ہے
اب مشرف دل کو ہمارے پارۂ آہن پہ ہے
شیون اب موقوف یاروں کا مرے شیون پہ ہے
کہیں کیا اور بھی دل کے لگانے کی منادی ہے
اِک خواہش دل ساتھ مرے جیتی گڑی ہے
ہزار افسوس کیا بستی محبت نے لُٹادی ہے
نہ ماتم مرنے کا ہے میر نہ جینے کی شادی ہے
دل میں عجب طرح کی چنگاری آپڑی ہے
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
کس سے اس کو کچھ آشنائی ہے
کیا میر جی تمہیں کچھ بیماری ہو گئی ہے
بہت اب تو رنگین انشا کرے ہے
سینے میں جیسے کوئی دل کو مَلا کرے ہے

کیا چال یہ نکالی ہو کر جواں تم نے
ربط دل کو اس بُت بے مہر کینہ ور سے ہے
کیا کہیں دل کچھ کھنچے جاتے ہیں ادھر ہر گھڑی
کار دل اس مہ تمام سے ہے
جل گیا دل مگر ایسی جو بلا نکلے ہے
سارے دیکھے ہوئے ہیں دلی کے عطار و طبیب
دیسا بے جا نہیں دل میرؔ کا جو رہ نہ سکے
ہیں دل گداز جن کے کچھ چیز مال وے ہیں
سارے دکھوں کی لے دل ہو جائے گی تلافی
خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب
مہر کی اس سے توقع غلطی اپنی تھی
عزم ہے جزم کہ اب کی حرکت شہر سے کر
سب چلتے ہیں دیر رہے میرؔ دل زدہ
نمار گیری سے زمانے کی نہ دل کو جمع رکھ
صنوبر آدمی ہو تو سراپا بار دل لادے
جب تلک دہتا بنا دل تنگ غنچے سے رہے
اب کی گل ہم بے پروں کی اُور چشمک زن ہے نور
دلوں کو کہتے ہیں ہوتی ہے راہ آپس میں
دل صد چاک باب زلف ہے لیک
کیا صید کی تڑپ کو اٹھائے دماغ یار
تو دو قدم جو راہ چلا گرم اے نگار
وہ نسخہ جو دیکھا بڑھا روگ دل کا
اس دام گاہ میں ہم جوں صید نیم بسمل
اگرچہ سادہ ہے لیکن ربودن دل کو
داغ پیسے سے جو ہیں بلبل کے دل پر کس کے ہیں
پہنچ کر تہ کو ہم تو محض محرومی ہی پاتے ہیں
خوبی و دلکشی میں صد چند ہے تُو اس سے

اب جب چلو ہو ٹھوکر دل کو لگا کرے ہے
کیا کہوں میں آہ مجھ کو کام کس تیتر سے ہے
کام ہم بے طاقتوں کو عشقِ زور آور سے ہے
کاہش اِک، روز مجھ کو شام سے ہے
جیسے لُوں چلتی مرے منہ سے ہوا نکلے ہے
دل کی بیماری کی کس پاس دوا نکلے ہے
چلتا پھرتا کبھو اس پاس بھی جا نکلے ہے
ہوتے ہیں ملتفت تو پھر خاک زر بنے ہے
صحبت ہماری اس کی ٹک بھی اگر بنے ہے
ہر اک سے حال دل کا مدّت کہا زیاں سے
کہیں دل داری ہوئی بھی ہے کسو دلبر سے
ہو جے دل کھول کے ساکن کسو ویرانے کے
یارب کسو تو دوست کی اس کو دعا لگے
چال دیکھی اس کی ایسی ہے کہ جوں اجگر چلے
کہاں سے کوئی تازہ دل اسے ہر روز لا دیجے
دیکھئے کیا گل کھِلے گا اب گلستاں سے گئے
اور دل اپنا بھی جلتا ہے بہت پر دیکھئے
طریقِ عشق بھی عالم سے کچھ نرالا ہے
باد سی بندھ رہی ہے شانے کی
نازک بہت ہے طبع مرے دل شکار کی
مہندی کلک کی آگ دلوں میں لگا چلی
طبیبِ محبت نے کیسی دوا دی
تڑپے بہت پہ تُو نے کب دل لیا پیارے
ہزار پیچ کرے لاکھ لاکھ فند کرے
یوں تو اے گل ہیں ہزاروں آشنا دکے تیرے
مرادِ دل کو پہنچا ہو گا کوئی نامراد اس سے
تیرے مقابلے کو کس منہ سے ماہ نکلے

کیا بد بلا ہے لاگ بھی دل کی کہ میرؔ جی
آزار دہ دلوں کا جیسا کر تو ہے ظالم
جو ہاتھ چڑھا اس کے دل خوں ہی کیا اس کا
کس دل میں خوبرویوں کی خالی نہیں جگہ
جگہ افسوس کی ہے بعد چندے
چلتا نہیں ہے دل پر کچھ اس کے بس وگرنہ
باریک وہ کمر ہے ایسی کہ بال کیا ہے
اب دیکھ کر قرار کیا گر وصال کا
گدا شاہ دونوں ہیں دل باختہ
جُوں آرسی کرے ہے منہ دیکھنے کی باتیں
وابستگی مجھ سے شیشہ جاں کی
منہ جن نے میرا دیکھا اک آہ دل سے کھینچی
جس مرض میں کہ جان جاتی ہے

دامن سوار لڑکوں کے ہو کر نفر رہے
اگلے زمانے میں بھی کیا یار ایسے ہی تھے
اس پنجۂ رنگیں کی اے میرؔ نہ گہ بیٹھے
مغرور اپنی خوبی کے اُوپر بجا ہیں یہ
ابھی تو دل ہمارا بھی بجا ہے
عرش آہ عاجزاں سے اکثر ہلا کیا ہے
دل ہاتھ جو نہ آوے اس کا خیال کیا ہے
دل کو بغیر تیرے تنک بھی قرار ہے
عجب عشق بازی کا دستور ہے
دل کی توجہ اس کی ہمدم ادھر کہاں ہے
اس سنگ سے ہے بس کہ دل شکن ہے
اس دردِ عاشقی کی آیا دوا نہیں ہے
دلبروں ہی کی وہ جدائی ہے

دِل

دیوانِ سوم

اس سرے دل کی خرابی ہوئی اے عشقِ دریغ
دین و دل کے غم کو آساں ناتواں میں لے گیا
ذکرِ دل جانے کا وہ پُرکینہ سُن کہنے لگا
دل ٹوٹ گیا تو خوں نہ نکلا
تھا نزع میں دستِ میرؔ دل پر
بُشرے کی اپنے رونق اے میرؔ عارضی ہے
دل اگر کہتا ہوں تو کہتا ہے وہ یہ دل ہے کیا
چوٹ میرے دل پہ ایسی ہے کہ ہوں میں دم بخود
مرثیہ میرے بھی دل کا رقّت آور ہے بلا
یہ جانتوں ہوں کہ دل کو ہے اس رُو و مُو سے لاگ
وہ دل نہیں رہا ہے تعب جو اُٹھائے گا
جلنے سے اس کے جل کے ہوئے خاک سنگ و خشت
چشم سے خوں ہزار نکلے گا
آندھیوں سے سیاہ ہو گا چرخ
عمر آوارگی میں سب گذری
کافرستاں ہے خط و خال و زلف
خوں ہوتی وہی دل میں ہی آزردگی میری
اب کی جو گل کی فصل میں ہم کو جنوں ہوا
حیف میں اس کے سخن پر ٹک نہ رکھا گوش کو
ہجر کی اک آن میں دل کا ٹھکانا ہو گیا
کل مکل بیتاب دل سے آج کل کی کچھ نہیں

تُو نے کس خانۂ مطبوع کو ویران کیا
یا محبت کہہ کے کہ یہ بارگراں میں لے گیا
یہ سُناتے ہو کسے؟ کیا مہرباں میں لے گیا
یہ شیشہ بہت ہی کم بغل تھا
شاید غم کا یہی محل تھا
جب دل کو خوں کیا تو چہرے پہ رنگ آیا
ایسے ناداں دلربا سے ملنے کا حاصل ہے کیا
وہ کشندہ یونہی کہتا ہے کہ تو گھائل ہے کیا
محتشم کو میرؔ میں کیا جانوں اور مقبل ہے کیا
کیا جانوں پیش آوے ہے اب صبح و شام کیا
یا لو ہو اشکِ خونیں سے منہ پر نہ آئے گا
بیتاب دل بہت ہے یہ کیا تاب لائے گا
کوئی دل کا بخار نکلے گا
دل کا تب کچھ غبار نکلے گا
کچھ ٹھکانا نہیں دل و جاں کا
وقر کیا ہے دلِ مسلماں کا
کس روز گلہ اس کا مرے تا بلب آیا
وہ دل کہ جس پہ اتنا بھروسا تھا خوں ہوا
یوں تو ناصح نے کہا تھا دل نہ دیوانے لگا
ہر زماں ملتے تھے باہم سو زمانہ ہو گیا
ہمیں تو اس غمکش کو بے کل ہی سدا پاتا رہا

غضب کچھ شور تھا سر میں بلا بے طاقتی جی میں
سرگزشت اپنی سبب ہے حیرتِ احباب کی
میرؔ کو کتنے دنوں سے رہتی تھی بے طاقتی
وہ کم نماد دل ہے شائق کمال اس کا
بس ہو تو دام کر بھی اس پر نثار کر دیے
مستانہ ساتھ تیرے روتی پھرے ہے بلبل
دل رات دن رہے ہے سینے میں عشق کرتا
تکلیف باغ ہم کو یاروں نے کی دگرنہ
کرتا ہے وے سلوک اب جس سے کہ جان جاوے
دل نے کیا کیا نہ رات درد دیے
دل ہی مرغ چمن کا ٹوٹ گیا
دل عجب چرچے کی جاگہ تھی سو ویرانہ ہوا
کیا حال کہیں دل زدہ جا کر اپنا
دوریِ یار میں ہے حالِ دل ابتر اپنا
یک گھڑی یار نہیں ہم سے ہوا صاف کبھو
کس طرح حرف ہو ناصح کا مؤثر ہم میں
دل بہت کھینچتی ہے یار کے کوچے کی زمیں
کیا میرؔ دل شکستہ بھی وحشی مثال تھا
مَیں جو کہا کہ دل کو تو تم نے ہرا دیا
دل فقیری سے نہیں میرؔ کسو کا ناساز
دل عجب شہر تھا خیالوں کا
جی کو جنجال دل کو ہے الجھاؤ
تجھ سے بے مہر کے لگ لگنے نہ دیتے ہرگز
اب شہر خوش عمارتِ دل کا ہے خیال کیا
لازم پڑی ہے کسل دل کو فتادگی
سوجھا نہ چاہ میں کچھ برباد کر چکے دل
دیکھوں مَیں اپنی رات کو خوں ناب تھا سو تھا

قیامت لحظہ لحظہ تھی مرے دل پر جہاں بن تھا
جس سے دل خالی کیا وہ آہ بھر کر رہ گیا
رات دل تڑپا بہت شاید کہ مر کر رہ گیا
جو کوئی چاہے اس کو ظاہر ہے حال اس کا
یک نقدِ دل رکھے ہیں سو تو ہے مال اس کا
گل سے جو دل لگا ہے ابتر ہے حال اس کا
ہرچند چاہتا ہوں پر جی نہیں سنبھلتا
گل پھول سے کوئی دم اپنا ہے دل بہلتا؟
ہم میرؔ یوں نہ مرتے اس پر جو دل نہ جلتا
جیسے پکتا رہے کوئی پھوڑا
پھول گلچیں نے ہائے کیوں توڑا
جوشش غم سے جی جو بولا سو یہ دیوانہ ہوا
دل نہ اپنا ہے محبت میں نہ دلبر اپنا
ہم کو سو کوس سے آتا ہے نظر گھر اپنا
دل بھی جوں شیشۂ ساعت ہے مکدر اپنا
سختیاں کھینچتے ہی دل ہوا پتھر اپنا
لو ہو اس خاک پہ گرتا ہے مقرر اپنا
دنبالہ گردِ چشمِ سیاہِ غزال تھا
بولا کہ ذوق اپنا، ہمارا ہی مال تھا
خوش ہوا کتنا ہے یہ خانۂ ویراں اپنا
ٹوٹا مارا ہے حسن والوں کا
یار کے حلقہ حلقہ بالوں کا
زور چلتا اگر کچھ چاہ میں دل پر اپنا
ناگاہ آکے عشق نے مارا جلا گرا
بیمارِ عشق رہتا ہے اکثر پڑا گرا
میرؔ اندھے ہو رہے تھے اپنا بھی گھر نہ دیکھا
جی دل کے اضطراب سے بیتاب تھا سو تھا

انتہا شوق کی دل کے جو صبا سے پوچھی
عاشق ہے دل اپنا تو گلگشتِ گلستاں میں

مسکن جہاں تھا دل زدہ مسکیں کا ہم تو واں
دل کا الجھنا اپنا ایسا نہیں کہ سلجھے

شعلے جو مرے دل سے اٹھے ہیں سو نہ بیٹھیں
شعر کے پردے میں مَیں نے غم سنایا ہے بہت

وا نہیں ہوتا کسو سے دل گرفتہ عشق کا
ایسا خدا ہی جانے کہ ہو عرش یا نہ ہو

یہ تو کچھ آگے دشمنِ جانی کے ہے چلا
زخم جھیلے داغ بھی کھائے بہت

رک رہا ہے دیر سے تڑپا نہیں
کیوں نہ ہوں دوری میں ہم نزدیکِ مرگ

خدا جانیے ہووے گی کیا نہایت
دل ہے جدھر کو اودھر کچھ آگ سی لگی تھی

رک رک کے دل ہمارا بے تاب کیوں نہ ہووے
قدر تم گو نہ کرو میرے متاعِ دل کی

گر دل جلا بھنا یہی ہم ساتھ لے گئے
جانا نہ دل کو تھا تری زلفِ رسا کے بیچ

دل اس چمن میں بہتوں سے میرا لگا دے
ڈرتا ہوں چاکِ دل کو مرے پلکوں سے سیے

گرفتِ دل سے ناچاری ہے یعنی
پھنسا دل زلف و کاکل میں نہ پوچھو

ثباتِ قصر و دل و بام و خشت و گل کتنا
گزرتی ہے کیا میرؔ دل پہ ترے

چمن میں یار ہمیں لے گئے تھے وا نہ ہوئے
کب ان نے دل میں کر انصاف ہم پہ لطف کیا

تڑپے ہے دل گھڑی بھر تو پہروں رہے ہے غش
اک کفِ خاک گوئی ان نے پریشان کیا

جد دل کے کنارے کی تو بادہ و میدوں کا
کل دیر میرؔ میرؔ پکارے نہیں ہے اب

ہیں دامِ زلف میں ہم اس کے اسیر صاحب
بوسوں تئیں چھیڑ کا کرو تم ان پہ اگر آپ

مرثیے نے دل کے میرے بھی رلایا ہے بہت
ظاہرا غمگیں اسے رہنا خوش آیا ہے بہت

دل ٹوٹنے کی جا نہیں کیا اس مکاں کی بات
مَیں جانتا تھا ہو گا دل بے قرار دوست

دل لگا کر ہم تو پچھتائے بہت
عشق نے کیوں دل کو دی مہلت بہت

دل کو اس کے ساتھ تھی الفت بہت
اجل تو ہے دل کے مرض کی بدایت

اس پہلو پر جو لیٹے جل بل گئی ہے کروٹ
کثرت سے درد و غم کی رہتا ہے اس پہ جمگھٹ

جنس لگ جاوے گی یہ بھی کسو سرکار کے بیچ
تو آگ لگ اٹھے گی ہمارے کفن کے بیچ

دانستہ جا پڑے ہے کوئی بھی بلا کے بیچ
بوئے وفا نہ پائی کسو آشنا کے بیچ

نازک نظر پڑے ہے بہت اس رفو کی طرح
رہا ہوں بیٹھ مَیں بھی کر کے گھر بند

پڑا ہے ناگہ آ کر بند بر بند
عمارتِ دل درویش کی رکھو بنیاد

تو ہوتا ہے ہر لحظہ کچھ زرد زرد
ہمارے ساتھ رہی غم یہی دلِ ناشاد

وہی ہے خشم وہی یاں سے جا وہی بیداد
کیا جانوں آفت آئی کیا طاقت دلواں پر

پیس مارا دل غموں نے کوٹ کر
اے مرغِ چمن صبح ہوئی زمزمہ سرکر
ارمان ہے جنھوں کو وے اب کریں محبت
دل جو بجا نہیں ہے وحشی سا میں پھروں ہوں
دل کو تو لاگ ہی ہے میکوں راہ کب تلک

صاف غلطاں غش میں نخچیر یار
کا ہے کو اس قرار سے تھا اضطراب دل
کس کو فقیری میں سر و دل حرف کا ہے میرؔ
ٹھوکریں دل کو لگے ہیں جب چلے ہے راہ تو

کبھو دل کی نہ کہنے پائے اس سے
گل و گلزار سے کیا قیدیوں کو
نیں تو دریا پر کیا ترک خروش
ہے دل بے تاب کا بھی ویسا رقص
کہا درد دل وات کیا میرؔ نے
میرؔ . . دل نہ کہہ ظالم کہ بس
اب نہیں سینے میں میرے جائے داغ
دل لگا ہو تو جی جہاں سے اٹھا

عشق سے جا نہیں کوئی خالی
زخم تیغ یار غائر ہو کے پہنچا دل تلک
کیا جو افسردگی کے ساتھ کھلا

برق ابرِ بہار نے بھی لیے
چلیے بغل میں لے کے گلابی کشو طرف
نہ ٹک واشد ہوئی جب سے لگا دل
اٹھایا داغ لالہ نے چمن سے

ہمارا خاص مشرب عشق اس میں
سبھوں سے میرؔ بیگلنے سے رہتے
نہ اس سے یاں تئیں آیا گیا حیف

کیا اُجاڑا اس نگر کو لوٹ کر
دم کھینچے تہِ دل سے کوئی ٹکڑے جگر کر
ہم تو ہوئے پشیماں دل کے تئیں لگا کر
تم جائیو نہ ہرگز میرے دوانے پن پر
اس پر ہے یک عذاب شدید انتظار کا

لے گیا رنگ اس کے دل سے تیر یار
ہوتا ہے ہاتھ رکھنے سے دل بے قرار اور
کرتے ہیں اس دماغ پہ ہم انکسار اور
یہ خرام ناز ہے ظالم ٹک اپنی چال کر

جہاں بولے لگا کہنے کہ بس بس
ہمیں داغ دل و کنجِ قفس بس
دل کا دل ہی میں کھپائے اپنے جوش
رقص بسمل تم شنو ہو جیسا رقص
اٹھایا بہت اس کہانی سے حظ
ہو گیا ہے سامعوں کو تو صداع
سوزِ دل سے داغ ہے بالائے داغ
موت کا نام پیار کا ہے عشق

دل سے لے عرش تک بھرا ہے عشق
حیف میرے حال پر کرتے نہیں ٹک غور لوگ
دل گل بے بہار کے سے رنگ

اب دل بے قرار کے سے رنگ
دامان دل کو کھینچے ہے ساقی ہوائے گل
الٰہی غنچہ ہے پژمردہ یا دل
کروں کیا دیکھتے ہی جل گیا دل

پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل
جو ہوتا اس سے کچھ بھی آشنا دل
رہے ہم جب تلک اس میں رہا دل

ہمارے منہ پہ طفلِ اشک دوڑا
کیا ظلم تھے لباس میں اس تنگ پوش کے
یک بار ہوا دل کی تسلی کا وہ باعث
الجھاؤ دل کا جس سے جھنجھلا کے اس بغیر
بیماریٔ دل سے زار و نزار ہیں ہم
روتے ہیں یوں کہ جیسے شدّت سے ابر برسے
دل اب تو ہم سے بدیار اگر رہے جیتے
سخن مشتاق ہیں بندے کے سب لوگ
ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرے ہیں جتنے ہیں کیا نایاب میں ہیں
غفلت دل سے ستم گزرے ہیں سو مت پُوچھو
کیا ہے اضطرابِ دل نے کیا مجھ کو سبک آخر
ناصحِ مشفق تو کہتا تھا کہ اس سے مت ملے
دل کی دو اشک سے نہ نکلی بھڑاس
دل جو اکتا تک ہے یارب رہ نہیں سکتے کہیں
مضطرب ہو ایک دو دم تو تدارک بھی ہو کچھ
ظلم و ستم کیا جور و جفا کیا جو کچھ کہیے اٹھاتا ہوں
گھر سے اٹھ کر کونے میں بیٹھا بیت پڑھے دو باتیں کیں
ہائے سبک ہونا یہ میرا فرطِ شوق سے مجلس میں
صفائے دل جو ہو ٹک دیکھے ہیں کیا کیا
یہ بنا رہتی سی آتی ہے نظر کچھ یاں مجھے
وہ وزدِ دل نہیں تو کیوں دیکھتے ہی مجھ کو
دل کو آگ اک دم میں دے دی اشک ہوئے چنگاری سے
کہتے ہیں بہار آئی گل پھول نکلتے ہیں
اب ایک سی بے ہوشی رہتی نہیں ہے ہم کو
گل پھول سے اپنے دل تو نہیں لگتے ٹک[1]

کیا ہے اس بھی لڑکے نے بڑا دل
دل تنگی سے نکل گئے ہو کر فقیر ہم
یہ کیا کہ اسی طور پہ ہر بار رہو تم
جھگڑا کیا کرے ہیں زمیں آسماں سے ہم
اک مشتِ استخواں ہیں پر اپنے یار ہیں، ہم
کیا جانیے کہ کیسے دل کے بخار ہیں ہم
کشو سے ہم بھی دل پھر معاملہ نہ کریں
سرد دل کس کو ہے عشقِ خدا میں
دل کے پہلو سے تو ہم آتش میں ہیں اور آب میں ہیں
قافلے چلنے کو تیار ہیں ہم خواب میں ہیں
کہاں تک یار کے کوچے سے جا جا کر پھر آویں ہیں
پر سمجھتا ہے ہمارا یہ دلِ محزوں کہاں
ادسوں بُجھتی بھی ہے پیاس کہیں
کیا کریں جاویں کہاں گھر میں رہیں باہر رہیں
متّصل تڑپے ہے کب تک ہاتھ یہ دل پر رہیں
خفّت کھینچ کے جاتا ہوں رہتا نہیں دل پھر آتا ہوں
کس کس طور سے اپنے دل کو اس بن میں بہلاتا ہوں
وہ تو نہیں سُنتا، دل وے کریں ہی باتیں بناتا ہوں
ہم ایسے آئینہ کو اپنے کیوں جِلا نہ کریں
اچھی ہے تعمیر دل کی اس خراب آباد میں
پلکیں جھکا لیاں ہیں آنکھیں چُرا لیاں ہیں
کیا ہی شریر ہے شوخی برق بلائی ان نے شرارت میں
ہم کُنجِ قفس میں ہیں دل سینوں میں جلتے ہیں
کچھ دل بھی سنبھلتے ہیں پر دیر سنبھلتے ہیں
جی لوگوں کے بے جاناں کس طور بہلتے ہیں

---

[1] اپنے دل۔ جگر، سینہ، دماغ وغیرہ کے لیے جمع کا صیغہ اکثر استعمال ہوا ہے۔

دل عجب جنس گرانقدر ہے بازار نہیں
دل کے الجھاؤ کو کیا تجھ سے کہوں اے ناصح
کہن سالی میں شاہد بازیاں کب ہے کو زیبا تھیں
گرفتہ دل ہوں سیر انبساط مجھ کو نہیں
کرے گا کون قیامت میں ریسماں بازی
لعل ہم چھاتیوں پہ جڑ کے پھرے
جس کا خوباں خیال لیتے ہیں
دلبراں نقدِ دل کو عاشق کے
کیا اعتبار طائرِ دل کی تڑپ کا اب
تڑپے ہے متصل وہ کہاں ایسے روز و شب
گھبرا کے یوں لگے ہے سینے میں دل تڑپنے
جانکاہ ایسے نالے لو ہوسے تو نہ ہوویں
کیا میرؔ بس کرے ہے اب زاری آہ شب کی
کہیں میرؔ عشق مجازی ہے بد
ہم کو خرام ناز سے مت خاک میں ملا
وہ آپ چل کے آوے تو شاید کہ جی رہے
تکیے میں اپنے دل کا ہم غم کیا کریں ہیں
دل لشکر میں ایک سپاہی زادے نے ہم سے چھین لیا
چلتے ہیں یہ تو ٹھوکر لگتی ہے میرؔ دل پر
نہیں مجنوں سے دل قوی لیکن
شیخ جو تھا دیدار بتاں کا منکر ایسا تھا معذور
ہیں نرم نرم گو کہ کہنے کے تئیں ورنہ
زلف بل کھا رہی ہے گو اس کی
دل پھیرے ہم خانۂ زنجیر کے قریب
بلا زلف سیہ اس کی ہے پُر پیچ
یاں جیسے شمع بزم اقامت نہ کر خیال
جہاں دیکھو کہا کرتے ہیں اس کے عشق کے غم میں

دے بہا سہل جو دیتے ہیں خریدار نہیں
تو کسو زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں
دیا لڑکوں کو دل میں نے قیامت میں بھی ناداں ہوں
کسو سے شہر میں کچھ اختلاط مجھ کو نہیں
دل و دماغ گنوارے مزاج مجھ کو نہیں
اپنے خوں گشتہ دل کے ماتم میں
دل کلیجہ نکال لیتے ہیں
جان کر اپنا مال لیتے ہیں
مذبوحی سی ہے کچھ حرکت اس شکار میں
ہے فرق میرؔ برق و دلِ بے قرار میں
جیسے اسیرِ تازہ بے تاب ہو قفس میں
بے تاب دل کسو کا رکھا ہے کیا جرس میں
دل آگیا ہے اس کا ظالم کسو کے بس میں
حقیقت ہو معلوم گر دل لگائیں
دل سے ہے جن کو راہ یہ ان کا چلن نہیں
ہوتی نہیں تسلیٔ دل اب خبر سے یاں
درویش کتنے باتم باہم کیا کریں ہیں
ہم درویش طلب ہیں اس کے ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں
چالیں ہی دلبروں کی سب سے نرالیاں ہیں
یار اس ناتواں کے ہم بھی ہیں
دل کو بصیرت تھی نہ اس کے بے نوری تھی بصارت میں
پتھر ہیں انھوں کے دل کاہے کو پگھلتے ہیں
دل کو اپنے تو پیچ و تاب ہے یاں
تلک پہنچتا ہی ہے شکنِ زلفِ یار میں
وطن دل نے کیا ہے کس بلا میں
ہم دل کباب پردے میں سرگرم راہ ہیں
نہ ہم دو چار بیٹھے دل شکستے اپنے خالوں میں

اس کی گلی کی خاک سبھوں کے دامنِ دل کو کھینچے ہے
کیا کیا اپنے لوہو پئیں گے دم میں جئیں گے دم میں مر گئے
اب کی بہت ہے شورِ بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو
کیا جاتا ہے اس میں ہمارا چپکے ہم تو بیٹھے ہیں
تیرِ ستم اس دشمنِ جاں کا تا دو کماں پر جو نہ کہیں
غم کھاویں یا غصہ کھاویں یوں اوقات گزرتی ہے
دوست رکھتا جس بہت اپنے دلِ بیمار کو
تصفیے سے دل میں میرے منہ نظر آتا ہے لیک
غم کو تمہارے دل کے نہایت نہیں ہے میر
لاگ اگر دل کو نہیں لطف نہیں جینے کا
سارے بازارِ جہاں کا یہی محل ہے میر
کرنا شعار خوب ہے عجز و نیاز کو
جانکاہ و وظارش ہیں سارے ترے سلوک
دل ایک تڑپنے میں پورے عرش کے پایا
دل کو کہتے ہیں کہ اس گنجِ رواں کا گھر ہے
دلِ صد پارہ کو پیوند کرتا ہوں جدائی میں
تعجب ہے کہ دل اس گنجِ سرگشتہ میں رہتا ہے
زخموں پہ اپنے نون چھڑکتے رہا کرو
حاصل کوئی امید ہوئی ہو تو میں کہوں
صد چاک اپنے دل سے تو بگڑا ہی کی وہ زلف
بیتابئ دل افعئ خامہ نے کیا بکھی
ظاہر ہے دیکھنے سے گنہ کیونکر تیرے سب
بخت خفتہ سو دیں پر کچھ چونکتے سو دیں کہ میر
میر کو واشد نہیں ہے مقصد اس کا اور ہے
کیا اپنے دل دھڑکنے سے ہوں ہیں ہی دم بخود
دل خوں نہ ہووے کیونکر یکسر درائے الفت
رستے سے چاکِ دل کے ہو آگاہ

ایک اگر جی لے بھی گیا تو آتے ہیں مر جانے دو
دل جو بغل میں رہ نہیں سکتا اس کو کسی سے بکانے دو
دل کی ہوس کچھ ہم بھی نکالیں دھوویں ہم کو مچانے دو
دل جو سمجھنا تھا سو سمجھا ناصح کو سمجھانے دو
دل سے اور جگر سے اپنے ہمیں رکھے ہیں نشانے دو
قسمت میں کیا خستہ دلوں کے یہی لکھے تھے کھلنے دو
خوں کیا ہے بد تعیں اس میں غم بسیار کو
کیا کروں میں آئینہ ساں حسرتِ دیدار کو
اس قصے کو کرو گے بھی تم مختصر کبھو
اُلجھے سُلجھے کسو کاکل کے گرفتار رہو
جان کو بیچ کے بھی دل کے خریدار رہو
بے وقر جلتے ہیں دلِ بے گداز کو
دل ہم تو دیتے کاش کسو دل نواز کو
اس طائر بے بال کی پرواز تو دیکھو
اس خرابے میں کسے ہے وہ کرم کلبے کو
کرے سے ہے کہنہ نسخہ وصل جوں وصال مت پوچھو
خرابے جس سے یہ پلتے ہیں مالا مال مت پوچھو
دل کو مزے سے بھی تو ٹک آشنا کرو
خوں ہی ہوا کیے ہیں مرے دل کے سارے چاؤ
افسوس کیا ہے شاعر نے جو اس سے بے بناؤ
کاغذ کو شکلِ مار سراسر ہے پیچ تاؤ
چھپتے ہیں میر کوئی دلوں کے کہیں لگاؤ
ایک شب ہم دل زدوں سے وہ پری ہم خواب ہو
عشق سے لڑکوں کے دل کو کب تلک بہلائے وہ
جو دیکھتا ہے میرے تئیں سو وہم ہے کچھ
یا سابقے بہت سے تھے یا اس سے اب نہیں کچھ
یار تک پھر تو کس قدر ہے راہ

تیراس کا جو گزرا دل سے چلا جی بھی چلا
دوزخ میں میر ہوں میں یا بہشت زو بن
کس طرح تڑپے ہے کیا کیا جی گھٹا جاتا ہے ہائے
دل و دلی دونوں اگر ہیں خراب
ہم مرثیہ دل ہی کا اکثر کہا کرتے ہیں
خانہ خراب ہو خواہش دل کا آہ نہایت اس کو نہیں
اس دلبر بدظن سے خوش گزرے ہے عاشق کی
نہ ٹک واشد ہوئی دل کو نہ جی کی لاگ کچھ پائی
شب اگر دل خواہ اپنی بے قراری کیجئے
کرتی پھرے ہے رسوا سارے چمن میں مجھ کو
روتے ہے دل شب کے ترمیر کے کپڑے ہیں
تدبیر غم دل کی بستی ہی میں ٹھہرائی
خواہش ہو جسے دل کی دوں، اوراسے سربھی
گھر دل کا بہت چھوٹا پر جلئے تعجب ہے
عہد میں اس کی یاری کے خوں دل میں ہوئے کیا کیا چاؤ
میر نظر کی دل کی طرف، کی عرش کی جانب فکر بہت
سوز دروں سے آگ لگی ہے سارے بدن میں تب سی ہے
جمع کر دل میر سے تم بھی بیتابی تھی دل کو بہت
سوز دروں نے آخر جی ہی کھپا دیا ہے
اب نیند کیونکر آوے گر جی نے عاشقی کی
نادردمند بلبل نالاں ہے بے جہی سے
خون ہو کر بہہ گیا مدت ہوئی
ہے توکل جی سے ہم درویش ہیں
دوزخ میں ہوں جلتی جو رہے ہے چھاتی
اس کے پنجے سے دل نکل نہ سکا
کیا کہوں اس کی زلف بن رو رو
آتش عشق جس کے دل کو لگی

رسم تعظیم سے ہو لیتے ہیں مہماں کے ساتھ
جاں ہے ستم رسیدہ دل ہے عذاب دیدہ
ساتھ اس کے دل لگا ہو جس کسو کا وائے وہ
پہ کچھ لطف اس اجڑے گھر میں بھی ہے
اب کہ میے تخلص تو شائستہ ضمیری ہے
جاں لبوں پر آئی ہے پر، تو بھی گرم طلب سی ہے
نے زخم ہے خاطر میں نہ عذر پذیری ہے
رہے دس دن جو اپنی عمر کے یاں ہم سو مہماں سے
لے زمیں سے تا فلک فریاد و زاری کیجئے
گر کوئی بات دل کی بلبل سے میں کہی ہے
پر قدر نہیں اس کو اس جامۂ آبی کی
جنگل میں نکل آئے کچھ واں بھی نہ بن آئی
میں نے تو اسی دل سے تصدیع بہت پائی
عالم کو تمام اس میں کس طرح ہے گنجائی
خاک میں آخر ساتھ ہی میرے سب میرے ارمان گئے
تھی جو طلب مطلوب کی ہم کو کیدھر کیدھر دھیان گئے
طاقت دل کی تمام ہوتی ہے جی کی چال کڈھب سی ہے
اچھے کچھ آثار نہ تھے میں اس بیمار کو دیکھا ہے
ٹھنڈا دل اب ہے ایسا جیسے بجھا دیا ہے
دل ہے جدھر وہ پہلو سارا جلا دیا ہے
دل ہم کو بھی خدا نے درد آشنا دیا ہے
دل کو جو ڈھونڈو سو کیسا کس کنے
کر ہی چکتے ہیں جو کچھ دل میں ٹھنے
دل سوختگی عذاب روحانی ہے
زور بیٹھی ہی یار کی گہہ بھی
میں پراگندہ دل گیا بہہ بھی
شمع ساں آپ ہی کو کھاتا ہے

جی کھنچ گیا اسیرِ قفس کی فغاں کی اور
گئی ٹکڑے ہو دل کی آرسی تو
ہوئے ہیں دُود دل سے میرؔ کے تنگ
موسمِ گل تلک رہے گا کون
محبت میں کسو کی رنج و محنت سے گئے دونوں
خدا جانے کہ دل کس خانہ آباد اں کو دے بیٹھے
وصل یا ہجر کچھ ٹھہر جاوے
دل لگے پر رہا نہیں جاتا
حرکت دلوں کی اپنے مذبوحی سی رہے ہے
ہوتا تماشا گاہ ہے محسوس درد آگے
غمِ مرگ سے دل جگر ریش ہے
ایک دن ہو تو کریں احوال گیری دل کی آہ
ہوتا ہے دل کا حال عجب غم سے اس گھڑی
خوش طرح مکاں دل کے ڈھانے میں شتابی کی
سکے ہے دل ادھر کو بہتا ہے جگر ادھر
غمِ عشق ہے ناگہانی بلا
بہت میں لخت دل رویا مجھے اک خلق نے جانا
بے تابی جو دل ہر گھڑی اظہار کرے ہے
اس چاہ نے دل ہی کے تو بیمار کیے ہیں
دل عجب نسخۂ تصوّف ہے
نہ جرأت ہے نہ جذبہ ہے نہ یاری بخت بد سے ہے
دل اور جگر یہ تو جلے آتشِ غم میں
جہاں سے دل کو دیکھو منہ نظر جوں کان طاق آوے
دن فصلِ گل کے اب کی بھی جلتے ہیں باغ سے
دادِ رفتگانِ عشق بھی کیا طرفہ لوگ ہیں
کہئے تو کہئے بات کوئی دل کی میرؔ سے
بے طاقتیٔ دل سے مری جان ہے لب پر

تھی چوٹ اپنے دل کو گرفتار ہم ہوئے
ہوئی صد چند اس کی خود نمائی
پھر اس جوگی نے یاں دھونی رمائی
چبھتے ہی دل کو خار خار رہے
رہی شرمندگی ہی عمر بھر مجھ کو دل وجاں سے
کھڑے تھے میرؔ صاحب گھر کے دروازے پہ حیراں سے
دل کو اپنے اگر قرار رہے
رہے، اپنا جو اختیار رہے
اب وہ نہیں کہ دھڑ دھڑ رہتے ہیں دل دھڑکتے
اب دل جگر ہمارے پھوڑے سے ہیں پکتے
عجب مرحلہ ہم کو درپیش ہے
مر گئے ہم کب تلک تیمارداری کیجئے
کھٹک ہے جب وہ طنز سے ہم کو عجب ہیں یے
اس عشق و محبت نے کیا خانہ خرابی کی
چھاتی ہوئی میری دوکان کبابی کی
جہاں دل لگا کڑھنا جانکاہ ہے
ہوا ہے پہن میرا نام ان نگیں نگینوں سے
اب دیکھوں مجھے کس کا گرفتار کرے ہے
یہ دوستی ہی ہے جو گرفتار کرے ہے
ہم نہ سمجھے بڑا تاسف ہے
یہی بے طاقتی خوں گشتہ دل کو میرے کد سے ہے
جی کیونکہ بچاؤں کہو اس آگ کی تف سے
نہ کی کچھ قدر ان نے حیف اس آئینہ خانے کی
دل داغ ہو رہا ہے چمن کے سبھاؤ سے
دل کے گئے پہ دیتے ہیں جی کیسے چاؤ سے
پر جی بہت ڈرے ہے انھوں کے جواؤ سے
تم ٹھہرو کوئی دم تو مرا جی بھی ٹھہر جائے

خدا کرے مرے دل کو کچھ قرار آوے
کہ زندگی تو کروں جب تلک کہ یار آوے

رنگیں خرامی کیا کیا لیتی ہے کھینچ دل کو
کیا نقشِ پا کو اس کے نسبت گل و سمن سے

دل سوختہ ہوں مجھ کو تکلیف حرف مت کر
اک آگ کی لپٹ سی نکلے ہے ہر سخن سے

دل کی بیماری سے طاقت طاق ہے
زندگانی اب تو کرنا شاق ہے

بت کدے سے تو چلے کعبے وے
دس قدم ہم دل کو کر پتھر گئے

دل کا اسیر ہونا جی میرؔ جانتا ہے
کیا پیچ پانچ دیکھے اس زلفِ پُرشکن سے

دِل

دیوانِ چہارم

کیا میں ہی جاں بلب ہوں بیماریٔ دل سے
گل پھول فصلِ گل میں صد رنگ ہیں شگفتہ

نہیں تلب لاتا دلِ زار اب
اس شوق نے دل کے بھی کیا بات بڑھائی تھی

اب تو نہ رہا وہ بھی طاقت گئی سب دل کی
وسواس نہ کرتا تھا مرجانے سے ہجراں میں

یہ دل نے کیا کیا کہ اسیرِ بلا کیا
آزار بہت کھینچے یہ عہد کیا ہے اب

کہتے ہیں میرؔ کعبہ گیا ترکِ عشق کر
بے یار حیف باغ میں ٹک دل بہل گیا

کرتے ہیں نذر ہم کہ نہ الفت کہیں کریں
میں دو دِلا تو آگے ہی تھا فرطِ شوق سے

لکھنؤ دلّی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اداس
دل سنبھالے کہیں کل نیں چلا جاتا تھا

سوزشِ دل کے سبب مرگ نہ تھی عاشق کی
خانہ آبادی ہمیں بھی دل کی یوں ہے آرزو

دل ہوا کب عشق کی راہ کا دلیل
جیتے جی یہ بلا نہ رہا سو رہا غریب

کیا اس کے دل جلے کی تمامی میں دیر ہو
دل جو ہمارا خون ہوا تھا رنج و الم میں گذری ہمیں

گرچہ نصیحت سب ضائع ہے لیکن خلاف ناصح کی
مارا ہوا ہے عالم اس دردِ بے دوا کا

میں دل زدہ ہوں اب کی رنگینیٔ ہوا کا
بہت ہم نے صبر و تحمل کیا

رقعہ اسے لکھتے تو طومار لکھا جاتا
جو حال کبھو اپنا میں تم کو سنا جاتا

تھا میرؔ تو ایسا بھی دل جیسے اٹھا جاتا
اس زلفِ پُرشکن نے مجھے مبتلا کیا

آیندہ کشو سے بھی میں دل نہ لگاؤں گا
راہِ دلِ شکستہ کدھر وہ کدھر گیا

دے گل کو آگ چار طرف میں نہ جل گیا
گر دل ضعیف اب کے ہمارا سنبھل گیا

طور اس کا دیکھ اور بھی یکھ دل دہل گیا
میرؔ کو سرگشتگی نے بے دل و حیران کیا

ضعف اتنا تھا کبے بات ڈھلا جاتا تھا
اپنی غیرت میں وہ کچھ آپ جلا جاتا تھا

جیسے جلوے سے ترے گھر آرسی کا بھر گیا
میں تو خود گم ہی اسے پاتا رہا

جو دل شکستہ ساتھ سے اس کے بچھڑ گیا
جیسے چراغ صبح شتابی نبڑ گیا

یعنی ماتم اس رفتہ کا ہم نے ماہ وسال کیا
دل دیوانہ کیا سمجھے گا اور بھی میں سمجھاؤں گا

دل کے تئیں اس راہ میں کھو افسوس کناں اب پھرتا ہوں
لگا آتشیں نالہ شب اپنے دل کو
شب اک شعلہ دل سے ہوا تھا بلند
جنگ زمانہ میں تو محبث ہے عشق ہی کا
جُرم ہے ہم الفت کشتوں کا لگ پڑنے سے شوخ ہوا
دل ہی میں خون ہوئی وصل کی خواہش اے میر
تھا محبت سے کبھو ہم میں، کبھو یہ غم تھا
مہربانی تو دیر میں ہے کبھو
کیا کہیں حالِ خاطر آشفتہ
کیا جبیں گے داغ ہو کر خوں ہوا
کیا کریں تدبیر دل مقدور سے باہر ہے اب
کہاں ہے طاقت جو میر کا دل سب اُن بلاؤں کی تاب لاوے
دل میں جا کرتا ہے طورِ میر شاید دوستاں
دل سگئے پر آج کل ہے چُپ نہیں مجھ کو لگی
دل کے دل ہی میں رہ گئے ارماں
دل نے کام کیے ہیں ضائع دلبر ہے دلخواہ بہت
کرتا ہے گرچہ یاروں سے وہ ٹیڑھی بانکی بات
عہد اس کا غلط قرار عبث
رحم کی جاگہ کی ہے پیدا شاید اس کے دل میں بھی
فرق و تیغ بجے رہتے ہیں جیسے دل کی لاگ لگی
عرش پہ دھونی رمانے کو تھے دُودِ دل سے کب تک ہم
ہم ہیں قلندر آکر اگر دل سے دم بھریں
دل کو جو خوب دیکھا تو ہُو سکا مکان ہے
ترکیب و ناز اور ادا سب سے دل لگے
جاوے جُدائی کا یہ آزار گاہ باشد
گو قدر دل کی کم ہے پر چیز کام کی ہے
اس کی دُوری میں کڑھا کرتے ہیں ہم سب سے زیاد

یعنی رفیق و شفیق پھر ایسے میر کہاں میں پاؤں گا
اس انداز سے جیسے اک بان مارا
تن زار میرا بھسم کر گیا
بے جا ہوا دل اپنا جب وہ مقام نکلا
اب کہتے ہیں دل میں اپنے ہم نے اسے کیوں پیار کیا
ہم نے آزردگیٔ ہجر سے کیا من مارا
دل کا ہنگامہ قیامت خاک کے عالم میں تھا
ہے دل آزاری و عتاب شتاب
دل خدا جانیے کدھر ہے اب
زندگی کا دل جو سرمایہ ہے اب
ناامید اس زندگانی کرنے سے اکثر ہے اب
کرشمے غمزے کو ناز سے ٹک ہماری خاطر جدا کرو اب
ان نے صاحب دل کشو سے رکھی ہے صحبت بہت
گزری اس بھی بات کو اے ہم نفس مدت بہت
کم رہا موسم شتاب بہت
قدر بہت ہی کم ہے دل کی پر دل میں ہے چاہ بہت
پر کیا ہی دل کو لگتی ہے اس بدزباں کی بات
دل ہمارا ہے بے قرار عبث
دیکھ رہا ہے منہ کو ہمارے حال ہمارا اس کر آج
اس ظالم بے رحم کی میری ایسی صحبت کیا ہے آج
خاک پہ یاں کی در ویشانہ ہم نے بچھایا بستر آج
عالم کا آئینہ ہو سیاہ ایک ہُو سے بیچ
ہے اس مکاں میں ساری وہی لامکاں کی طرح
اس طرحدار کے ہیں گرفتار ہر طرح
اچھا بھی ہووے دل کا آزار گاہ باشد
سے لے تو رکھیں تمہیں ہو درکار گاہ باشد
جی گیا آخر رہا دل کو جو غم حد سے زیاد

گنتی میں تو نہ تھا ئیں پر کل خجل ہوا وہ
دل رکھ قوی فلک کی زبردستی پر نہ جا
پھرتا ہے کیا تو میرؔ گلستاں میں غم زدہ
تقدیس دل تو دیکھ ہوئی جس کو اس سے راہ
مانگ پناہ خدا سے بندے دل لگنا اک آفت ہے
خونریزی سے کچھ آگے تشہیر کر لیا تھا
سُن سُن کے دردِ دل کو بولا کہ جانتے ہیں ہم
اب تو پھرد ہوئے غم تب میرؔ جانیں گے ہم
دل نہیں دردمند اپنا میرؔ
بے قراری میں ساری عمر گئی
مدت سے میرؔ بے دل و دیں دلبروں میں ہے
کب سے ہے وہ خلاف وعدہ وے
کیا ہوا خوں ہوا کہ داغ ہوا
خاک ہو کر اُٹھے ہیں یار ہنوز
حق یہ ہے خواہشِ دل ہے مری تو آجانا
پائیے یار اکیلا تو غمِ دل کہیئے
خوش وے جو اپنا حال کہیں دلبروں سے دیر
کل ہاتھ جا رہا تھا دل بے قرار پاس
میرؔ ابتر بہت ہے دل کا حال
مائل ہوا ہے سروِ گلستاں کا دل بہت
رہتے ہیں بہت دل کے ہم آزار سے ناخوش
کیا کہوں میں کیا ہے دلبرِ خود غرض
دل کا لگانا جی کھونا ہے اس کو جگر ہے پیارے شرط
دل چلے ہم نہیں رہے بے کار
دل کا مطالعہ کر اے آگہِ حقائق
مرتے ہی سُنا ان کو جنھیں دل لگی کچھ تھی
اس رنگ سے جو زرد و زبوں زار ہیں ہم لوگ

کچھ دوستی کا میری دل میں حساب کر کر
گر گشتی لگ گئی ہے تو تُو بھی تلاش کر
کچھ دخراش لکھ بھی قلم اک تلاش کر
سر دے ہیں لوگ اس کے قدم کے نشاں پر
عشق نہ کر زنہار نہ کر واللہ نہ کر باللہ نہ کر
اس دل زدے کو ان نے مارا خراب کر کر
تُو اپنی یہ کہانی بیٹھا ہوا کہا کر
اچھے رہو گے جب تم دل کو کہیں لگا کر
آہ نالے اثر کریں کیونکر
دل کو آتا نہیں قرار ہنوز
کرتا نہیں ہے اس کی کوئی دلبری ہنوز
دل کو اس کا ہے اعتبار ہنوز
دل ہمارا نہیں گداز ہنوز
دل کا بیٹھا نہیں غبار ہنوز
جب کہ خونریزی کو بٹھلائیں مجھے دار کے پاس
سو تو بیٹھا ہی لے پاتے ہیں دو چار کے پاس
رویا نہیں تو ایک گھڑی اپنے یار پاس
گویا کہ جا رہا کشو سو زندہ نار پاس
یعنی ویراں پڑا ہے گھر افسوس
کچھ آگئی تھی اس میں قدرِ یار کی روش
بستر پہ گرے رہتے ہیں بیمار سے ناخوش
خود نما خود رائے خود سر خود غرض
سو تو بہا تھا خس ہو آگے پہلے داؤ میں ہارے شرط
زخم کاری اٹھائے کھائے داغ
ہیں فنِ عشق کے بھی مشکل بہت دقائق
اچھا بھی ہوا کوئی اس آزار سے اب تک
دل کے مرضِ عشق سے بیمار ہیں ہم لوگ

دل پھنس رہے دام میں زلفوں کے کسو کی
جاتا ہے کیا کھنچا دل دیکھ اس کو ناز کرتا
عشق کی چوٹیں پے درپے جو اٹھالی گئیں گھائل ہے دل
خون ہوا ہے چاک ہوا ہے جلتے جلتے داغ ہوا
آنکھوں کی دیکھا دیکھی ہرگز دل اس سے نہ لگنا تھا
عمرِ انسان راہ تو ہے تشویش سے طے ہوتی ہے دلے
غم مضمون نہ خاطر میں نہ دل میں درد کیا حاصل
بلا ہے سوزِ سینہ میر یوں ہو جائے گی جل کر
دل تو گداز ہے سب کس کو کوئی کہے دل
اس عشق میں نکالے ہیں ہمی کام کیا کیا
جوں ابر روئیے کیا دل برق سا ہے بے کل
عاشق کہاں ہوئے ہم پانچوں حواس کھوئے
ہم دردمند اپنا سوزِ دروں ہے بے حد
اے میر اسے بے نسبت کس حلقہ حلقہ مُو سے
حال تو حالِ زار ہے تاحال
کھنچتا ہے اس طرف ہی کو بے اختیار دل
آزردہ خاطری کا ہماری نہ کر عجب
واشد فسردگی سے تری اس چمن میں ہے
رنج و ستم بھی کھینچنے کے دن تو یاد ہو چکے
دلبروں کو جو بر میں کھینچا کچھ
شور سے طائرِ گلزار کے بیزار ہیں ہم
یوں نہ دل دیجے کسو سیمیں بدن زردوست کو
یہ داغِ دل کو لے کر آخر کیا کنارا
چپکی کیا انواع اذیت عشق میں کھنچی جاتی ہے
چہرہ زرد بجا ہے سارا عشق میں غم کا مارا ہوں
گرچہ ملتے ہیں خنک غیرتِ ماہ یہ لڑکے
دلکشی اس بزم کی ظاہر ہے تم دیکھو تو ہو

تنگ اپنے جنوں سے ہیں گرفتار ہیں ہم لوگ
آتا نہیں ہے خوش یہ اندازِ بے تہے دل
یوں بیدم ہے اب پہلو میں جیسے صید بسمل ہے دل
خواہش اس کو کیا ہے یار کی کس کیلئے بیدل ہے دل
جیسی سزا پہنچا دے کوئی اب اس کے قابل ہے دل
دل کے تئیں پہنچے جو کوئی چین کی پھر منزل ہے دل
ہوا کاغذ نمط گو رنگ تیرا زرد کیا حاصل
اگر دل سے اُٹھے تیرے یہ آہِ سرد کیا حاصل
نزدیک ہے کہ کہئے اب ہائے ہائے اے دل
خانہ خراب و رسوا بے دین اور بے دل
رکھے ہی رہتے اکثر ہاتھ اس پہ جو رہے دل
اس مخمصے میں ازبس حیراں ہے کیا کہے دل
یارب ہمارے اوپر کس مرتبے جلے دل
بیتاب کچھ ہے گو کہ پُرپیچ ہے نگہ سے دل
دل وہی بے قرار ہے تاحال
دیوانہ دل بلازدہ دل بے قرار دل
اک عمر ہم رہا کیے ہیں مار مار دل
دل جو کھلا تو جیسے گلِ بے بہار دل
اب نہیں جاتی اٹھائی کلفتِ بسیار دل
اس ادا سے بہت ہوئے برہم
دل اٹھاتا نہیں اپنا کہ گرفتار ہیں ہم
ابتدائے عشق میں اپنا بھی گھر دیکھیں گے ہم
اس باغ سے گلی میں جا جا کے رہ گئے ہم
دل تو بھرا ہے اپنا تو بھی کچھ نہیں کہتے حیلے سے ہم
ننگ یہ دیکھا ہوتا تو دل میر کہیں نہ لگاتے ہم
دل جگر دونوں کو یک لخت جلا دیتے ہیں
لوگ جی دیتے چلے جاتے ہیں کس حیرت ہے یاں

دل نہ ٹٹولیں کاش کے اس کا سردیٔ مہر تو ظاہر ہے
بالوں سے اس کے دل الجھا تھا خوب ہوا جو تمام ہوا
ہر طور میں ہم حرف و سخن لاگ سے دل کی
عازم پہنچنے کے تھے دل و عرش تک دے
دل کے لگتے ہی دل کھلائے آگے دیکھئے کیا کیا ہوں
کچھ قدر عافیت کی معلوم کی نہ گھر میں
کیا راہ چلنے سے ہے اے میرؔ دل مکدر
مینہ جو برسے ہے شدت سے دیکھ اندھیری کیا ہے یہ
سرو تو ہے سنجیدہ لیکن پیش مصرعِ قدِ یار
دل کی لاگ بُری ہوتی ہے چنگے بھلے مرجاتے ہیں
بھلا ہوا کہ دل مضطرب میں تاب نہیں
دیارِ حسن میں دل کی نہیں خریداری
وہ جو خرام ناز کرے ہے ٹھوکر دل کو لگتی ہے
ہم بھی عالم فقر میں ہیں پر ہم سے جھڑ نگے کوئی فقیر
تھکے چارہ جوئی سے اب کیا کریں
نہیں چاہتا جی کچھ اب سیر میں
کہیں دل کی مرغانِ گلشن سے کیا
کھپا عشق کا جوش دل میں بھلا
کیا باتوں سے تسلی ہووے مشکل عشق میری سب
خط و کتابت حرف و حکایت صفحۂ دل میں آجاوے
محبت دشمن جاں ہے جو میں معلوم یہ کرتا
دل کی کچھ تقصیر نہیں ہے آنکھیں اس سے لگ پڑیاں
نحس تھے کیا وہ وقت و ساعت جن میں لگا تھا دل اپنا
چاہت میں اس مایۂ جاں کے مرنے کے شائستہ ہوئے
دل آسودہ ہو تو رہے تک در پہ ہم سو بار گئے
تو وہ نہیں کسو کا تہِ دل سے یار ہو
تجھے اک بار اگر دیکھے کوئی بے جا ہو دل اس کا

پا دیں اس کو گرم مبادا یار ہمارے کینے میں
یعنی گیا جب بیچ سے جی ہی تب کوئی جنجال نہیں
کیا کیا کہے ہیں مرغ چمن اپنی زباں میں
آیا تصور اپنے ہی کچھ اشتیاق میں
محزوں ہو دیں مفتوں ہو دیں مجنوں ہو دیں سوا ہوں
اب ہجرِ یار میں ہیں کیا دل ندہ سفر میں
تو ہی نہیں مسافر، ہے عمر بھی گذر میں
یعنی تنگ جو ہم آتے ہیں دل کو کھول کے روتے ہیں
ناموزوں ہی نکلے ہے جب دل میں اپنے تو لیں ہیں
آپ میں ہم سے بے خود و رفتہ پھر پھر بھی کیا آتے ہیں
بہت ہی حال تباہ ہے اب اضطراب نہیں
وفا متاع ہے اچھی یہ یاں کے بلب نہیں
چوٹ کے اوپر چوٹ پڑے ہے دل ہے میرؔ سنگ نہیں
ایک سوال ہیں دو عالم دیں ان سے دل کے تنگ نہیں
کہو تم سو دل کا مداوا کریں
ہوس دل کو ہو تو تمنا کریں
یہ بے حوصلہ ہم کو رسوا کریں
کہ بدنام ہو دیں جو سودا کریں
یار سے کہنے کہتے ہیں پر کہنا کچھ آسان نہیں
دستے کے دستے کاغذ ہو تو دل کا حال ارقام کریں
تو کاہے کو کسو سے میرؔ اپنا دل لگاتا یاں
مار رکھا سو اُن نے مجھ کو کس ظالم سے جا لڑیاں
سال پہر ہے اب تو ہم کو ماہ برابر ہیں گھڑیاں
جا بھی چکی ہے دل کی ہوس اب جینے کا ارمان نہیں
وہ سو یہی کہہ بھیجے ہے باہر جاویں اب آرام کریں
یا تجھ کو دل شکستوں سے اخلاص و پیار ہو
خرامِ ناز پر تیرے لٹا گھر بار عاشق ہو

مصروفِ احتیاط رہا کر گیے رات دن
دل میں کدر سے آندھی ہی اٹھنے لگی ہے اب
یاد آئے وہ کیا تڑپے ہے کیا بے تابی کرتا ہے
کام گئے ہیں شوق سے ضائع صبر نہ آیا یاروں کو
آزردہ دل ہزاروں مرتے ہی ہم سنتے ہیں
دل ہی کے غم میں گزرے دس دن جو عمر کے تھے
وہ زلفیں عقدہ عقدہ ہیں آفت زمانہ
غنچے کے دل کی کچھ تھی واشد بہار آئی
غم قت سے بندے آزاد رہ
چاہ میں دل پہ ظلم ستم ہے جور وجفا ہے کیا کیا کچھ
عاشق کے مرجانے کے اسباب بہت رسوائی میں
دل لینے کو فریفتہ کے بہتیرا کچھ ہے یار کنے
خالی نہیں ہے خواہش دل سے کوئی بستر
حال نہیں ہے دل میں معلق شور وفغاں رسوائی ہے
کیا ضعف تن میں ہے جگر و دل و دماغ بن
مرزائی فقر میں بھی دل سے گئی نہ میرے
نہ خاطر پہ الم تیرے نہ دل پر کچھ ستم تیرے
رسوا خراب دغمکش دل خستۂ محبت
جامۂ احرام آخر تہہ کر دل کی اور توجہ کی
کیا کیا میں بیتاب رہا ہوں رنج والم سے محبت کے
نقدِ دل غفلت سے کھویا راہ کھولی کر گئے
ہے بلا دھوم دل دھڑکنے کی
حیف دل جاتے پڑ گئی جی کی
سودے میں دل کے نفع جو ہووے خام طمع رسوائی ہے
یمنِ عشق غم افزا سے کام نہایت مشکل ہے
دل کی بیماری سے خاطر تو ہماری جمع تھی
اب تو بے تابیٔ دل نے ہمیں بٹھلا ہی دیا

دینے میں دل کو اپنے جو کچھ اختیار ہو
نکلے گلے کی راہ تو رفع غبار ہو
کونی تسلی پھرتا ہے جب تک کہ دل کو تھام نہ لو
مار رکھا بے تابیٔ دل نے ہم سب غم کے ماروں کو
بیماریٔ دلی کی شاید دوا نہیں کچھ
اُچرچ ہے اس نگر سے باقی نہیں رہا کچھ
عقدہ ہمارے دل کا ان سے بھی کچھ کھلا نہ
افسوس ہے کہ موسمِ گل کا بہت رہا نہ
خدا ہے تو کیا غم ہے دل شاد رہ
درد والم ہے کلفت وغم ہے رنج دبلا ہے کیا کیا کچھ
دل لگا ہے شرم وحیلہ ہے مہر و وفا ہے کیا کیا کچھ
غمزہ عشوہ چتون چشمک ناز وادا ہے کیا کیا کچھ
جلتے ہیں سب جہان سے اِک آرزو کے ساتھ
یار گیا مجلس سے دیکھیں کس کس کی اب آئی ہے
پوچھو جو اس قشون میں سردار ہو کوئی
چہرے کے رنگ اپنی چادر کی زعفرانی
محل رحم ہوویں کس طرح مظلوم ہم تیرے
عاشق کو تیرے غم میں کیا کیا کہا گیا ہے
در پہ حرم کے اس لیے تھے ہم کوئی ملے گا محرم بھی
ہے عالم کچھ اور ہی میرے دل کے مرض کا عالم بھی
کارواں جاتا رہا ہم خواب ہی میں مر گئے
ایسا ہوتا نہیں ہے ادھم بھی
ورنہ غم کرتے لیتے ماتم بھی
وارا سارا عشق میں کیا جی کا بھی نقصان کرے
اب بھی نہیں نومیدی دل کو شاید عشق آسان کرے
لوگ یوہی محبت سے دوا کرتے تھے
آگے رنج وتعبِ عشق اٹھا کرتے تھے

اٹھ گئے پر مرنے تکیے کے کہیں گے یاں میر
دہ رہ سکے ہے دل زدہ کچھ منتظر کھڑا
کیا اضطراب دل سے کہے میرؔ سرِ عشق
کہتے نہیں ہیں دل خون اس رنگ سے کسو کا
تم دل کو دیتے ہو تو بے دل سمجھ کے ہو جو
چلو چمن میں جو دل کھلے ٹک ہم غم دل کہا کریں گے
قرار دل سے گیا ہے اب کی کہ رنگ گھر میں نہ مرنے گئیں
ہلاک ہونا مقرری ہے مرض سے دل کے پہ تم کسو ہو
تڑپ ہے دل کا ہمارے لگنا لگانا غصّے سے عاشقی کے
اگر وہ رشکِ بہار سمجھے کہ رنگ اپنا بھی ہے اب ایسا
دردِ دل سوزانِ محبت محو جو ہو تو عرش پہ ہو
عشق میں کھوئے جاؤ گے نوبت کی تہہ بھی پاؤ گے
صبر کہاں بیتابیٔ دل سے چین کہاں بے خوابی سے
ضعف گریاں صاحب بندہ دل کی لگی کب بیٹھ گئیں
بے جا ہوئے بہت دل رفتار دیکھ اس کی
عشق میں دل بہت ہے بے آرام
ہے تو یک قطرہ خون ہی لیکن

دردِ دل بیٹھے کہانی سی کہا کرتے تھے
حیرت سے اس کے در پہ جو دیوار ہو کوئی
یہ حال سمجھے وہ جو گرفتار ہو کوئی
ہم دل شدوں کی اُن نے کیا خوب دلبری کی
ہم نے تو قدر دل کی افسوس کچھ نہ جانی
طیور ہی سی بکا کریں گے گلوں کے آگے بکا کریں گے
بہار آئی جو اپنے جیتے تو سیر کرنے چلا کریں گے
مزاج صاحب اگر ادھر ہے تو ہم بھی اپنی دوا کریں گے
نچی جبیں سے گلی میں اس کی خراب و خستہ پھرا کریں گے
ورق خزاں میں جو زرد ہوں گے غم دل اُن پر لکھا کریں گے
یعنی دُود بجھے گی جا کر عشق کی آگ لگائی ہوتی
قدر ہماری کچھ جانو گے دل کو کہیں جو لگاؤ گے
سو سو بار گلی میں تکتے گھر سے باہر آؤ گے
آہ نہیں وہ سُننے کا تم باتیں بہت بناؤ گے
عزلت گزینوں سے بھی کم ہی رہا گیا ہے
چین دیوے تو کوئی خواب کرے
قہر ہے دل جو اضطراب کرے

دِل

دیوان پنجم

دل رفتۂ جمال ہے اس ذوالجلال کا
ہر اک کام موقوف ہے وقت پر ہی
فنِ شعر میں میرؔ ضایع ہے وہ
بکھر جاتے ہیں کچھ گیسو تمہارے
کیا پوچھو ہو کیا کہیے یاں دل نے بھی کیا کام کیا
کہنے کی بھی لکھنے کی بھی ہم تو قسم کھا بیٹھے تھے
عشق گیا سو دین گیا ایمان گیا اسلام گیا
لکھنا پڑھنا ترک ہوا تھا آپس میں تو مدت سے
چھانتا ہوں کسو گلی کی خاک
آہِ سحر نے دل کی نہ کھولی گرہ کبھو
وے میرؔ اثر جو سوزشِ دل میں تھے ہیں کہاں
کیسا کیا جگر خون آزار کیسے کھینچے
عاشق ہووے وہ بھی یارب تا کچھ اس سے کیا جاوے
آہ سے تھے رخنے چھاتی میں پھلنا ان کا سہل نہ تھا
خوگر ہونا خونِ دل کا سے میرؔ ہمارا یونہی نہیں
میرؔ افسردہ دل چمن میں پھرا
ہم دام تھے سو چھٹ گئے سب دام سے اُٹھے
کیونکہ دل کو جہت ہوا اس سے میرؔ مقام حیرت ہے
دل تڑپے ہے جان کھپے ہے حال جگر کا کیا ہوگا
ہے حرفِ خامہ دل زدہ حرفِ قبول کا
غربت ہے دلا دیز بہت شہر کی اس سے

مستجمع جمیع صفات و کمال کا
دلِ خون شدہ بھی جگر کر رہے گا
دل اس کا کوئی تو ہنر کر رہے گا
ہوا ہے کام دل بَرہم ہمارا
عشق کیا ناکام گیا آخر کو کام تمام کیا
آخر دل کی بیتابی نے خط بھیجا پیغام کیا
دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا
اب جو قرار کیا ہے دل سے خط بھی گیا پیغام گیا
دل کو اپنے کبھو تو پاؤں گا
آخر نسیم سے بھی یہ غنچہ نہ وا ہوا
نالے کیے جرس نے بہت سے تو کیا ہوا
آساں نہیں ہوا دل اندوہگیں ہمارا
یعنی حال سنے گا دل سے، دل جو کسو سے لگاوے گا
دو دو ہاتھ تڑپ کر دل نے سینۂ عاشق چاک کیا
برسوں روتے کڑھتے رہے تب ہم دل کو غمناک کیا
غنچۂ دل کہیں نہ اس کا کِھلا
تھی دل کو میرے چوٹ گرفتار ہو گیا
چاروں اور نہیں ہے کوئی یاں داں یونہی وصیان گیا
مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں مجنوں کیا ہم سا ہو گا
یعنی خیال دل میں ہے نعتِ رسولؐ کا
آیا نہ کبھو ہم کو خیال اپنے وطن کا

جب زمزمہ کرتی ہے صدا چبھتی ہے دل میں
کیا جانیں آشفتہ دلاں کچھ ان سے ہم کو بحث نہیں
دل کی لاگ کہیں جو ہو تو میرؔ چھپائے رکھ اس کو
دل رہے وصل جو مدام رہے
دل گیا مفت اور دکھ پایا
اس بلا سے آہ نہیں غافل رہا
بے دلی میں ہے میرؔ خوش اس سے
غنچۂ دل وا ہوا نہ باغوں باغوں میں پھرا
عشق کیے پچھتائے ہم تو دل نہ کسو سے لگانا تھا
دل جمع تھا تو غنچے کے رنگوں خزاں میں تھا
بے دل ہوئے پہ کرتے تدارک جو رہتا ہوش
غم کھینچتے بلا نہیں جاگہ سے کیا کروں
آتش دل کی لپٹوں کا ہے یارو کچھ عالم ہی جدا
تڑپا ہے پہلو میں اب جب طاقت دل میں کچھ نہ رہی
جنگل میں رونے چلا تھا دل جو بھرا تھا میرؔ بہت
کیا شہرِ خوش عمارت دل سے ہے گفتگو
کیا تم سے اپنے دل کی پریشانی میں کہوں
رہ پیروی میں اس کی کہ گام نخست میں
بجلی سا وہ چمک گیا آنکھوں پہ بھوویں پڑنے لگیں
کیا کیا عشق میں رنج اٹھائے دل اپنا سب خون ہوا
اس کی کنک کی پامالی میں دل جو گیا تھا شاید میرؔ
دل کے داغ بھی گل ہیں لیکن دل کی تسلی ہوتی نہیں
دل کی خرابی کے تو درپے ہے اے صنم تو
تاب عشق نہیں ہے دل کو جی بھی بے طاقت ہے اب
موسمِ گل کا شاید آیا داغ جنوں کے سیاہ ہوئے
دل کے گئے بے کس کہلائے ایسا کہاں محرم ہے اب
سن کے حال کسو کے دل کا رونا ہی مجھ کو آتا تھا

بلبل سے کوئی سیکھ لے انداز سخن کا
وہ جانے گا حال ہمارا جس کا دل بے جا ہو گا
یعنی عشق ہوا ظاہر تو لوگوں میں رسوا ہو گا
دل گئے اس سے گاہ گاہ تو کیا
ہو کے عاشق بہت میں پچھتایا
یک بیک دل کا لگانا ہو گیا
دل کے جانے کا حیف غم نہ ہوا
اب بھی ہے ویسا ہی جیسا پیشتر غمناک تھا
جیدھر ہو وہ مہ نکلا اس راہ نہ ہم کو جانا تھا
اسے کیا کہوں بہار گلِ زخم کھل گیا
ہم آپ ہی میں آئے نہیں جب سے دل گیا
دل جا لگے ہے دم بدم اودھر ہی ہل گیا
لائحہ کوئی کھینچتا سر تو عالم سارا جل جاتا
جسم غم فرسودہ ہمارا زرد و زار و زبون ہوا
آیا سیل آگے سے چار آکیا بخت سے مجھ کو شگون ہوا
لشکر نے غم کے آن کے مارا چلا گیا
دریائے گریہ جوش زنان تھا بہا گیا
ظاہر اثر ہے مقصدِ دل کے حصول کا
ابر نمط خفگی سے اس بن جی بھی ندھا دل بھر آیا
کیسے رکتے تھے خفگی سے آخر کار جنوں ہوا
یار ادھر ہو مائل ٹک تو وہ رفتہ ہاتھ آوے اب
کاش کے وہ گلبرگ ادھر سے باد آسا کر لاوے اب
اس خانۂ خدا کی تعمیر ہے مناسب
یعنی سفر ہے دور کا آگے اور اپنی رخصت ہے اب
دل کھنچتا ہے جانب صحرا جی نہیں لگتا گھر میں اب
کون ایسے محروم و غمیں کا ہمراز و محرم ہے اب
یعنی کسو جو کڑھتا تھا میں وہ رونا ہر دم ہے اب

عشق ہمارا کچھ نہ پوچھو کیا کیا رنگ بدلتا ہے
دل کی تہہ کی کہی نہیں جاتی نازک ہے اسرار بہت
دل کو اس بے مہر سے ہم نے لگایا ہے عبث
رات دن سنتا ہے نالے یوں نہیں کہتا کبھو
بخار دل کا نکالا تھا دردِ دل کہہ کر
یہ اُلجھاؤ سُلجھتا ہم کو دسے ہے دکھائی کم سا
چین نہ دے گا خاک کے نیچے ہرگز عشق کے ماروں کا
یہ عشق بے یقینی حال ایسا کم سنا ہے
اس سے نہ الفت ہو مجھ کو تو چہرہ میرا ہووے زرد
نکلتا ہے دل کنار میں صد پارہ درد مند
تسکین اپنے دل کی جو پاتا نہیں کہیں
چھوڑ اب طریق خورد کو اے بے وفا سمجھ
دل کی حقیقت عرش کی عظمت سب کچھ ہے معلوم ہمیں
بھری تھی مگر آگ دل میں درختوں میں
سرِ عجز ہر شام تھا خاک پر ہی
کئی زخم کھا کر تڑپتا رہا دل
دل کا راز کیا میں ظاہر بلبل سے گلزار میں لیک
دل کی طرف کا پہلو سب متصل جلے ہے
اُجڑے نگر کو دل کے دیکھوں ہوں جب کبھوں ہوں
دل کا مکاں پھر اس کا کیا صحن میرؔ لیکن
کب سے قیدی ہیں پہ ہے نالش بسیار ہنوز
ہرچند آسماں پہ ہماری دعا گئی
تیشے سے کوہکن کے دل کوہ جل گیا
کوئی دن کریئے معیشت جا کسو کامل کے پاس
دل گداز عشق سے سب آگ ہو کر بہہ گیا
دل میں حسرت گرہ ہے رخصت کی
کیا تدارک ہے عشق میں دل کا

خون ہوا دل داغ ہوا پھر درد ہوا پھر غم ہے اب
اچھر ہیں تو عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت
مہر کی رکھ کر توقع جی کھپایا ہے عبث
میرؔ دل آزردہ کو کس نے ستایا ہے عبث
سو دردِ سر ہے بدن گرم ہے بخار ہے آج
یعنی دل اٹکا ہے جا کر ان بالوں کے شکن کے بیچ
دل تو ساتھ اے کاش نہ گاڑیں ان لوگوں کے مزار کے بیچ
اے میرؔ دل کسو سے تیرا لگا ہے شاید
ہاتھ نہ رکھوں کیوں میں دل پر رنج دبلا ہے قیامت درد
ہر پارہ اس کا پاتے ہیں آوارہ درد مند
جز صبر اور کیا کرے بے چارہ درد مند
تھمتی نہیں یہ چال کسو دل میں راہ کر
سیر رہی ہے اکثر اپنی ان پاکیزہ مکانوں پر
جھڑتے اشک سوزش سے اس کی شرر پر
تہہ دل تھے کیسے ہی آہِ سحر پر
تسلی تھی موقوف زخم دگر پر
اس بے تہہ نے صحنِ چمن میں جان دی چلا چلا کر
مخمل ہو فرش کیوں نہ آوے گا خواب کیونکر
اب پھر بسے کی ایسی بستی خراب کیونکر
غالب ہے سعی میں تو میدان لامکاں پر
دل بہارانِ چمن کا ہے گرفتار ہنوز
اس مہ کے دل میں کچھ نہیں کرتی اثر ہنوز
نکلے ہے سنگ سنگ سے اکثر شرر ہنوز
ناقصوں میں رہیے کیا رہیے تو صاحب دل کے پاس
مرگئے پر گور میری کریو تو بے دل کے پاس
چلتے ہی ان نے کچھ کہا افسوس
میں بلا میں ہوں بتلا افسوس

خون ہوئی دل ہی میں امیدِ وصال
رخصت میں پابوس کی سب کی جی جاتا تھا سوں نے
بیماریٔ دلی پہ میں صبر کر رہا ہوں
شب وصل کی بیتر آئی نہ ایک دن بھی
ادھر آتا بھی وہ سوار اے کاش
رکھتا ہے میرے دل سے تمہارا غم اختلاط
تف دل تو میرؔ اک کفِ خاک ہے
دل گئے پر نہ ورد نہ تسبیح
اٹھنے دیتا نہیں شکستہ دل
چار طرف سے نزولِ حوادث جاؤں کدھر تنگ آیا ہوں
دائرہ سا ہے یہ جہاں میں جہاں تہاں متصرف ہے
بے تاب ہے دل غم سے نپٹ زار ہے عاشق
اور غبار کشو کے دل کا کس انداز سے نکلے آہ
قلب گداز ہیں جن کے وے بھی مٹی سونا کرتے ہیں
شاد افیونیوں کا دل غمناک
دیوانے ہیں شہر وفا کی راہ و رسم کے ہم تو میرؔ
اوج و موج کا آشوب اس کے لے کے فلک سے زمیں تک ہے
کوہکن و مجنون و وامق جس سے پوچھو پتا دیوے
ہائے غیوری دل کی اپنے داغ کیا ہے خود سر نے
میرؔ پریشاں دل کے غم میں کیا کیا خاطرداری کی
مت پوچھو کیوں زیست کرو ہو مرے سے افسردہ تم
جیتے جی تو داغ ہی رکھا موئے پر کیا حصول
آئی بہار نکلے چمن میں ہزار گل
لاکھوں جتن کیے نہ نبھی دل سے یار کے
اس کی گلی میں صبح دلوں کا شکار تھا
دردِ فراقِ دلبر سے ہے نشار بے ڈھب
جب کہتے ہے فسردہ و مردہ ضعیف و زار

مر رہے جی کو مار مار افسوس
ہاتھ میں عاشق دلرفتہ کا دل نہ لیا افسوس افسوس
جی کو نہیں ہے میرے مطلق دوا کی خواہش
دل کو یہی ہمارے اکثر رہا کی خواہش
اس کا ہو جاتا دل شکار اے کاش
ہر لمحہ لحظہ آن و زماں ہر دم اختلاط
مری خاک پر کیوں جلائی تھی شمع
کہتے ہیں ہر زماں دریغ دریغ
ڈھہ گیا کیا مکاں دریغ دریغ
غالب ہے کیا عہد میں میرے اے دل رنج عنا کی طرف
عشق کہیں ہے دل میں نہاں اور کہیں پیدا ہے عشق
کیا جا کے دو چار اس سے ہوتا چار ہے عاشق
دوے فلک سے بدلی سی تو ساری ہمارے چھائی خاک
میرؔ اکسیر بنائی انھوں نے جن کی جہاں سے اٹھائی خاک
دشت دشت اب کے ہے گل تریاک
دل کسے کہیے جی دینے والے قاطبۃً گھر گھر ہیں لوگ
صورت میں تو قطرۂ خوں ہے معنی میں دریا ہے دل
عشق و جنوں کے شہروں میں ہر جا طرفہ رسوا ہے دل
جی ہی جس کے لیے جاتا ہے اس سے بے پروا ہے دل
خاک میں ملتے کیوں نہ پھریں اب خوں ہو بہ بھی گیا ہے دل
ہجر میں اس کے ہم لوگوں نے برسوں تئیں مارا ہے دل
گور پر دل سوزی سے جس شمع سر رکھ لائے گل
دل جو کھلا فسردہ تو جوں سیے بہار گل
اس کا جفا شعار، وفا ہے شعارِ دل
نکلا ہزار ناز سے بہر شکارِ دل
ہو جائے جنگی خوں شاید شتاب اب دل
ناچار دیر ہم رہے ہیں مار مار دل

دو چار دل سے راضی نہیں ہوتے دلبراں
صد ہزار افسوس اگر خالی پائی جائے گل
ہر لحظہ ہے کدورتِ خاطر سی یارِ دل
تر بندی خشک بندی نمک بندی ہو چکی
باہر ہیں حد و حصر سے کھینچے جو غم الم
رکھتا نہیں ہے مطلق تاب عتاب اب دل
آتش جو عشق کی سب چھائی ہے تن بدن پر
غم سے گداز ہو کر اس بن جو بہہ نہ نکلا
مدت سے اب وہی ہے مرا ہمکنار دل
ہے میرؔ عشق حسن کے بھی جاذبہ تئیں
چاہت آفت الفت کلفت مہر و وفا و رنج و بلا
گر نہ روئیں کیا کریں ہر چار سو ہے بے کسی
صبر و قرار جو کچھ ہووے تو بہتر ہیں سب بے طاقت بھی
ہم تو یہی کہتے تھے ہمیشہ دل کو کہیں نہ لگاؤ تم
مت پوچھو کچھ پچھتاتے ہیں کیا کیا کیسے گھبراتے ہیں
کیا صراب وہ یک رنگی جو دیکھ نہ سکتے دل تنگی
اس کی نگاہ کی اچپلیوں سے غش کرتے ہیں جگر داراں
کہا سنتے تو کاہے کو کسو سے دل لگاتے تم
یہ ساری خوبیاں دل لگنے کی ہیں مت برا مانو
پھرا کرتے تھے اپنے حسن پر مغرور جب آگے
ہم نہ کہا کرتے تھے تم سے دل نہ کسو سے لگاؤ تم
خواہش دل ہے چاہ کسو کی یہی سبب ہے کاہش کا
اس کو دل سا مکان دیتے ہیں
قحط نہیں ہے دل کا اب من مارے تم کیوں پھرتے ہو
سنتا نہیں ہے شعر بھی وہ حرف ناشنو
درا میں کہاں شور ایسا دھرا تھا
گیا صبر آخر آزار دلی پر

شاید تسلی ان کو ہو جو لیں ہزار دل
ہے غنچہ ساں میں دل سے لب تک ہائے گل اے وائے گل
آندھی سی آوے نکلے کبھو جو غبارِ دل
ہے ڈول پھیلتا سا چلا ہے فگارِ دل
کیا ہو سکے حسابِ غم بے شمار دل
جلتا ہے کچھ ڈہا ہی خانہ خراب اب دل
پہلو میں رہ گیا ہے ہو کر کباب اب دل
شرمندگی سے ہو گا اے میرؔ آب اب دل
آزردہ دل ستم زدہ دل بے قرار دل
کھنچتا ہے سوئے یار ہی بے اختیار دل
عشق ہی کے سب نام ہیں اے دل کاش کہیں نہ لگاتے تم
بے دل و بے طاقت و بے دین و بے دلبر ہیں ہم
ہاتھ رکھے دل ہی پر کب تک ادھر آکثر جاویں ہم
کیا کہیے نہ ہماری سنی اب بیٹھے رنج اٹھاؤ تم
جی تو لیا ہے پاس بغل میں دل بیٹھے میں ڈل کر ہم
رکتے پاتے تک جو ہمیں تو دیر تلک گھبراتے تم
کیا ٹھہرے گا دل اپنا جو بجلی سے ڈر جاویں ہم
نہ جاتے اس طرف تو ہاتھ سے اپنے نہ جلتے تم
کسی کا بارِ منت ہے علاقہ کب اٹھاتے تم
کسو سے دل لگا جو پوچھتے ہو آتے جاتے تم
جی دینا پڑتا ہے اس میں ایسا نہ ہو پچھتاؤ تم
ناحق ناحق کیوں کہتے ہو حق کی طرف دل لاؤ تم
اہل اس گھر پہ جان دیتے ہیں
لینے والا چاہیے اس کا ایسا تو کم یاب نہیں
دل ہی میں خوں ہوا کیں مری نکتہ دانیاں
کسو کا گھر دل رکھا تھا جرس میں
بہت کرتا رہا دارو دوا میں

کسو سے دل نہیں ملتا ہے یارب
اخگر تھا دل نہ تھا مرا جس سے تہ زمیں
یا تو لیتا ہوں داو دل یا اب
چلنے میں ناز سے جب ٹھوکر لگے ہے دل کو
ضبط گریہ دل سے ہو تو کوزے میں دریا کرنا ہے
دل الجھے ان بالوں میں تو آخر سودا ہوتا ہے
دل بے ملتے کچھ بن نہیں آتی حال بگڑتے جاتے ہیں
ٹھہریں میر کسو جا گہ ہم دل کو ٹک جو قرار آدے
طلب ہے کام دل کی اس کے بالوں کی اسیری ہیں
کیونکہ یاں اس کا خیال آئے کہ آگے ہی ہم
کی ہے عمارت دل کی جنھوں نے ان کی بنا کچھ رکھی ہی
عشق میں ہم سے تم سے کہیں تو کھپ جاویں غم کس کو ہے
عشق دلکش ذبح ہی پر کھیل قدرت کا ہے میر
زنگ تو جاوے دل سے ہمارے غیر سیہ رُو بدگو کے
دل کھلتا ہے واں صحبت رندانہ جہاں ہو
ان اُجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
شہر دل کی کیا خرابی کا بیاں باہم کریں
دل آشنا ہے آشفتہ خورشید رُو کا
کیا غیرت سے دل پر تنگ رنج و غم نے دنیا کو
صحبت گرم ہماری تمہاری شمع پتنگے کی سی ہے
کہتے نہ تھے ہم تم سے دل ہاتھ سے مت دیجو
دل لگنے کی چوٹ بڑی ہے اس صدمے سے خدا حافظ
دل خستہ شکستہ دل دل بستہ گرفتہ دل
اس داہ سے کرتا ہے دل کسب ہوا گاہے
ہر جگہ دلکش ہے اس کی برگ گل سے جسم میں
لگے ہی آزردہ ہیں ہم دل ہیں خستہ ہمارے سب
صبر بلا ہائے عشقی پر حوصلے والے کرتے ہیں

ہوا تھا کس گھڑی اُن سے جدائیں
لگ لگ اُٹھی ہے آگ کفن کو مزار میں
کام اپنا تمام کرتا ہوں
آتی نہیں سمجھ میں ان دلبروں کی چالیں
حوصلہ داری جن کی ہوا ایسی عشق میں ان کو سلامیں ہیں
کوچے کو زنجیر کے یعنی زلفوں سے دو راہیں ہیں
جیسے چراغِ آخرِ شب ہم لوگ نبڑتے جاتے ہیں
ہو کے فقیر اس در پہ بیٹھیں اس کے بھی، ہم باب نہیں
گدائی شب کروں ہوں میں تجالت سے فقیری میں
دل سا گھر آتشی آہوں سے جلا بیٹھے ہیں
اور تو خانہ خراب ہی دیکھے اس بستی کے معمار ملا
مارے گئے ہیں اس میدان میں کیا دل والے جگر دار ملا
صرف کیجیے اس میں اپنا جس قدر مقدور ہو
کھینچ کے ایسی ایک لگاؤ تیغ ستم کی جا، دو ہو
میں خوش ہوں اسی شہر میں میخانہ جہاں ہو
جی میں ہے وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو
اس کو ویرانہ نہ کہیے جو کبھو معمور ہو
کہ اپنے بھی سائے سے وحشت ہے مجھ کو
بس اب تو کھل گئی ہیں آنکھیں دیکھا ہم نے دنیا کو
یعنی ہو دلسوز جو کوئی اس کو تم تو جلا دو ہو
مت کھائیو غم آشنا، اپنا نہ لہو پیجو
بارے سعی و کشش کوشش سے جی کو اپنے بچاتے رہو
ہو ان میں کوئی اس کا دل ہاتھ میں ٹک لیجو
میرے پھٹے سینے کو زنہار نہ تم سیجو
ایک جا تو جی لگاؤ دل کے تئیں بے جا کرو
حرف رنجش بیچ میں لا کر اور نہ اب دلگیر کرو
رحمت ہے اس خستہ جگر کو دل جس کا بے تاب نہ ہو

نومیدِ وصل دل نہیں شب ہائے ہجر میں
کہیں دل بھی ان کے اٹکتے ہیں جنہیں شوق میں ہے کل کچھ
ہم ہیں مریضِ عشق و جنوں سختی سے دل کو مت آزاد
ہم جانتے تو عشق نہ کرتے کسو کے ساتھ
خواہش نہ ہووے دل کی جو حاصل تو موت ہے
دل میں درد جگر میں طپیدن سر میں شور آشفتہ دماغ
جب تھا موسم واہونے کا تب تو شگفتہ کلک نہ ہوا
وہ ناوک دل دوز ہے لاگو میرے جی کا
کر کام کسو دل میں، گئی عرش پہ تو کیا
شاید کہ وصل اس کا ہووے تو جی بھرے
بسان برق وہ جھمکے دکھادے
مجھے میرؔ تا گور کاندھا دیا تھا
خبر ہے شرط اتنا مت برس اے ابر باراندہ
چارہ گری بیمارئ دل کی رسم شہرِ حسن نہیں
صبح سے آنسو نومیدانہ جیسے وداعی آتا تھا
دل بھی بھرا رہتا ہے میرا جی بھی رندھا کچھ جاتا ہے
ایک جراحت کیا تسکیں دے موت ہے بھوکے جیسے کے تئیں
دل کی لاگ بُری ہوتی ہے رہ نہ سکے ٹک جائے بھی
آنکھ نہ ٹک میلی ہوئی اپنی مطلق دل بے جانہ ہوا
کوئی نام اس کا نہ لو جبر ہے
خاک جل کر بدن ہوا ہے سب
دشمنِ جاں تو ہے دلوں میں بہم
کار عدالت شہر کا ہم کو کہ دو دن ہوئے تو پھر
کیا کیا تم نے فریب کیے ہیں سادگی میں دل لینے کو
چاہت روگ بُرا ہے جی کا میرؔ اس سے پرہیز بھلا
ایسے قماری سے دل کو لگا کر جیتے رہنا ہو نہ سکا۔
ہجر میں خوش ہوا تھا سب غم سے

ان ماتوں ہی میں ملنے کی بھی رلت ہو تو ہو
ہوئے ہو جو رفتہ خرام کے تو جمال پر بھی نظر کرو
نرم کرتے ہیں حرف و حکایت اہلِ خرد دیماد کے ساتھ
لے جاتے دل کو خاک میں اس آرزو کے ساتھ
احوال میرؔ دیکھ نہیں جی تو مار دیکھ
کیا کیا رنج اٹھائے گئے ہیں جب سے ان سے جدائی ہوئی
اب جو بہت افسردہ ہوا ہے دل ہے کلی مرجھائی ہوئی
تو سامنے ہو ہمدم اگر تجھ کو جگر ہے
اے آہِ سحرگاہ اگر تجھ میں اثر ہے
ہوتی نہیں ہے اب تو تسکینِ دل خبر سے
دے دل شرط ہے جو تاب لاوے
تمنائے دل نے یوں یاں ٹک نبھائی
ہمیں بھی آج رونا ورنہ دردِ دل پہ آتا ہے
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے
آج کسو خواہش کی شاید دل سے ہمارے رخصت ہے
کیا جانوں میں رووں گا کیسا دریا چڑھتا آتا ہے
شاید دل ہو تسلی اس کا زخم جگر سے کھائے سے
آئے بیٹھے اُٹھ بھی گئے بیتاب ہوئے پھر آئے بھی
دل کی مصیبت کیسی کیسی کیا کیا رنج اٹھائے بھی
کہ بے تاب دل کی بنا صبر ہے
دل جلا سا کباب ہے سو ہے
دوستی کا حساب ہے سو ہے
چاروں اَور منادی کر دیں کوئی کسو سے دل نہ لگائے
ٹیڑھی کر کے کلاہ آتے تھے بے خوردہ تھے ماتے تھے
اگلے لوگ سُنا ہے ہم نے دل نہ کسو سے لگاتے تھے
دفتہ شاہد بازی اس کے جی بھی اپنا ہارے گئے
دل نے پہلو تہی کیا ہم سے

چپکا چلا گیا مَیں آزردہ دل چمن سے
مترتب ہو نفع جو کچھ بھی
دل میں گرہ ہوس رہی پروازِ باغ کی
درد وغم سے دل کبھو فرصت نہ پائے
بندے کا دل بجا ہے جاتک ہے شاد ہر جا
مرنا تو ایک دم ہے عاشق مرے ہے ہردم
دل پہلو میں ناتواں بہت ہے
جی کو نہیں لاگ لامکاں سے
دل کی لاگ نہیں چھپتی ہے کوئی چھپاوے بہتیرا
نالہ جب گرم کار ہوتا ہے
جبر ہے قہر ہے قیامت ہے
دل جو لگتا ہے تڑپنے ہر زماں
دل کو کھینچے ہے چشمک انجم
ہمیشہ دل اپنا جو بے جا ہے اس بن
مرے دل میں رہتا ہے تو ہی تو ہی تو
جہاں میرؔ عاشق ہوا خوار ہی تھا
تجھ سا تو سوار ایک بھی محبوب نہ نکلا
نرمی سے کوئے یار میں جاوے تو جا نسیم
سارے عالم کے حواسِ خمسہ میں ہے انتشار
دادِ فریاد جا بجا کرئیے
طفلِ تہہِ بازار کا عاشق ہوں مَیں
ہر جا بدن میں اس کے افراط سے ہے دلکش
فرہاد کو مجنوں کو موت آگئی ہے آگے
وہ یار تو نہ تھا تہہِ دل سے کسو کا میرؔ
گرچہ نظر سے پشت پا پر لیکن قہر قیامت ہے
پھیر دیے ہیں دل لوگوں کے مالک جیسے میری طرف
چاہت میں اس بے الفت کے گھبراہٹ دل ہی کو نہیں
دودِ دلِ سوزانِ محبت تو جو ہو تو عرش نہ ہو

کس کو دماغ اتنا بلبل کو جو پکارے
دل کی بیماری کی دوا کرئیے
موسم گلوں کا جب تئیں تھا ہم اسیر تھے
یہ صعوبت کب تلک کوئی اٹھائے
جیسے سے شنا ہے مَیں نے کیا غم ہے جو خدا ہے
وہ جانتا ہے جس کو پاسِ دلِ دِفلا ہے
بیمار مرا گماں بہت ہے
ہم کو کوئی دل مکاں بہت ہے
زردئی عشق سے بے الفت یہ رنگ کسو کا کرتا ہے
دل کلیجے کے پار ہوتا ہے
دل جو بے اختیار ہوتا ہے
اک قیامت ہے غضب ہے قہر ہے
آنکھ ہم نے کہاں لڑائی ہے
مرے قتل کو وہ بجا جانتا ہے
جو کچھ دل کا ہے مدعا جانتا ہے
یہ سودائی کب دل لگا جانتا ہے
جس دلبرِ خود کام کو دیکھا سو نفر ہے
ایسا نہ ہو کہ اکثر یں کہیں دل گئے ہوئے
ایک ہم ہی تو نہیں معلوم ہوتے وہ دِیے
شاید اس کے بھی دل میں جا کرئیے
دل فروشی کوئی مجھ سے سیکھ جائے
مَیں کیا دلِ ملک بھی لے اگر بجا ہے
کس سے کہیں دردِ دل اب آہ نہیں کوئی
ناچار اس کے جور وستم ہم بھی سہہ گئے
گڑ جاتی ہے دل میں ہمارے آنکھ اس کی شرمائی ہوئی
تم بھی فلک اے آہ و نالہ قلبوں میں تاثیر کرو
سلسلے حواسوں میں ہے آشفتہ جانی بھی ہے گھبرائی ہوئی
ڈوب بجھے گی یعنی جا کر عشق کی آگ لگائی ہوئی

دِل

دیوان ششم

نہ تھی بیگانگی معلوم اس کی
نہ سمجھے ہم اسی سے دل لگایا

بے طاقتی نے دل کی گرفتار کر دیا
اندوہِ دودِ عشق نے بیمار کر دیا

پہلو میں دل نے لوٹ کے آتش سے شوق کی
پایانِ کار آنکھوں کو خونبار کر دیا

پریشاں کر گئی فریادِ بلبل
کسو سے دل ہمارا پھر لگا تھا

بدن میں اس کے ہے ہر جائے دلکش
جہاں اٹکا کسو کا دل بجا تھا

بدحال ہو کے چاہ میں مرنے کا لطف کیا
دل لگتے جو موا کوئی عاشق بھلا ہوا

نکلا گیا نہ دام سے پُرپیچ زلف کے
اے وائے یہ بلا زدہ دل مبتلا ہوا

کیا کہوں کیا طرح بدلی یار نے
چاؤ تھا دل میں سو اب غم ہو گیا

دل بستگی میں کھلنا اس کا نہ اس سے دیکھا
بخت نگوں نے ہم کو سو بار آزمایا

عاشق جہاں ہوا ہے بے ڈھنگیاں ہی کی ہیں
اس میرِ بے خرد نے کب ڈھب سے دل لگایا

شاید کہ دل تڑپنے سے زخم دروں پھٹا
خوں ناب میری آنکھوں سے منھ پر رواں ہوا

ٹک رکھ لے ہاتھ تن میں نہیں اور جائے زخم
بس میرے دل کا یار جی اب امتحاں ہوا

وے تو کھڑے کھڑے مرے گھر آئے پھر گئے
میں بے دیار و بے دل و بے خانماں ہوا

سر کھینچا دودِ دل نے جہاں تیرہ ہو گیا
دم بھر میں صبح زیرِ فلک کیا سماں ہوا

دل لے کے میری جان کا دشمن ہوا اندان
جس بے وفا سے اپنے تئیں پیار ہو گیا

لوگوں نے پائی راکھ کی ڈھیری میری جگہ
اک شعلہ میرے دل سے اٹھا تھا جلا گیا

دل دے کے جان میر نے پایانِ کار دی
یہ سادہ لوح طرح نئی سے دل لگا گیا

خون کر کے دل نہ ٹک ان نے لیا
کشتہ و مردہ ہوں اس اسرار کا

دلبراں دل جنس ہے گنجائشی
اس میں کچھ نقصان نہیں سرکار کا

غم ہجر رکھے گا بے تاب دل کو
ہمیں کڑھتے کڑھتے کچھ آزار ہو گا

اچنپتی ملاقات کب تک رہے گی
کبھو تو تہہ دل سے بھی یار ہو گا

تجھے دیکھ کر لگ گیا دل نہ جانا
نہ روؤں کیونکہ علی الاتصال اس بن کیں
دل جو ناگاہ بے قرار ہوا
مرغِ دل کی ہے رہائی سے مراد اب جمع
کشو کے بال درہم دیکھتے میرؔ
نکالی سرکش نے چال ایسی کہ دیکھ حیرت سے رہ گئے ہم
نہ ہوش ہم کو نہ صبر دل کو نہ شور سر میں نہ زور پا میں
تھا اندوہ گرہ مدت سے دل میں خوں ہو درد ہوا
نیں راہِ عشق میں تو آگے ہی دو دلا تھا
ہجر میں جی ڈہا گرا ہی ہے
دل کی تسلی جب کہ ہو گی گفت و شنود سے لوگوں کی
ملتی نہیں ہے آگہ اس آئینہ رُو کی میرؔ
بھڑکی دروں میں آتش سوزندہ عشق کی
مارے ہی ڈالے ہے جس کا زندگی میں اضطراب
ضعف ہے اس کا مرض اور اس کے غم سے الغرض
جو کوئی اس بے وفا سے دل لگاتا ہے بہت
ڈھونڈتے اس کو کوچے کوچے پھرے
کیا کہیں ہے حالِ دل درہم بہت
اضطراب اس کا نہیں ہوتا ہے کم
اس گلی سے جی اچٹتا ہی نہیں
صاف میداں لامکاں سا ہو میرا دل کھلے
مر گئے بہتیرے صاحب دل ہوس کس کو ہوئی
دل یہی نہ جس کو دل کہتے ہیں اس عالم کے بیچ
شاد وے جواب جواں تازہ ہوئے ہیں شہر میں
دل گئے آفت آئی جانوں پر
عرش و دل دونوں کا ہے پایہ بلند
خورشید و ماہ دونوں آخر نہ دل سے نکلے

کہ اس سنگ دل سے ہمیں پیار ہوگا
کہ جی کے رندھنے سے جوں ابر دل بھی بھر آیا
اس سے نہ جانے کیا قرار ہوا
پُرشکن بالوں میں وہ اس کے گرفتار ہوا
ہوا ہے کام دل برہم ہمارا
دلوں میں کیا کیا ہمارے آیا کریں سو کیا بس چلا نہ اپنا
جو رو دیں کس کس کو روویں اب ہم وفا میں کیا کیا گیا نہ اپنا
چاہ نے بدلے رنگ کئی اب جسم سراسر زرد ہوا
پُر پیچ پیش آیا ان زلفوں کا دوراہا
ضعف سے حالِ دل خراب ہوا
آگ بھڑکے گی غم کی بدن میں اس میں جلئے بھنئے گا
وہ دل جو رے کے جاوے جگر تو ہے کیا عجب
دل رہ گیا ہے پہلو میں ہو کر کباب اب
ساتھ مرے دل گڑا تو آچکا مرنے کا خواب
دل بدن میں آدمی کے ایک ہے خانہ خراب
وہ ستم گر اس ستم کش کو ستاتا ہے بہت
دل نے ہم کو کیا خراب بہت
کڑھتے ہیں دن رات اس پر ہم بہت
ہاتھ بھی رکھتے ہیں دل پر ہم بہت
دل جگر کرتے ہیں پتھر ہم بہت
تنگ ہوں معمورۂ عالم کی دیواروں کے بیچ
ایسے مرنے جینے کی ان عشق کے ماروں کے بیچ
کاش یہ آفت نہ ہوتی قالب آدم کے بیچ
دل زدہ ہم شیب میں رہتے ہیں اپنے غم کے بیچ
یہ فسانہ رہا زبانوں پر
سیر رہتی ہے ان مکانوں پر
آنکھوں میں پھر نہ آئے جی سے مرے اتر کر

کیا حالِ زارِ عاشق کریئے بیاں نہ پوچھو
سننے کیے جو تونے پتھر کی سل میں تو کیا
مشکل ہے دل داریٔ عاشق وہ برسوں بےتاب رہے
ایسے دردِ دل کہنے کو میرؔ کہاں سے جگر آوے
ہجراں کی سختیوں سے پتھر دل و جگر ہیں
دل دھڑکے ہے جو بجلی چمکے ہے سوئے گلشن
چپ رہ اب نالوں سے اے بلبل نہ کر آزارِ دل
ابتدائے خبط میں ہونا تدارک کچھ تو تھا
تنگی و وسعت سے اس کی ہے عبارت سازِ فہم
طریقِ عشق میں ہے رہنما دل
قیامت تھا مروّت آشنا دل
رُکا اتنا خفا اتنا ہوا تھا
نہ تھی سہل استقامت اس کی لیکن
گئے وحشت سے باغ و راغ میں بھی
ہمہ تن میں الم تھا سو نہ جانا
ہوا پژمردہ و بے صبر و بے تاب
ہوئے پروانہ واں دلبر کو یاں میرؔ
یک توجہ میں رہے ہے سیر اس کی عرش پر
باغ سے بے دشت تک رکھتے ہیں اک شورِ عجب
اب سبک روحی سے جوں بادِ سحر در در پھرے
جیسے مارا اسے پھر کر نہ دیکھا
لب تو ہماری طرف سے آتا دل کو پتھر مت کریو
جب غبار اپنے دل کا نکلے ہے
پوچھتے راہ شکستہ دل کی جا نکلے تھے کعبے میں
شعلہ اک اٹھا تھا دل سے آہِ عالم سوز کا میرؔ
بہلانے کو دل باغ میں آئے تھے سو بلبل
وہ دیکھے ہم کو آکر جس سے نہ دیکھے ہو دیں

کرتا ہے بات کوئی دل کی تو چشم تر کر
اے آہ اس صنم کے دل میں بھی ٹک اثر کر
بے طاقت اس دل کو میرے ہاتھ میں اپنے ٹک
گرمِ سخن لوگوں میں ہو کوئی بات کہے تو رو لے ٹک
صبر اس کی عاشقی میں کوئی کرے کہاں تک
پہنچے مبادا میرے خاشاکِ آشیاں تک
کم دماغی ہے بہت مجھ کو کہ ہوں بیمارِ دل
اب کوئی سنبھلے ہے مجھ سے وحشتِ بسیارِ دل
میرؔ کچھ سمجھے گئے نہ معنیٔ اسرارِ دل
پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل
مُوئے پر بھی مرا اس میں رہا دل
کہ آخر خون ہو ہو کر بہا دل
خرامِ نازِ دلبر لے گیا دل
کہیں ٹھہرا نہ دنیا سے اٹھا دل
گرہ یہ درد ہے پہلو میں یا دل
کرے گا اس طرح کب تک وفا دل
اٹھا کر ہو چکا جور و جفا دل
عقل میں آتے نہیں ہیں طرفہ طرفہ کارِ دل
ہم اسیرانِ قفس کے نالہ ہائے زارِ دل
زندگی اب یار بن اپنے ہوئی ہے بارِ دل
ہمارا طرفہ ظالم سے لگا دل
سختی سے ایام کی اب تک جیتے رہے ہیں مَر مَر ہم
دیر رہتی ہے آندھی کی سی دھوم
سوچ دہاں جو گزرا جی میں آئے کدھر سے کیدھر ہم
ڈھیری ہوئی ہے خاکستر کی جس کی لپٹیں جل کر ہم
چلّانے لگی ایسی کہ بیزار ہوئے ہم
آزردہ دل شکستہ خاطر کبیدہ مردم

دھوپ میں جلتے ہیں پہروں اس کے آگے میرؔ جی
رہتے دکھلائی نہیں دیتے بلاکش اس کے
کام کچھ آئی نہ دل کی بھی کشش
عشق میں کیونکر بسر کریے گا عمر
اس سے گھبرا کے جو کچھ کہنے کو آ جاتا ہوں
نہ سمجھو مجھے بے خبر اس قدر
گرمیٔ عشق ہے بکلی بھی جو ہمدم دل میں
آنکھ لگی ہے جس سے اس سے آنکھ لگے زنہار
دل کو جانا تھا گیا وہ گیا ہے افسانہ
تحریر رازِ دل کی مشکل ہے کریے کیونکر
کچھ ڈر نہیں جو داغ جنوں ہو گئے سیاہ
کیا بے قرار دل کی تسلی کرے کوئی
بے تاب دل دفن نہ ہو کاش میرے ساتھ
استقامت سے ہوں جوں کوہ قوی دل لیکن
ہلا سو ہو میں میرؔ اب تو دم بخود ہوں پھر ہیں
ہاتھ بے سبحہ ٹک رہا نہ کبھو
کرتا دعا مجھے وہ دغا باز دیکھ کر
آہوں سے میری دُود کے گھر بھر گیا ہے سب
دیکھیں تو کارِ بستہ کی کب تک گرہ کھلے
ٹھہرا ہے رونا آٹھ پہر کا مرا علاج
آزار کش کو اس کے آزار ہے ہمیشہ
اس سے حصول مطلب اپنا ہوا نہ ہوگا
حالاتِ عشق رنج و بلا درد و بلا مصیبت
جو گرسنہ دل تھا اس دیدار کا
ادا و ناز سے دل لے چلا تو ہنس کے کہا
ہوس اسیروں کے ٹک دل کی نکلے کچھ شاید
وصالِ ہجر ٹھہر جائے کچھ نہ کچھ آخر

زنگی سے دل کی ٹھہرے ہیں گنہگاروں میں ہم
جی کھپے جاتے ہیں دل اپنے دیے جاتے ہیں
کھنچ رہا ہے ہم سے وہ ابرو کماں
دل لگا ہے جس سے سو نامہرباں
دل کی پھر دل میں لیے چپکا چلا جاتا ہوں
تہہ دل سے لوگوں کے آگاہ ہوں
روز و شب شام و سحر میں تو جلا جاتا ہوں
نیند آتی ہے دلجمعی میں سو تو دل کو قرار نہیں
روز و شب ہم بھی کہانی سی کہا کرتے ہیں
کاغذ قلم ہمارے کب محرم آشنا ہیں
ڈر دل کے اضطراب کا ہے اس بہار میں
کچھ بھی ثبات ہے ترے عہد و قرار میں
رہنے نہ دے گا لاش کوئی دن مزار میں
ضعف سے عشق کے ڈھہتا ہوں گرا جاتا ہوں
کیا لکھوں تہہ دل کی باتیں کاغذ و محرم نہیں
دل کا منکا ڈھلے پھرا نہ کبھو
بولا کہ اس فقیر کے دل میں دغا نہ ہو
سدھ ہمنشیں لے دل کی کہیں وہ جلا نہ ہو
دل بستگی ہے یار کے بندِ قبا کے ساتھ
تسکین دل ہے یعنی کچھ اب اس دوا کے ساتھ
آزردہ دل کسو کا بیمار ہے ہمیشہ
باآنکہ کام دل کا اظہار ہے ہمیشہ
دل دادہ میرؔ جانے، کیا جانے دل بلادہ
اپنے جینے ہی سے اب وہ سیر ہے
کہ میرے پاس تمہارا بھی یادگار رہے
کوئی دن اور اگر موسم بہار رہے
جو بے قرار مرے دل کو بھی قرار رہے

یا رب نسیم لطف سے تیرے کہیں کھلے
نیں نے کہا کہ آتشِ غم میں جلے ہے دل
مدت سے تو دلوں کی ملاقات بھی گئی
رنجیدگی ہماری تو بس سہل ہے ولے
خاطر ہی کے علاقے کی سب ہیں خرابیاں
دل میں مسوّدے تھے بہت پر حضورِ یار
تلاش دل کی جو دلبری سے ہمارے پیس آتھیں ہے ہے
گیا تھا رات دروازے پہ اس کے
لگا کہنے کہ یہ تو ہمنشیں ہے
ہم رو رو کے دردِ دلِ دیوانہ کہیں گے
سودائی و رسوا و شکستہ دل و خستہ
دل پر جو اختیار تو ہرگز نہ کریے عشق
اب کی دل ان سے بچ گیا تو کیا
رہتا نہیں ہے رکھے تھمتا نہیں تھمائے
خط نہ لکھتے تھے سو تاب دل گئی
سُن سانحاتِ عشقی ہنس کیوں نہ دو پیارے
کڑھا کرے ہیں ہوا ہے مُوردِ جہاں اجسام جب سے اپنا
تسلّی نہ ہو دل اگر یار سے
بات واعظ کی مؤثر ہو دلوں میں کیونکر

دل اس چمن میں غنچہ سا کب تک رہا کرے
وہ سرد گرم ہو کر بولا جلا کرے
ظاہر کا پاس تھا سو مدارات بھی گئی
آزردہ دل کسو کو نہ اتنا ستائیے
اپنا ہو بس تو دل نہ کسو سے لگائیے
نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے
ستم رسیدہ شکستہ دل وہ گیا بھی خوں ہو کے یاں کہاں ہے
ق فقیرانہ دعا کر جو صدا کی
صدا ہے دل خراش اس ہی گدا کی
جی میں ہے کہو حال غریبانہ کہیں گے
اب لوگ ہمیں عشق میں کیا کیا نہ کہیں گے
پرہیز کریے اس مرضِ جانگداز سے
چور جاتے رہے کہ اندھیاری
دل اب تڑپ تڑپ کر اک ظلم کر رہا ہے
دفتروں کی اکثر اب تحریر ہے
کیا جانو تم کسو سے دل ٹک لگا نہیں ہے
غمِ جدائی جہانِ جاں کا ہمارے دل میں جہاں جہاں ہے
ہمیں سالہا ہمکناری رہے
دن کو طامات رہے شب کو مناجات ہے

جگر (کلیجہ)

دیوان اول

ہر زخم جگر داورِ محشر سے ہمارا
تک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
دل کا نہیں ٹھکانا بابت جگر کی گم ہے
گریہ پہ رنگ آیا قیدِ قفس سے شاید
لختِ دل سے جوں چھڑی پھولوں کی گوندھی ہے ولے
کثرت میں درد و غم کے نہ نکلی کوئی طپش
دشمنوں سے کسی کا اتنا ظالم
اب دل کے تئیں دیا تو سمجھا
دل زخمی ہوکے تجھ تئیں پہنچا تو کم نہیں
تم سے اس خاک اڑانے کی دھمک سے اے مری وحشت
جگر چاکی ناکامی دنیا ہے آخر
جوں برگ ہائے لالہ پریشان ہوگیا
پیغامِ غم جگر کا گلزار تک نہ پہنچا
گو نہ چلا، تا مژہ تیر نگاہ
ذوقِ پیکان تیر میں تیرے
تیرِ بلا کا ہر دم اب میرؔ ہے نشانہ
گلہ نہیں ہے مجھے اپنی جانگدازی کا
بوئے کباب سوختہ آئی دماغ میں
تیر جو اس کمان سے نکلا
میرؔ مست عذر گریاں کے پھٹے جیسے کاکر
ہر دم طرف ہے ایسے مزاج کرخت کا
حریف بنے جگر ہے صبر درنہ کل کسی صحبت میں

انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا
کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا
تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا
خوں ہوگیا جگر میں اب داغ گلستاں کا
فائدہ کچھ اے جگر اس آہ بے تاثیر کا
کوچہ جگر کے زخم کا شاید کہ تنگ تھا
ٹکڑے ٹکڑے جگر نہ ہو گا
محنت زدوں کے جگر نہ ہو گا
اس نیم کشتہ نے بھی قیامت جگر کیا
کلیجہ یک صحرا کا بھی دس دس گز اچھلتا تھا
نہیں آئے جو میرؔ کچھ کام ہو گا
مذکور کیا ہے اب جگر لخت لخت کا
نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہنچا
اپنے جگر سے تو گزر کر گیا
مدتوں تک جگر نے چھن دیکھا
پتھر جگر ہے اس کے آفت رسیدگاں کا
جگر پہ زخم ہے اس کی زباں درازی کا
شاید جگر بھی آتشِ غم نے جلا دیا
جگرِ مرغِ جان سے نکلا
زخمِ دل چاکِ جگر تھا کہ سلایا نہ گیا
ٹکڑا مرا جگر ہے کہو سنگِ سخت کا
نیاز و ناز کا جھگڑا گرد تھا ایک جرأت کا

خاطر نشاہ اے صید فگن ہوگی کب تری
دیکھا ہے صید گہ میں ترے صید کا جگر
چمن میں دیکھ نہیں سکتے سک کر جھتا ہے
مجلس میں میں نے اپنا سوزِ جگر کہا تھا
یہ اتصال اشکِ جگر سوز کا کہاں
کیا دن تھے کہ خون تھا جگر میں
دھڑکا تھا دل طپیدنِ شب سے سو آج صبح
جگر میں اپنے باقی روتے روتے
کبھو جو آنکھ سے پچھتے ہیں آنسو
مجھ کو پوچھا بھی نہ کون ہے غمناک ہنوز
آہ نالے مت کیا کر اس قدر بیتاب ہو
جاتا رہا نگاہ سے جوں موسم بہار
یہی دردِ جدائی ہے جو اس شب
آہ کرنے میں دم کو سادھے رہ
کہیں پہنچو جو مجھ بے پاؤ سر تک
بھیتے ہیں اور روتے ہیں لختِ جگر ہے میرؔ
کیا بلبلِ اسیر ہے بے بال و پر کہ ہم
حذر کہ آہِ جگر تفتگان بلا ہے گرم
ہزار حیف کہ در گیر صحبت اس کو نہیں
گہہ لوہو ٹپکتا ہے گہہ لختِ دل آنکھوں سے
ترے تیرِ ناز کے جو یہ ہدف ہوئے ہیں ظالم
پلکوں سے ترے شائق ہم سر جو ٹپکتے ہیں
زیارت کروں دل سے خستہ جگر کی
گہے داغ رہتا ہے دل گہہ جگر خوں
ترے غم کا شکرِ نعمت کروں کیا لے منچے میں
آئے سموم جائے صبا باغ سے سدا
ناوک سے میرؔ اس کے دل بستگی تھی مجھ کو

تیروں کے مارے میرا کلیجہ تو چھن گیا
بانکہ چھن رہا تھا یہ ذوقِ خدنگ تھا
جگر میں برق کے کانٹا مجھ آشیانے کا
روتی ہے شمع تب سے بے اختیار ہر شب
روتی ہے یوں تو شمع بھی کم کم تمام شب
رو اٹھتے تھے بیٹھ دو پہر رات
دیکھا وہی کہ آنسوؤں میں چو پڑا جگر
ق اگرچہ کچھ نہیں ہے ہمنشیں پر
تو بھر جاتا ہے پانی سب زمیں پر
ہو چکے حشر، میں پھرتا ہوں جگر چاک ہنوز
اے ستم کش میرؔ ظالم ہے جگر بھی دل کے پاس
آج اس بغیر داغِ جگر ہیں سیاہ پوش
تو آتا ہے جگر مژگان تر تک
کہتے ہیں دل سے ہے جگر نزدیک
کہ پہنچا شمع سان داغ اب جگر تک
کرتے سنا ہے یوں کوئی قیمہ جگر کو ہم
گل کب رکھے ہے ٹکڑے جگر اس قدر کہ ہم
ہمیشہ آگ ہی بہتے ہے یاں ہوا ہے گرم
جگر کی آگ نے ہنگامہ کر رکھا ہے گرم
یا ٹکڑے جگر ہی کے ہر آن ٹپکتے ہیں
مگر آہنی ترے ہیں جگر نیاز منداں
ہر دم جگروں میں کچھ کانٹے سے کھٹکتے ہیں
کہاں ہوگا یا رب مزارِ گریباں
ان آنکھوں سے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں
نہ ہوا کہ میں نہ کھایا جگر کباب تجھ بن
گرشتہ اپنے سوزِ جگر کا میں جا کہوں
پیکاں جگر سے میرے دشوار کھینچتے ہیں

ہے امرِ سہل چاہت لیکن نباہ مشکل
کچھ نہ پوچھو کہ آتش غم سے
کہیں خلک کو کو اس کے تو صبا نہ دیجو جنبش
رندِ مفلس جگر میں آہ نہیں
ہائے اس زخمیِ شمشیرِ محبت کا جگر
تری ہی جستجو میں گم ہوا ہے کہہ کہاں کھویا
اب تو جگر کو ہم نے بلا کا ہدف کیا
نالۂ شب نے کیا ہے جو اثر مت پوچھو
دل خراشی و جگر کاوی و سینہ کوبی
خوباں کا کیا جگر جو کریں مجھ کو اپنا صید
سعی اتنی یہ ضروری ہے اٹھی بزم سنگ
گنوا ئیں اس سلوک سے دیکھا نہ کر مجھے
چشم نمناک و دل پُر جگر صد پارہ
گھٹا شمع ساں کیوں نہ جاؤں چلا
کچھ تھی طپش جگر کی تو بارے مزاج داں
جو آنسو پی گیا میں آخر کو میرؔ ان نے
بُجھتے ہیں دل اک جانب سنکتے ہیں جگر یک سو
شمع صفت جب کبھو مر جائیں گے
نہ مہکے بوئے گل اے کاش یک چند
نیلا نہیں سپہر مجھے اشتباہ ہے
کھینچا تھا آہِ مشعلہ فشاں نے جگر سے سر
ہر اشک مرا ہے درِ شہوار سے بہتر
نہ تنہا داغ تو سینے پہ میرے اک چمن نکلے
جگر میں سوزنِ خرگاں کے تئیں کدھب نہ گڑا
دمِ اک جان وبال ہے کوئی دم جو ہے تو عذاب ہے
بیٹھا جگر سے اپنے کھینچوں ہوں اس کے پیکان
نالے جو آج سنتے ہیں سو ہیں جگر خراش

پتھر کرے جگر کو تب تو کرے دعائیں
جگر و دل کباب ہیں دونوں
کہ بھرے ہیں اس زمیں ہیں جگرِ جگر زنگاں
جان محزوں ہے اور کیا ہے یاں
درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو
جگر خوں گشتہ دل آزردہ میرؔ اس خانہ ویراں کو
انداز اس نگاہ کا پھر تیر کیوں نہ ہو
ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے جگر مت پوچھو
اپنے ناحق میں ہیں سب اور ہنر مت پوچھو
پہچانتا ہے سب کوئی تیرے شکار کو
اے جگر تفتگی بے اثر پروانہ
برچھی سا لاگ جا ہے جگر میں تری نگاہ
دولتِ عشق سے ہم پاس بھی تھا کیا کیا کچھ
تپ غم جگر کو سرے کھا گئی
پر دل کی بے قراری مری جان کھا گئی
چھاتی جلا جگر ہیں اک آگ جا لگائی
ہے مجلسِ مشتاقاں دکان کبابی کی
ساتھ لیے داغِ جگر جائیں گے
ابھی زخمِ جگر سارے ہیں آلے
دُودِ جگر سے میرے یہ چھت سیاہ ہے
برسوں تئیں پڑے ہوتے جنگل جلا گیے
ہر لختِ جگر رشکِ عقیقِ یمنی ہے
ہر اک لختِ جگر کے ساتھ سوزِ جسم کہن نکلے
کسو کے زخم کو تنے کبھو سیا بھی ہے
دل داغ گشتہ کباب ہے جگرِ گداختہ آب ہے
جینے کی اور سے تو خاطر مری نشاں ہے
کیا جانیے قفس میں گرفتار کون ہے

ایسا اسیرِ خستہ جگر میں سُنا نہیں
چاکِ جگر کو میرے بر جا ہے جو کہو تم

داغ ایک ہو جلا بھی خوں ایک ہو بہا بھی
کہتا ہے کون تجھ سے کہ اے سینہ وک نہ جا

تدبیرِ جیبِ پارہ نہیں کرتی فائدہ
ہم ساری ساری رات رہے گریہ ناک لیک

لوہے کے توے ہیں جگر اہلِ محبت
کچھ تم کو ہمارے جگروں پر بھی نظر ہے

اس شوق کو ٹک دیکھ کہ چشم بگملاں ہے
آب خِضر سے بھی نہ گئی سوزشِ جگر

داغوں سے ہے چمن جگرِ میرؔ دہر میں
جگر میں طاقت کہاں ہے اتنی کہ دردِ ہجراں سے مرتے رہیے

چندے سپہر چھاتی ہماری جلا کرے
جگر منہ تک آئے نہیں بولتے

تیری گلی سے جب ہم عزمِ سفر کریں گے
طاقت نہیں ہے جی میں نے اب جگر رہا ہے

صید افگنوں ہمارے دل کو جگر کو دیکھو
اس واسطے کانپوں ہوں کہ ہے آہ نپٹ سرد

خورشید تیرے چہرے کے آگو نہ آ سکے
ہم جگر سوختہ کے جی میں جو آوے تو ابھی

دے ہے جنبش جو خاک کو باؤ

ہر آہ میرؔ جس کی ہے جانکاہ کون ہے
گر زخم ہے تو یہ ہے ناسور ہے تو یہ ہے

اب بحث کیا ہے دل سے کیا گفتگو جگر سے
اتنا تو ہو کہ آہ جگر سے نکل سکے

ناصح جگر کا چاک سِلا جو سِلا سکے
مانندِ شمع داغ جگر کا نہ دھو سکے

رہتے ہیں ترے تیرِ ستم ہی کے نشانے
آتے ہو جو ہر شام و سحر تیر لگانے

جو زخمِ جگر کا مرے ناسور ہوا ہے
کیا جانیے یہ آگ ہے کس دود ماں سے

ان نے بھی گل چُنے بہت اس گلستاں سے
ہزاروں وعدے وصال کے تھے کوئی بھی جیتے وفا کروگے

اب داغ کھاتے کھاتے کلیجے تو پک گئے
غرض ہم بھی کرتے ہیں کیا کیا گئی

ہر ہر قدم کے اُوپر پتھر جگر کریں گے
پھر دل بستم رسیدہ اک ظلم کر رہا ہے

اک تیر کا ہدف ہے اک تیغ کا سپر ہے
یہ باد کلیجے کے کہیں پار نہ ہووے

اس کو جگر بھی شرط ہے جو تاب لا سکے
دُودِ دل ہو کے فلک تجھ میں سرایت کیجیے

جگر داغ داغ نکلے ہے

دیوان دوم

وہ ترک مست کسو کی خبر نہیں رکھتا
کہیں شکار زبوں ہوں جگر نہیں رکھتا

ستم کا اس کے بہت میں نزار ہوں مجنوں
جگر تمام ہوا خون و دل بجا نہ رہا

شاید جگر گداختہ یک لخت ہو گیا
کچھ آب دیدہ رات سے خوں ناب سا ہوا

بارے کل بھڑ گئے اس ظالم خونخوار سے ہم
منصفی کیجے تو کچھ کم نہ جگر ہم نے کیا

ان ابرو و مژہ سے کب میرے جی میں ڈر تھا
تیغ و سناں کے منہ پہ اکثر مرا جگر تھا

بہت دنوں سے دھڑکتے میں اضطراب سا تھا
جگر تمام ہوا خون تب قرار آیا

نہ پوچھ مہندی لگانے کی خوبیاں اپنی
جگر ہے خستہ ترے پنجۂ حنائی کا

نہ اُنس مجھ سے ہوا اس کو میں ہزار کیا
جگر میں داغ ہے اس گل کی بے وفائی کا

کڑھے عشق میں کوئی یوں کب تک
جگر آہ منہ تک تو آنے لگا

اب وہ جگر طپش سے تڑپتا ہے تشنہ لب
مدت تلک جو میر کا لوہو پیا کیا

گھٹتے شمشیر زنی سے کفِ نازک میں ہیں
یہ جگر داری تھی کس خوں کے سزاوار کے بیچ

جگر میں کس کے ترے ہاتھ سے نہیں سوراخ
فلک تلک تو ترا زخمی خدنگ ہے شوخ

پہنچی شاید جگر تک آتش عشق
اشک ہیں سب شرار کے مانند

اسیر کرکے نہ لی تو نے تو خبر صیاد
اڑا کیے مرے پرکالۂ جگر صیاد

منہ پر آویں گے سخن آلودۂ خونِ جگر
کیونکہ بارانِ نہاں سے چاک ہے دل جوں انار

کلیجہ چھن گیا پر جان سختی کش بدن میں ہے
ہوئے اس شوخ کے ترکش کے سارے تیر بھی آخر

پہروں شبوں کو غم میں ترے جاگتے رہے
ہو آہنی جگر جو کرے بے وفا کے پاس

خونِ جگر ہی کھانا آغازِ عشق میں ہے
رہتی ہے اس مرض میں پھر کب غذا کی خواہش

روزِ ازل سے آئے ہیں ہوتے جگر کباب
کیا آج کل سے عشق کی یارو جلی ہے آگ

انگارے سے نہ گرتے تھے آگے جگر کے لخت
جب تک ہماری گود میں اب تو بھری ہے آگ

جس نگیں میں کی جگر کاوی بہت
کیا نکلتا ہے کسو کا نام سہل

حنا لگی ترے ہاتھوں سے میں گیا پیسا
جگر تمام ہوا خون مجھ کو تیرے پا کی قسم

برگِ گل جوں گزر آب سے آتے ہیں چلے
رونے سے وو ہیں مرے لختِ جگر پانی میں

تیرِ ستم کا تیرے ہدف کب تلک رہوں
آخر جگر ہے لوہے کا کوئی توا نہیں

آگے یہ آنکھیں گلے کا ہار رہتی تھیں روز
اب جگر میں خون نہیں دے سہرے سے آنسو کہاں

اب دھوآں یوں جگر سے اٹھتا ہے
کیا یونہی آب و تاب سے ہو بیٹھے کارِ عشق
زنہار اپنی آنکھ میں آتا نہیں وہ صید
بے طاقتی میں شب کی پوچھو نہ ضبط میرا
جگر تو چھن گیا تیروں کے مارے
ہم کاڑھ کر جگر بھی آگے تمہارے رکھا
کچھ اس کی بند مٹھی اس باغ میں گذرے ہے
مداوا نہ کرنا اے مشفق ہمارا
جگر سب جل گیا لیکن زبان جلتی نہیں اپنی
لوہو نہ کیوں رُلائے ان کا گداز ہونا
جی دیے بن وہ دُرِ مقصود کب پایا گیا
کیا کہیے داغ دل کے ٹکڑے جگر ہے سارا
دوڑدنے کو کوئی آہوں سے یوں کب تک بوڑ دیوے
نہ ٹھہری ایک بھی چشمک بسانِ برق آنکھوں میں
کبھو میرؔ اس طرف آکر جو چھاتی کوٹ جاتا ہے
حنائے یار کا پنجہ نہیں ہے گل کے رنگ

جیسے پُر پیچ کوئی کاکل ہو
سوکھے جگر کا خوں تو رواں جوئے شیر ہو
پھوٹا دو سار جس کے جگر میں نہ تیر ہو
ہاتھوں میں دل کو رکھا دانتوں تلے جگر کو
تمہاری کس طرح خاطر نشاں ہو
پھر یا نصیب اس پر تم جو ہوئے کبیدہ
جو زخمِ جگر اپنے جوں غنچہ چھپا جاوے
جراحت جگر کے لگے دُکھنے دُونے
مبادا اس آتشیں خُو کو مخالف کچھ لگا دیوے
یہ دل جگر ہمارے غمخوار ایسے ہی تھے
بے جگر تھے میرؔ صاحب جان کھوتے رہ گئے
جانے وہی جو کوئی ظالم وفا کرے ہے
مبادا عشق کی گرمی جگر میرا جلا دیوے
کلیجہ جل گیا اے عمر تیری تو شتابی سے
خدا شاہد ہے اپنا تو کلیجہ ٹوٹ جاتا ہے
ہمارے ان نے کلیجے میں ہاتھ ڈالا ہے

دیوان سوم

جگر کی سپر پھوٹ جانے لگی
کس روز یہ اندوہِ جگر سوز تھا آگے
اگر وہ ماہ نکل گھر سے ٹک ادھر آتا
میرؔ تیر ان جور پیشوں کے جو کھائے بیشمار
دیوانگی عاشق کی سمجھو نہ لباسی ہے
فکرِ جگر رہے ہے اس دم غلام کو بھی
سب آتش سوزندہ دل سے ہے جگر آب
ملے تھے میرؔ سے ہم کل کنارِ دریا پر
بہت پیکانِ تیر یار ٹوٹے

بلا توڑ ہے ناوکِ آہ کا
کس شب لب و یارب تھی مری یونہی خدایا
تو رک کے منہ تئیں کا ہے کو شب جگر جاتا
چھاتی اب چھلنی ہے میری ہے جگر چھانا ہوا
صد پارہ جگر بھی ہے ہم جامہ دریدوں کا
جس دم تگو ہو کرنے تم عشق میرؔ صاحب
بے صرفہ کرے صرف نہ کیوں دیدۂ تر آب
فتیلہ مُو وہ جگر سوختہ ہے جیسے اتیت
تمام آہن ہے میرا اب جگر بند

اے مرغ چمن صبح ہوئی زمزمہ سر کر
دم کھینچ تہہ دل سے کوئی ٹکڑے جگر کر

فرہاد سے پتھر پہ ہوئیں صنعتیں کیا کیا
دل جا کے جگر کاوی میں کچھ تو بھی ہنر کر

وہ نہیں جو میرؔ اب چھاتی جلے
کھا گیا سارے جگر کو ہائے داغ

جگر کو ہے ان سرے گزروں کے عشق
گئے ہو ہمارے قدم پر قدم

نہیں ہوں بے ادب آشنا کر گل سے دل لگاؤں میں
جگر ہو ٹکڑے ٹکڑے جب چمن کی اور جاؤں میں

رو چکا خون جگر سب اب جگر میں خس کہاں
غم سے پانی ہو کے کب کا بہہ گیا ہوں میں کہاں

تری پلکیں چبھتی نظر میں بھی ہیں
یہ کانٹے کھٹکتے جگر میں بھی ہیں

بھرے رہتے ہیں سارے پھول ہی جس کے گریباں میں
وہ کیا جانے کہ کھٹکے ہیں جگر کے میرے داماں میں

شرر سے اشک ہیں اب چشم تر میں
لگی ہے آگ اک میرے جگر میں

جگر سوز ہیں اس کے لعل خموش
طلب کریے بوسہ تو باتیں بنائیں

میں نالہ کش تھا صبح کو یادِ حبیب میں
سوراخ پڑ گئے جگرِ عندلیب میں

آگے تو اشک پانی سے آجلتے تھے کبھو
اب آگ ہی نکلنے لگی ہے جگر سے یاں

مصرع کوئی کوئی کبھی موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

کرتا جگر ضرور ہے دلدادگاں کو بھی
وہ بولتا نہیں تو تم آپھی سے چھیڑ لو

میں کیا کہوں جگر میں مرے لوہو کم ہے کچھ
کچھ تو الم ہے دل کی جگہ اور غم ہے کچھ

الماس میرؔ تجھ کو کیا عشق نے دیا ہے
لختِ جگر گرے ہیں جوں لعل پارے پارے

ہوتا تھا گاہ گاہ ہے محسوس درد آگے
اب دل جگر ہمارے پھوڑے سے ہیں پکتے

معلوم اگلی کی سی تو جرأت الم کشی میں
کیا کام نکلے گا اب ٹکڑے ہوئے جگر سے

آتی ہے گرم بادِ صبا اس کی اور سے
اپنے جگر کے جلنے کے بارے سبب ہیں یہ

خدا جلنے ہے اپنا تو جگر کانپا ہی کرتا ہے
چڑھی تیوری سے محبوبوں کی اور ابرو کی چینوں سے

ہم پہ رہتے ہو کیا کمر کستے
اچھے ہوتے نہیں جگر خستے

دیوانِ چہارم

شاید جگر حرارتِ عشقی سے جل گیا
ہوا غم مجھے خوں جگر میں نہیں
کیسے کیسے رُک گئے ہیں میرؔ ہم
جگر خوں کیا چشم نم کر گیا
دل ملت خوں کیا ہی کیسے ہم جگر کو پھر
کیا دل کو خوں کیا کہ تڑپنے لگا جگر
ایسا ہے قیمہ کیا کہ اب ہے حساب پاک
لختِ جگر کے غم میں کہ تھا لعل پارہ میرؔ
نہ جگر میں ہے نہ ہے دل میں خون
اب نہیں ہوتی چشم تر افسوس
اندھا دھند روتے ہیں آنکھوں سے خوں
گو ضبط کرتے ہو دیں جراحتِ جگر کے زخم
حال زخم جگر سے ہے درہم
کب تک دل کے ٹکڑے جوڑوں میرؔ جگر کے لختوں سے
روتے ہی رہنا اکثر یہ چاہتا ہے سو تو
کیا میرؔ اس کی نوکِ پلک سے سخن کرے
جگر کا لوہو جو پانی ہو بہہ نکلتا ہے
اس شاخِ گل سے قد کی کیا چوٹ لگ گئی ہے
قمری کا لوہو پانی ہوا ایک عشق میں
گرمی سے عاشقی کی آخر کو ہو رہا کچھ
کیا اضطرابِ عشق سے میں حرف زن ہوں میرؔ
زخم دامن دارِ جگر سے جامہ گزاری ہو نہ گئی
ہو میری آنکھوں میں آتا نہیں
رنگ محبت کے ہیں کتنے کوئی تمہیں خوش آوے گا
شوق چھپا کر پچھتائے سوکھ گئے رنجور ہوئے

کل درد دل کہا سو مرا منہ ابل گیا
اگر آنسو آتے کوئی تھم رہا
مدتوں منہ تک جگر آتا رہا
گیا دل سو ہم پر ستم کر گیا
گر پھول گل سے کوئی گھڑی جی بہل گیا
یکتائے روزگار ہیں ہم اس ہنر کے بیچ
کیسے جو کچھ بھی باقی ہوا پنے جگر کے بیچ
رخسارِ زرد پر ہے مرے خوں رواں ہنوز
درپئے خوں ہے روزگار ہنوز
بہہ گیا خون ہو جگر افسوس
نہیں دیکھتے ہم جگر کی طرف
روتا نہیں ہے کھول کے دل رازدارِ عشق
کاش دیکھتے کسو طرف مرہم
کسب نہیں ہے پارہ دوزی میں کوئی وصال نہیں
تاب اب نہیں ہے دل میں نے خون ہے جگر میں
سر تیز چھریاں گڑتی جگر دل تلک گئیں
سو ہو چکا کہ مری چشم اب پُرآب نہیں
جو دل جگر ہوئے ہیں خوں ایک بار دونوں
آتا ہے اس کا خون جگر آبجو کے ساتھ
پانی ہوا ہے کچھ تو میرا جگر جلا کچھ
منہ تک جگر تو آنے لگا گفتگو کے ساتھ
ظلم نمایاں اب جو کوئی ایجاد کرو تو بہتر ہے
جگر کے مگر زخم سب بھر گئے
خون کر دگے یا دل کو یا داغ جگر پہ جلاؤ گے
یعنی آنسو پی پی گئے سوزِ جمِ جگر ناسور ہوئے

زخم نہ ہوویں کیونکر غائر چھاتی میں دل خستوں کے
کیا ضعف تن میں ہے جگر و دل و دماغ بن

تیر نگاہ یار جگر پر لگتے ہوئے پیہم دیکھے
پوچھے جو اس قشون میں سردار ہو کوئی

دیوانِ پنجم

رنگ سراپا اس کا ہوا ہے آگے دل خوں کرتی تھی
بہت کیا تھا پتھر میں سوراخ کیے ہیں درفشوں نے
لختِ جگر بھی اپنا یاقوتِ ناب سا ہے
سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا
کئی داغ ایسے جلائے جگر پر
گیا پی جو ان آنسوؤں کے تئیں میں
ٹکڑے جگر کے میرے مت چشم کم سے دیکھو
خونِ جگر کو سوکھے ہوئے برسوں ہو گئے
جل جل کے ہو گیا ہے کبد تو کباب میرؔ
عشق کو جرأت و جگر ہے شرط
بچتے نہیں ہیں بوزدگی سے گلوں کی میرؔ
ہوا تھا میرؔ مشکل عشق میں کام
شاید جگر کا کام تمامی کو کھینچ گیا
لختِ دل آنکھوں سے گرا سو ٹکڑا لعل کا تھا گویا
صبر بلائے عشق پہ حوصلے والے کرتے ہیں
دل میں درد جگر میں طپیدن سر میں شور آشفتہ دماغ
بے قراری میں نہ دلبر سے اٹھا ہرگز ہاتھ
اس عاشق دیوانہ کی مت پوچھو معیشت
آنسو ہو کر خونِ جگر کا بے تابانہ آیا تھا
میرؔ غریب کے کیسے معارض گوشے ہیں اس وادی کے
نفع کبھو دیکھا نہیں ہم نے ایسے خرچ اٹھانے پر
نہ سوزِ جگر خاک میں بھی گڑا
جو کوئی خستہ جگر عشق کا آزادی ہے

اب ہے جگر یک لختِ افسردہ اس کے رنگِ حنائی کا
چھید جگر میں کر دینا یہ کام ہے محزوں نالوں کا
قطرہ سرشک کا ہے ڈُبا تمہیں ہمارا
اس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا
کہہ دے نرگسی نین تھے گل ہائے تر پر
سراسر ہیں اب داغ سطحِ جگر پر
کاڑھے ہیں یہ جواہر دریا کو میں بلو کر
رہتی ہیں میری آنکھیں شب و روز تر ہنوز
جوں غنچہ ناشگفتہ ہے داغِ جگر ہنوز
زردیٔ رنگ و چشمِ تر ہے شرط
گو طائرانِ خستہ جگر ہوں ہزار الگ
کیا پتھر جگر تب کی دوا میں
یا لوہو روتے رہتے تھے یا چشم نم نہیں
نصب کروں گا میرؔ جگر پر خوش رنگ ایسے نگینے کو
رحمت ہے اس خستہ جگر کو دل جس کا بیتاب نہ ہو
کیا کیا رنج اٹھائے گئے ہیں جب سے ان سے جدائی ہوئی
عشق کرنے کے تئیں شرط جگرداری ہے
دنداں بہ جگر دل بدست داغ بسر ہے
شاید رات شکیبائی کی جلد بہت کچھ رخصت تھی
ایک دیا سا بجھتا ان نے داغِ جگر پہ جلایا ہے
دل کے گداز سے لوہو روئے داغِ جگر پہ جلائے بھی
موئے پر پُر آتش مری قبر ہے
جی چکا وہ کہ یہ بے طرح کی بیماری ہے

کھینچ کے اپنا تیغہ ہردم کیا لوگوں کو ڈراتے ہو — میرؔ جگر دار آدمی ہے وہ کب مرنے سے ڈرتا ہے

دیوان ششم

بلا تھی کوفت کچھ سوزِ جگر سے — ہمیں تو کوٹ کوٹ ان نے جلایا
سوز دروں سے مجھ پہ ستم بُرملا ہوا — ٹکڑا جگر کا آنکھوں سے نکلا جلا ہوا
کرنا وفا نہیں ہے آسان عاشقی میں — پتھر کیا جگر کو تب چاہ کو نباہا
ہے عشق میں جو حال بتر تو ہے کیا عجب — مرجائے کوئی خستہ جگر تو ہے کیا عجب
ایسے دردِ دل کہنے کو میرؔ کہاں سے جگر آوے — گرم سخن لوگوں میں ہو کوئی بات کرے تو رو لے ٹک
رہے ہے غش و درد دو دو پہر تک — سرِ زخم پہنچا ہے شاید جگر تک
دل کا جگر کا لوہو تو غم نے کھا دیا — آنکھیں رہیں گی دیکھئے تحس بار کب تلک
سینے میں تیر اس کے ٹوٹے ہیں بے نہایت — سوراخ پڑگئے ہیں سارے مرے جگر میں
بیماریٔ جگر کی شفا سے ہے دل جمع — اب دوستی سے مصلحتاً کچھ دوا کرو
دل خوں جگر کے ٹکڑے جب میرؔ دیکھتا ہوں — اب تک زباں سے اپنی میں کچھ کہا نہیں ہے

سینہ (چھاتی)

دیوان اول

چھاتی سے ایک بار لگاتا جو وہ تو میرؔ
چھتیے جو ضعف ہو کر زخم رِساہے اس کے
دل خستہ جو لہو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
گنج کاوی جو کی سینے کی غم ہجراں نے
اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک
دل جو تھا ایک آبلہ، پھوٹا، گیا
دل تفتگی کی اپنی ہجراں میں شرح کیا دوں
بہا تو خوں ہوا آنکھوں کی راہ بہہ نکلا
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں
جس دم کہ تیغ عشق کھینچی بوالہوس کہاں
دل نہیں ہے منزلِ سینہ میں اب
بنجر زمین دل کی ہے میرؔ بلک اپنی
داغ اور سینے میں کچھ بگڑی ہے عشق دیکھیں
اِک آگ لگ رہی ہے سینوں میں کچھ نہ پوچھو
سوراخ ہے سینے میں ہر ایک شخص کے تجھ سے
سر مار کر ہوا تھا میں خاک اس گلی میں
کون سی رات زمانے میں گئی جس میں میرؔ
لگنے کے لیے دل کے چھڑکا تھا نمک میں نے
سینہ دشنوں سے چاک تا نہ ہوا
ٹھہرا گیا نہ ہو کے حریف اس کی چشم کا
رکنے سے دل کے آج بچا ہوں تو اب جیا

برسوں یہ زخم سینے کا ہم کو نہ سالتا
سینے کو چاک دیکھا دل کو فگار پایا
کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا کبھو درد و غم سے فگار تھا
اس دفینے میں سے اقسام جواہر نکلا
پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا
رات کو سینہ بہت کوٹا گیا
چھاتی تو میرؔ میری جل کر ہوتی ہے تابا
رہا جو سینۂ سوزاں میں داغدار رہا
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا
سُن لیجیو کہ ہم ہی نے سینہ سپر کیا
یاں سے وہ بے چارہ سفر کر گیا
پُر داغ سینہ مہری فرمان ہے ہمارا
دل کو جگر کو کس کو اب درمیان دے گا
جل جل کے ہم ہوئے ہیں اس بن کباب کیا کیا
کس دل سے تھا تیر نگہ پار نہ پایا
سینے پہ مجھ کو اس کا منظور نقش پا تھا
سینۂ چاک سے نیں دست و گریباں نہ ہوا
سو چھاتی کے زخموں نے تا دیر مزا رکھا
دل جو عقدہ تھا سخت وا نہ ہوا
سینہ کو توڑ تیر نگاہ پار ہو گیا
چھاتی ہی میں رہا ہے مرا دم تمام شب

کیا داغوں سے رشکِ باغ اے صد آفریں الفت
چاکِ سینہ سے کھل گئے ٹانکے
ایک دن اس کو لکھا تھا مَیں نے اپنا دردِ دل
یہ دیکھ سینہ داغ سے رشکِ چمن ہے یاں
کیا لطف ہے دگر نہ جس دم وہ تیغ کھینچے
داغوں ہی سے بھری رہی چھاتی تمام عمر
کھلے سینے کے داغوں پر ٹھہر رہتے ہیں کچھ آنسو
دوزخ کیا ہے سینہ مرا سوزِ عشق سے
سینہ تو کیا فضلِ الٰہی سے سبھی چاک
سینہ سپر کیا تھا جن کے لیے بلا کا
اپنے کوچے میں فغاں جس کی سنو ہو ہر رات
کیا تیرِ ستم اس کے سینے میں بھی ٹوٹے تھے
زیرۂ الماس یا مشک نمک ہے کیا بُرا
سینۂ پُر داغ کا احوال مَیں پوچھوں جوں نسیم
یک لحظہ سینہ کوبی سے فرصت نہیں ہمیں
کبھو دل رُکنے لگتا ہے جگر گاہے تڑپتا ہے
کہیں دستِ چالاک ناخن نہ لاگے
صافیٔ شست سے ہے غرضِ مشقِ تیر سے
نزدیک سوزِ سینہ کے رکھ اپنے قلب کو
کیا کرے وصل سے مایوس دلِ آزردہ جو
دل جگر جل یہ بھسمنت ہوئے سینے میں
تری گلگشت کی خاطر بنا ہے باغ داغوں سے
قفس میں میسّر نہیں جوشِ داغ سینے پر
دن رات مری چھاتی جلتی ہے محبت میں
کیا جانوں لذّتِ درد اس کی جراحتوں کی
جس سے لے سے ملاؤں دُکھا ہی ہوئے ہے
سینے سے تیر اس کا دل کو تو لیتا نکلا

یہ سینہ ہم کو بھی تھا ایسا ہی درکار بس بہتر
کیا رفو کم ہوا ہے سینے پر
آج تک جاتا نہیں سینے سے خامے کے شگاف
بلبل ستم ہوا نہ جو تو نے بھی کھائے گل
سینہ سپر کریں ہم قطع نظر کرو تم
یہ پھول گل چنا کیے باغِ وفا سے ہم
چمن میں مہر ورزی کے گل و شبنم ہیں یہ دونوں
اس دل جلے ہوئے کے سبب ہوں عذاب میں
ہے وقت دعا میرؔ کہ اب دل کو لگا ہوں
وے بات بات میں اب تلوار کھینچتے ہیں
وہ جگر سوختہ و سینہ جلا مَیں ہی ہوں
جس زخم کو چیروں ہوں پیکان نکلتے ہیں
جو مَیں اپنے ایسے زخمِ سینہ کو مرہم کروں
یہ بھی تختہ کبھو ہووے گا سزاوارِ چمن
یعنی کہ دل کے جلنے کا ماتم بہت ہے یاں
غمِ ہجراں میں چھاتی کے ہمارے جم ہیں یہ دونوں
کہ سینہ ہے قرب و جوارِ گریباں
سینہ کشو کا خانۂ زنبور کیوں نہ ہو
وہ دل ہی کیمیا ہے جو گرم گداز ہو
زخم ہی یار کا چھاتی سے لگا رکھتا ہو
گھر کو آتش دی محبت نے جلا کیا کیا کچھ
پرِ طاؤس سینہ ہے تمامی دست گلدستہ
ہوس نکالی ہے ہم نے بھی گل کے موسم کی
کیا اور نہ تھی جاگہ یہ آگ جو یاں دابی
یہ جانوں ہوں کہ سینہ سب چاک ہو گیا ہے
سینے میں جل کے ازبس دل خاک ہو گیا ہے
پر ساتھوں ساتھ اس کے نکلی اک آفریں بھی

چھن گیا سینہ بھی کلیجہ بھی
سینۂ مجروح بھی قابل ہوا ہے سیر کے
خنجرِ بے داد کو کیا دیکھتے ہو دم بدم
پا برہنہ خاک سر میں مُو پریشاں سینہ چاک
پیکانِ خدنگ اس کا یوں سینے کے اودھر ہے
مشتِ نمک کو مَیں نے بیکار کم رکھا ہے
دہی سمجھا نہ ورنہ ہم نے تو
متاعِ سینہ سب آتش ہے فائدہ کس کا
بجا ہے سینہ کوبی سنگ سے سب خون ہوتے ہیں
ہماری آہوں سے سینہ پہ ہو گیا بازار
سر تو کٹوا ہی چکے میرؔ تڑپ سے تو بچیں
بیٹھی جو تیغ یار تو سب تجھ کو کھا گئی
رکا جاتا ہے جی اندر ہی اندر آج گرمی سے
جو کھولوں سینۂ مجروح تو نمک چھڑکے
چھاتی کے میرے سارے نمودار ہیں یہ زخم
کس دَور میں اٹھایا مجھ سینہ سوختہ کو
واں آرسی ہے وہ ہے یاں سنگ ہے چھاتی ہے
سینہ چاکی بھی کام رکھتی ہے
آتش ہے سوزِ سینہ ہمارا اگرچہ میرؔ

یار کے تیر جان لے جا بھی
ایک دن تو آن کر یہ زخم سارے دیکھئے
چشم سے انصاف کی سینے ہمارے دیکھئے
حال میرا دیکھنے آ تیرے ہی دلخواہ ہے
جوں مار سیہ کوئی کاٹے ہوئے پھن بیٹھے
چھاتی کے زخم میرے مدت مزا رکھیں گے
زخم چھاتی کے سب دکھائے تھے
خیال یہ ہے مبادا دکان جل جاوے
جو ہمدم ایسے جلتے ہیں تو ماتم سخت ہوتا ہے
ہر ایک زخم کا کوچہ جو تنگ تھا آ گئے
جو ٹک اک پاؤں رکھے چھاتی پہ جلاد رہے
اے سینہ تیرے زخم اٹھانے کو عشق ہے
بلا سے چاک ہی ہو جائے سینہ کچھ ہوا آوے
جراحت اس کو دکھانے کا کچھ مزا بھی ہے
پردہ رہا ہے کون سا اب کیا چھپاؤ ہے
پیوند ہو زمین کا جیسا یہ آسمان ہے
گزرے ہے جو کچھ ہم پہ سو اس کی بلا جانے
یہی کہ سینہ تنگ معطل ہے
نالے سے عاشقوں کے کبوتر کباب ہے

دیـوان دوم

سینہ کوبی سنگ سے دل خون ہونے میں ہی
ادھر کھلی مری چھاتی ادھر نمک چھڑکا
کیا کہوں کیا طرحیں بدلیں چاہ نے آخر کو میرؔ
استخوان سب پوست سے سینے کے آتے ہیں نظر
تڑپے ہے جبکہ سینے میں اُچھلے ہے دو دو ہاتھ
چھاتی کبھو نہ ٹھنڈی کی لگ کر گلے سے آہ

حق بجانب تھا ہمارے سخت ماتم ہو گیا
جراحت اس کو دکھانے میں اب مزہ نہ رہا
تھا گرہ جو درد چھاتی میں سو اب غم ہو گیا
عشق میں ان نوخطوں کے میرؔ میں مسطر ہوا
گر دل یہی ہے میرؔ تو آرام ہو چکا
دل اس وجہ سے سینے میں اکثر جلا کیا

دس روز آگے دیکھا تھا جیسا کو اب نہیں
سوزش وہی تھی چھاتی میں مرنے تلک مرے
کھا گیا ناخن سر تیز جگر دل دونوں
سیکھی ہے طرح سینہ فگاری کی سب مری
مجروح ہے سب سینہ تس پہ ہے نمک پاشی
غیرت سے میرؔ صاحب سب جذب ہو گئے تھے
بلبل کا آتشیں دم دل کو لگا ہمارے
کیا کہوں بیتابیٔ شب ہے کہ ناچار اس بغیر
اب چھاتی کے جلنے نے کچھ طور بدل ڈالا
سینے میں شوق میرؔ کے سب درد ہو گیا
ملک میں لگا تھا اس نمکی شوخ کے گلے
رکھتا ہاتھ میں سر رشتہ بہت سینے کا
کام کیا تھا جیب و دامن سے مجھے پیش از جنوں
آخر دکھائی عشق نے چھاتی فگار کر
اک صبح میری چھاتی کے داغوں کو دیکھ کر
جب تک شگفتہ تھے کچھ آشنا جی رُکے تھا
اب اس کے غم سے جو کوئی چاہے سو کھائے داغ
کیا لالہ ایک داغ سے پھولے ہے باغ میں
آخر کو روئے کار سے پردہ اٹھے گا کیا
یا اب ہمیشہ جلتی ہی رہتی ہیں چھاتیاں
گہ نوچ لیا منہ کو گہے پیٹ لی چھاتی
دیکھیں چمن جو سینۂ پُر داغ سے بڑھیں
رہا ہے کون سا پردہ ترے ستم کا شوخ
سامنے سے ملک ٹلے تو دق نہ ہو
چھاتی قفس میں داغ سے ہو کیوں نہ رشک باغ
درستی جیب کی اتنی نہیں ہے اے ناصح
پتھروں سے سینہ کوبی میں نے کی

دل رہ گیا ہے سینے میں جل کر کباب سا
اچھا ہوا نہ داغ جگر کا لگا ہوا
رات کی سینہ خراشی میں ہُنر ہم نے کیا
لٹتے تھے ساتھ چاک دل ایسا اتا کیا
آنکھوں کے لڑانے کا ہم خوب مزا دیکھا
نکلا نہ لوند لوہو سینہ جو ان کا چیرا
ایسا کنھوں نے جیسے چھاتی میں بان مارا
دل مرے سینے میں دو دو ہاتھ اچھل کر رہ گیا
سب درد ہو شدت کا اس دل ہی کو دل ڈالا
دل پر رکھا تھا ہاتھ سو منہ زرد ہو گیا
چھاتی کے میرے زخموں نے برسوں مزا رکھا
رہ گیا دیکھ رفو چاک مرے سینے کا
سینہ چاکی اپنی میں بیٹھا کیا کرتا تھا لات
تصدیع کھینچی ہم نے یہ کام اختیار کر
یہ پھول گل بھی زور رہے ہیں بہار کر
پچھتائے ہم نہایت سینے کے چاک سی کر
باقی نہیں ہیں چھاتی میں اپنی تو جائے داغ
بہتیرے ایسے چھاتی پہ ہم نے جلائے داغ
مقدور بھر تو چھاتی کے ہم نے چھپائے داغ
یہ کیسی عاشقوں کے دلوں میں رکھی ہے آگ
دل تنگیٔ ہجراں سے ہیں مغلوب غضب ہم
بے داد ہے یہ قطعۂ گلزار درمیاں
کہ زخم سینہ ہمارے سبھی نمایاں ہیں
آسمان چھاتی پہ اپنے سل ہے میاں
جوشِ بہار تھا کہ ہم آئے اسیر ہو
بنے تو سینۂ صد چاک دے سلا مجھ کو
دل کے ماتم میں مری چھاتی سراہ

یاد جب آتی ہے وہ زلف سیاہ
تصدیع ایک دو دن ہووے تو کوئی کھینچے
کی سیر ہم نے سینۂ یکسر فگار کی
لوح سینہ پر مرے سو نیزۂ خطی لگے
گلے اس مہ رو نے لگ کر ایک دو رات
زخم اس کے ہاتھ کے جو سینہ پہ ہیں نمایاں
دل کے تو زخم کا کچھ ہوتا نہیں تدارک
چھاتی کہیں پھٹ جائے کہ ٹک دل بھی ہوا کھائے
خمیازہ کش رہے ہے اسے میرے شوق سے تو
وے ہی یہ چھاتیاں ہیں زخموں سے جو بھری ہیں
جلنے کو جلتے ہیں سب کے اندرونے میرؔ لیک
ہے میرؔ عجب کوئی درویش برشتہ دل
چھاتی رکی رہے ہے جو کہتے نہیں ہیں آہ
کیا جانیے کہ چھاتی جلے ہے کہ داغ دل
چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے
تماشا کردنی ہے داغ سینہ
کیا جانیے کہ عشق میں خوں ہو گیا کہ داغ
لگا رہتا ہے سینے ہی سے بیٹھا ہوں کہ سوتا ہوں
گرم آ کر ایک دن وہ سینے سے لگ گیا تھا
سوراخِ سینہ میرے رکھ ہاتھ بند مت کر
سوزِ سینے کا بھی دلچسپ بلا ہے اپنا
شب جوشِ غم سے جس دم لگتا ہے دل تڑپنے
کیا سینے کے جلنے کو ہنس ہنس کے اڑاتا ہوں
چھاتی کے داغ یکسر آنکھوں سے کھل رہے ہیں

سانپ سا چھاتی پہ پھر جاتا ہے آہ
تڑپے جگر ہمیشہ چھاتی جلے ہمیشہ
اس تختے نے ہے اب کی قیامت بہار کی
خستگی اس دل شکستہ کی اسی بابت ہوئی
مہینوں تک مری چھاتی جلائی
چھاتی لگے رہیں گے زیرِ زمیں بھی سالے
گو چاکِ سینہ تونے میرا سیا پیارے
اب دم تو لگے رکنے ہمارے خفگی سے
سینے کے زخم کے کہہ کیونکر رہیں گے ٹانکے
کیا ہے جو بوالہوس نے دو چار کھائے چرکے
جب کسی کی اس دتیرہ سے کہیں چھاتی جلے
بات اس کی سنو تم تو چھاتی ہی جھلس جاوے
یاں لطف تب تلک ہی ہے جب تک ہوا ہے
اک آگ سی لگی ہے کہیں کچھ دھواں سا ہے
اک آگ سی رہے ہے کیا جانیے کہ کیا ہے
یہ پھول اس بغچے میں تازہ کھلا ہے
چھاتی میں اب تو دل کی جگہ ایک درد ہے
غرض چھاتی مری داغ جدائی نے جلا دی ہے
تب سے ہماری چھاتی ہر شب جلا کرے ہے
ان روزنوں سے دل تک کسب ہوا کرے ہے
داغ جو نکلے ہے چھاتی سے لگا نکلے ہے
ہر زخم سینہ اس دم اک چشم تر نے ہے
جب آگ کوئی گھر کو اس طور لگا جائے
دیکھیں ابھی محبت کیا کیا ہمیں دکھائے

دیوانِ سوم

سینہ کوبی ہے طپش سے غم ہوا
دل کے جانے کا بڑا ماتم ہوا

چہرے کو نوچ نوچ لیا چھاتی کوٹ لی
جانے کا دل کے ہم نے بہت غم الم کیا

شب روؤں ہوں ایسا کہ جدھر بار کا گھر تھا
جاتا ہوں گلے چھاتی تک ادھر کو اتر آب

چمن کے غم میں سینہ داغ ہے میرؔ
بہت نکلی ہماری بھی ہوس بس

اب نہیں سینے میں میرے جائے داغ
سوزِ دل سے داغ ہے بالائے داغ

بلبل کو تازہ کیوں نہ خیابانِ گل پہ ہو
کیا جانے جی نے چھاتی پہ بھر کر نہ کھائے گل

ہر دم جبیں خراشی ہر آن سینہ کاوی
حیرانِ عشق تو ہیں پر گرم کار ہیں ہم

کہتے ہیں بہار آئی گل پھول نکلتے ہیں
ہم کنجِ قفس میں ہیں دل سینوں میں جلتے ہیں

پٹ گئے سوراخ دل کے غم میں سینے کوٹتے
سل تو پتھر کی نہیں آخر مری چھاتی ہے میل

داغوں سے بھر گیا ہے مرا سینۂ فگار
گل پھول زرد زرد کھلے اس بہار میں

گھبرا کے یوں لگے ہے سینے میں دل تڑپنے
جیسے اسیر تازہ بے تاب ہو قفس میں

پوچھے تو کوئی سینہ خراشی دکھائیے
سو تو نہیں ہے حرف و شکایت ٹھہرے بیل

جیتے سے سینے تک ہیں کیا کیا خراشِ ناخن
گویا کہ ہم نے منہ پہ تلواریں کھالیاں ہیں

فرہاد و قیس و کوہکن تو دشت گرد تھے
منہ نوچیں چھاتی کوٹیں یہی ہم ہنر کریں

ستم کے تیر اس کے میرے سینے میں بہت ٹوٹے
کیا جاتا ہے مشکل فرق اب دل اور پیکان میں

سینے کے اپنے زخم کے خاطر جمع ہو کیا
دل ہی کی اور پاتے ہیں سب لوہو کا بہاؤ

کیا فقط توڑ کے چھاتی ہی گیا تیر اس کا
لے گیا صاف مرے دل کو بھی پیکان کے ساتھ

سینے کے زخم نمایاں رہتے چاک کیے سو پردۂ در
مدت سے یہ رخنے پڑے تھے چھاتی پھٹی میں ابسی ہے

خوں عشق کی گرمی سے سوکھا جگر و دل میں
اک بوند تھی لوہو کی اب چھاتی جو جیری ہے

اس شکار افگن کے ہم بھی صید ہیں
خاک و خوں میں لوٹتے چھاتی پھینے

کہیں آگ آہِ سوزندہ نہ چھاتی میں لگا دیوے
خبر ہوتے ہی ہوتے دل جگر دونوں جلا دیوے

گئی گرم اختلاطی کب کی ان سحر آفرینوں سے
لگے رہتے ہیں اب داغِ جگر ہی اپنے سینوں سے

گلے لگ کر نہ یک شب کاش وہ مر سو گیا ہوتا
مری چھاتی جلا کرتی ہے اب کتنے مہینوں سے

کرے ہے داغ اس کا عید کو سب سے گلے ملنا
اکٹ لی ہے نئی یہ میری چھاتی کے جلانے کی

دیوان چہارم

سوز سینے کا بہت بھڑکا جلا تن مارا
جامہ زیبوں نے عجب آگ پہ دامن مارا

ڈرتا ہوں مالکانِ جزا چھاتی دیکھ کر
کہنے لگیں نہ واہ رے زخم اس کے ہاتھ کا

نہ سوزِ دروں فصلِ گل میں چھپا
سرو شینہ سے داغ نے گل کیا

اک آگ لگا دی ہے چھاتی میں جدائی نے
وہ مہ گلے لگتا تو یوں دل نہ جلا جاتا

رہی آتی آندھی سی سینے میں میرؔ
بہت دن تڑپنے کا اودھم رہا

پاؤں چھاتی پہ میری رکھ چلتا
یاں کبھو اس کا یوں گزارا تھا

چھاتی پہ سانپ سا پھر جاتا ہے یاد میں اس کے بالوں کی
جی میں لہر آوے ہے لیکن رہتا ہوں من مار اپنا

کاش کے ہو جائے سینہ چاک چاک
رکتے رکتے جی بھی گھبرایا ہے اب

سخت ہیں کیا ایام جدائی دشواری سے کٹتے ہیں
دن دیواروں سے سر ماروں پتھر ہے چھاتی پر رات

ہوئے تختے چمن کے چھاتیاں اے عشق داغوں سے
بہار آنے سے پہلے ایسی گل کاری کا کیا باعث

ہے میرے جو سرشک دمادم کا رنگ سرخ
ریزش کا اس کا تختہ ہے سینے کا رنگ سرخ

چھاتی پھٹ جاتی جو یوں رک کر نہ کرتا ترکِ چشم
گزرے اس کے عشق میں جی پر ستم حد سے زیاد

عشق و محبت یاری میں کیا لطف رکھے ہے کرنا ضبط
چھاتی پہ ہو جو کوہ الم کا تو بھی نالہ و آہ نہ کر

چھاتی جلی ہے کیسی اڑتی جو یہ سُنی ہے
واں مرغِ نامہ بر کا کھایا کباب کر کر

طائرِ دل کو طپش سینے میں جانو تم بسمل کا رقص
ان ہی رنگوں ہوتا ہے کچھ اس صد طرفہ دل کا رقص

چھاتی جلوں کے آگے کھنچتا ہے بیشتر دل
اک آشنا ہے تجھ سے اس باغ میں شقائق

یوں تو گرہ سینے میں ہمارے درد و الم کی ہو کے رہا
کس سے ظاہر کرتے جاکر کام بہت مشکل ہے دل

بجلی سا مرکب اس کا کڑک کر چمک گیا
لوگوں کے سینے پھٹ گئے جانیں دھڑک گئیں

یار ہمارا آساں کیا کچھ سینہ کشادہ ہم سے ملا
خون کرے ہیں جیب دل کو وے بند قبا کے کھولے ہیں

چاک سینے کے ہمارے نہیں سینے اچھے
انہی رخنوں سے دل و جان ہوا لیتے ہیں

داغ فراق سے کیا پوچھو ہو آگ لگائی سینے میں
چھاتی سے وہ مہ نہ لگا ٹک آگ اس بھی سینے میں

پنبہ داغ کیسے ہے کیا کیا اچھے نہ ہونے والے تھے
زخموں پر چھاتی کے میرے رکھ دیکھو نہ مرہم بھی

باغِ وفا سے ہم نے پھل پایا سو یہ پایا
سینے میں چاک کم ہے اب دل انار سے بھی

خستہ ہو اپنا کیسا بھی کوئی پھر بھی گلے سے لگاتے ہیں
وحشت ایک تمہی کو دیکھی اپنے سینہ فگاروں سے

ہے پتھر سا چھاتی میں میری کثرتِ غم کی حیرت سے
کیا کہیے ہیلے سے دل کے سخت اذیت پائی ہے

ہاتھ دل پر زور سے اپنے نہ رکھا چاہیے
چاک کی چھاتی مری جراح نے سی ہے ابھی

معشوقوں کی گرمی بھی اے میرؔ قیامت ہے
چھاتی میں گلے مل کر ٹک آگ لگا دیں گے

روزِ وداع لگا چھاتی سے وہ جو خوش پرکار گیا
دل تڑپے ہے جان کھپے ہے سینہ سارا جلتا ہے

کس سے سبب پوچھوں میں یارب اپنی سوزشِ سینہ کا
چھاتی جو جلتی رہتی ہے ات گت آگ گریباں والی ہے

دیوان پنجم

دل کے خوں ہونے کا غم کیا اب سے تھا
سینہ کوبی سخت ماتم کب سے تھا

سینہ زنی سے غمزدگی ہے سر دھننا ہے، رونا ہے
دل جو ہمارا خون ہوا ہے اس سے بلا ماتم ہے اب

جبہ نوچا منہ نوچا سب سینہ نوچا ناخن سے
میرؔ نے کی ہے غم غصے میں اپنی یہ بدحال طرح

اپنے موئے بھی رنج و بلا ہے ہمسایوں کی جانوں پر
کیا کیا سینہ زنی رہتی ہے درد و غم کے فسانوں پر

سینہ میں میرے کب سے اک سینک سی رہے ہے
قلب و کبد نہ ہو دیں دونوں کباب کیونکر

کیا کہیے میاں اب کے جنوں میں سینہ اپنا اکثر داغ
ہاتھ گلوں سے گلدستے ہیں شمع نمط ہے سر پر داغ

جلتی چھاتی پہ سنگ زنی کی ہم سختیٔ ایام سے میرؔ
گرمی سے میری آتش دل کی سارے ہوئے وے پتھر داغ

اب جو چھاتی جلی فی الواقع لطف نہیں ہے شکایت کا
جگر کو کیا ہوتا ہے یوں پھوٹے دل کے پھپھولے تک

دل ہے داغ جگر ہے ٹکڑے رہ جاتے ہیں چپکے سے
چھاتی سراہیے ان لوگوں کی جو چاہت کو نباہے ہیں

نگہ عزلت میں اس ابرو کماں کی ہے ادھر یعنی
لگا تیر اس کا چھاتی میں ہماری گوشہ گیری میں

ہمیشہ رونا کڑھنا سینہ کوبی ہر زماں کرنا
عزا خانہ کیا دل کے مرے ماتم نے دنیا کو

بند نہیں جو کرتے ہو تم سینے کے سوراخوں کو
جی کے رکن میں ان رخنوں سے شاید دل کو ہوا دو ہو

بات کہیں کیا چپکے چپکے دیکھو ہو آئینے کو
دیکھتے ہو تو دیکھو ہمارے جلتے توے سے سینے کو

مجروح اپنی چھاتی کو بخیہ کیا بہت
سینہ گتھا ہے میرؔ ہمارا رفو کے ساتھ

سینہ خالی آج پڑا ہے میرؔ طرف سے پہلو کے
دل بھی شاید نکل گیا ہے روتے خون جگر کے ساتھ

کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھری ہیں
جو آنسو مری آنکھ سے گرتا ہے شرر ہے

خلقت کی مگر الفت سے ہے سوزش سینہ کی
چسپاں مری چھاتی پہ دن رات رہا کی ہے

پتھر کی چھاتی چاہیے ہے میرؔ عشق میں
جی جانتا ہے اس کا جو کوئی وفا کرے

میرؔ کوئی اس صورت میں امید بہی کی کیا رکھے
ایک جراحت سینے کی میرے مر زخم کاری میں ہے

عشق و محبت کیا جانوں میں لیکن اتنا جانوں ہوں
اندر ہی اندر سینے میں میرے دل کو کوئی کھاتا ہے

اب سلگنے لگی ہے چھاتی بھی
یعنی مدت پڑے جلا کریے

زخمِ سینہ میرا اس کے ہاتھ کا
چھاتی مری سرد آہوں سے ہوتی تھی سب کرخت
اے کاش غور سے وہ دیکھے کبھو لک آ کر

ہو کوئی رجھوار تو اس کو بجھائیے
استخوان اب اس کے اشکِ گرم سے دھائے ہوئے
سینے کے زخم اب تو غائر ہوئے ہیں سارے

دیوانِ ششم

سوزشِ سینہ اپنے ساتھ گئی
پھیلے شگاف سینے کے اطرافِ درد سے
جانا کہ منہ کھلا ہے آتش کدے کا شاید
آتی ہے ایک نہایت ہی جگر سوز صدا
چھاتی کٹھی سنگ ہی سے دل کے جانے میں نہیں
عشق کرنا نہیں آسان بہت مشکل ہے
آنکھیں غصّے میں ہو گئی ہیں لال
دل اس قدر نہ رکھتا گھبراتا جی نہ آتنا
کریں گے چھاتی کو گلزار ہم جلا کر داغ
چھاتی کے جلنے سے ہی شاید کہ آگ سلگی
زنبور خانہ چھاتی غمِ دُوری سے ہوئی
آنکھیں پتھرائیں چھاتی پتھر ہے
جمع افگنی سے ان نے ترکش کیے ہیں خالی

خاک میں بھی ہمیں عذاب رہا
کوچہ ہر ایک زخم کا بازار ہو گیا
سینے کے زخم کا جو سر کا ہے ٹک بھی پھاہا
یعنی پھر رات سے چھاتی میں مری درد اٹھا
نعل سینوں میں جڑے جاتے ہیں اس عالم کے بیچ
چھاتی پتھر کی ہے ان کی جو دفا کرتے ہیں
سر کو چھاتی پہ رکھ کے خواب کرو
چھاتی لگا جو رہتا وہ سینۂ کشادہ
جو گل کے سینے میں ایسا ہی خار خار ہے
اٹھنے لگا دھواں اب میرے دل و جگر سے
وے ہم تلک نہ آئے کبھو کسر شان سے
وہ ہی جانے جو انتظار کرے
کس مرتبے میں ہوگی سینوں کی خستہ حالی

مُنہ (دہن — دہاں)

دیوانِ اوّل تا دیوانِ ششم

ہر صبح حادثے سے یہ کہتا ہے آسمان
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
آئے ہیں میرؔ منہ کو بنائے خفا سے آج
آخر کو خاک ہونا درپیش ہے سبھوں کو
منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
افسانے ماؤمن کے سنیں میرؔ کب تلک
دن رات کو کُھنچا ہے قیامت کی اُور میں
بے رُو و زلفِ یار ہے رونے سے کام یاں
زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں
نہ کھول اے یار میرا گور میں منہ
ایک کہتا ہوں میں تو منہ پہ رقیب
وجہ کیا ہے کہ میرؔ منہ پہ ترے
ٹک سن کہ سو برس کی ناموسِ خامشی کھو
اے چرخ مت حریفِ اندوہِ بےکساں ہو
منہ کریئے جس طرف کو سو ہی تری طرف ہے
آج سحر ہوتے ہی کچھ خورشید مرے منہ آن چڑھا
اوّلِ عشق ہی میں میرؔ جی تم رونے لگے
کوئی بات نکلے ہے دشوار منہ سے
نشرده مرے منہ سے یاں حرف نہیں نکلا
مضطرب اس آستاں سے اٹھ کے کچھ پایا نہ رُو
کہیں گے کہو تمہیں لوگ کیا یہی آرسی یہی تم سدا
کا ہے کو یہ اعراض تھا اعراض بتاں کا
اب خاک سی اڑے ہے منہ پر وگرنہ میرؔ
افراطِ شوق میں تو رہ بہت رہی نہ مطلق

دے جام خون میرؔ کو گر منہ وہ دھو چکا
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا
شاید بگڑ گئی ہے کچھ اس بے وفا سے آج
ٹک دیکھ منہ کدھر ہے قامت خمیدگاں کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
چل اب کے سو دیں منہ پر دوپٹے کو تان کر
پھرتا ہوں منہ پہ خاک ملے جا بجا ہنوز
دامن ہے منہ پہ ابر نمط صبح و شام یاں
بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں
کہ حسرت ہے مری جاگہ کفن میں
تیری پشتی سے سو سناتے ہیں
نظر آتا ہے کچھ ملال ہمیں:
دو چار دل کی باتیں اب منہ پہ آئیاں ہیں
کیا جانے منہ سے نکلے نالے کے کیا سماں ہو
پر کچھ نہیں ہے پیدا کیدھر ہے اے خدا تو
روک سکے ہے کون اسے سر جس کے ایسی شامت ہو
خاک ابھی منہ کو ملو نالہ و فریاد کرو
ٹک اک تو بھی تو سن کسو جاں بلب کی
جو بات کہ میں نے کی سو میرؔ حسابی کی
منہ رہا ہے کیا جو پھر اب اس کے در پر جائیے
نہ کسو کی تم کو ہے ٹک حیا نہ ہمارے منہ سے حجاب ہے
ظاہر ہے کہ منہ پھیر لیا ہم نے خدا سے
اس چشم گریہ ناک سے دریا بہا کیے
کہتے ہیں میرے منہ پر اب شیخ و شاب کیا کیا

آیا نہ پھر وہ آئینہ رُو ٹک نظر مجھے
ابر سا روتا جو مَیں نکلا تو بولا طنز سے
اب چھیڑ یہ رکھی ہے کہ پوچھے ہے بار بار
کیا اور جی رندے کسو کا تیرے ہجر میں
کبھوں کی خاک کوئی منہ پہ کب تلک ملتا
منہ اس کے منہ کے اوپر شام و سحر رکھوں ہوں
کہتے ہیں کوئی صورت بن معنی یاں نہیں ہے
وہ رنگ وہ روش وہ طرح سب گئی برباد
بس اب نہ منہ کھلاؤ ہمارا ڈھکے رہو
سنتا نہیں اگرچہ ہمارا نگار بات
ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
ہوا نہ وا درِ گلزار اپنے ڈھب سے کبھو
دیکھے اِدھر تو مجھ سے نہ یوں آنکھ وہ چھپاوے
رہتا تھا ابتدائے محبت میں منہ سفید
گزرے ہے بسکہ اس کی جدائی دلوں پہ شاق
دیکھ اس کے خط کی خوبی لگ جاتی ہے چپ ایسی
کلفت میں گزری ساری مدت تو زندگی کی
نازک مزاج آپ قیامت ہیں میرؔ جی
اے مجھ سے تجھ کو سو ملے تجھ سا نہ پایا ایک میں
ضبط بہتیرا ہی کرتے ہیں ولے
منہ نہ ہم جبریوں کا کھلواؤ
مقدور بھر تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں
قصد ہے کعبہ کا لیکن سوچ ہے
اس گل کی اور اپنا تب منہ کیا ہے مَیں نے
سخن کر شیئے تو ہووے حرف زن یوں
ہے منہ پہ میرؔ کے کیا گردِ ملال تازہ
کس سے جدا ہوئے ہیں کہ ایسے ہی دردمند

مَیں منہ پہ اپنے خاک ملے جا بجا پھرا
آرسی جا دیکھ گھر بوسے ہے منہ پہ تو رسا
کچھ وجہ بھی کہ آپ کا منہ ہے اگر رہا
سو بار اپنے منہ سے جگر تو گیا پھرا
خراب و خوار کہاں تک بھلا پھرا کرتا
اب ہاتھ سے دیا ہے سر رشتہ میں ادب کا
یہ وجہ ہے کہ عارف منہ دیکھتا ہے سب کا
آتے ہی تیرے باغ میں منہ گل کا فق ہوا
محشر میں ہم سوال کریں تو جواب کیا
پر منہ پہ آ ہی جاتی ہے بے اختیار بات
پر ہم سے تو تھمی نہ کبھو منہ پہ آئی بات
کھلا سو منہ پہ ہمارے قفس کا درِ صیاد
ظاہر ہے میرے منہ سے مرے مدعا کا رنگ
اب زرد سب ہوا ہے یہ ہے انتہا کا رنگ
منہ نوچ نوچ لے ہیں علی الاتصال ہم
گویا کہ مہر کی ہے ان نے مرے دہاں پر
آسودگی کا منہ اب دیکھیں گے ہم عدم میں
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو مَیں نشے میں ہوں
سو سو کہیں تو نے مجھے منہ پر نہ لایا ایک مَیں
آہ اک منہ سے نکل جاتی ہے گاہ
کہنے کو اختیار سا ہے کچھ
منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی
کیا ہے منہ جو اس کے در پہ جائیے
جب آشنا بتوں سے صلیٰ ملا کہا ہے
بس اب منہ موند لے مَیں نے سنا ہے
یہ خاک میں ہمیشہ یونہی رُلا کیا ہے
منہ میرؔ جی کا آج نہایت ہی زرد ہے

گیا شاید اس شمع رو کا خیال
اس کنج لب پہ چپکے ہوئے منہ کو رکھ کے ہم
بے گانہ جان ان نے کیا چوٹ رات کو کی
کیا پوچھتے ہو دب کے سخن منہ سے نہ نکلا
کہنے کو کہہ بیٹھے مہ بہتر ہے روئے یار سے
بوسہ اس بت کا لے کے منہ موڑا
رہ گئے منہ نہوں سے نوچ کے ہم
بر سے اگر شمشیر سروں پر منہ موڑیں زنہار نہیں
جیبھ سے سینہ تنگ ہیں کیا کیا خراشِ ناخن
مر گئے مر گئے نہیں تو نہیں
بہت ہرزہ گوئی کی یاں میر صاحب
جوشِ غم اٹھنے سے اک آندھی چلی آتی ہے میاں
ہم خاک منہ پہ مل کے نہ جوں آرسی پھرے
کبھی مَیں ان لبوں کی جانفزائی
بغیر از چہرۂ مہتابیٔ یار
روتا ہمیں نظر کر رہنا کیے کنارا
ہر چند مَیں نے شوق کو پنہاں کیا ولے
اتنی جبین رگڑی کہ سنگ آئینہ ہوا
دراسیری کا کھلا منہ پہ ہمارے کیا تنگ
آلودہ خونِ دل سے صد حرف منہ پہ آئے
کوہکن و مجنون و وامق میر آئے تھے صحبت میں
وہ آرسی کے آگے پہروں ہے بے تکلف
عشق میں دم مارا نہ کبھو تم چپکے چپکے میر کھپے
حسرت سے عاشقی کی پیری میں کیا کہیں ہم
دل خون ہو گیا تھا غم لکھتے سو رہے سب ہے
حرف و سخن اب تنگ ہوا ہے ان لوگوں کے ساتھ اپنا
گل کے دیکھے کا غش گیا ہی نہ میر

کہ اب میر کے منہ پہ کچھ نور ہے
دلچسپ اس مقام میں حرف و کلام کیا
منہ دیکھ دیکھ میرا پہچان کر کے مارا
کچھ دیکھتے ہی اس کو مجھے ایسا ادب آیا
شہر میں پھر ہم کو مشکل مُنہ دکھانا ہو گیا
بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا
گر ہوس ہے اسی قدر ہے بس
سیدھے جلنے والے ادھر کے کس کے پھیر چرتے ہیں
گویا کہ ہم نے منہ پر تلواریں کھالیاں ہیں
خاک سے منہ کو ڈھانکے ہم بھی ہیں
کر رو واں کے کچھ منہ دکھلانے کی باتیں
خاک سی منہ پہ مرے اس وقت اڑ جاتی ہے میاں
یاں پاس قطرہ آب اگر ہے سبیل ہے
یہ بلت اک بے خودی میں منہ پہ آئی
ہمارے منہ پہ چھوٹے ہے ہوائی
چڑھنا ہمارے منہ پہ دریا کی سے تہی ہے
اک آدھ لفظ پیار کا منہ سے نکل گیا
آنے لگا ہے منہ نظر اس آستاں کے بیچ
مر ہی رہئے گا قفس کے در و دیوار کے پاس
مرغِ چمن نہ سمجھا اندازِ گفتگو کو
منہ نہ لگایا ہم میں کنھوں نے ایسے ہرزہ کاروں کو
منہ سے ہمارے اس کو آتی نہیں حیا کچھ
لوہو منہ سے مل کر اب فریاد کرو تو بہتر ہے
دنداں نہیں ہیں منہ میں وہ لب گزیدنی ہے
شنگرف کے قلم سا ہے پر خوں دہن ہمارا
منہ کرنے سے چین کی طرف آتی تھی ہم کو عار بہت
منہ پہ چھڑکا مرے گلاب بہت

کیا جان کہ جس کے لیے منہ موڑتے تم سے
بھوکے مرتے مرتے منہ میں تلخیٔ صفرا پھیل گئی

دیکھا مجھے شبِ گل بلبل نے جو چمن میں
کہنا جس سے جو کچھ ہوگا سامنے میرؔ کہا ہوگا

پھرے بستی میں رویت کچھ نہیں افلاس سے اپنی
زمانہ ہجر کا آسان کیا بسر آیا

زنہار گلستاں میں نہ کر منہ کو سوئے گل
لے لے کے منہ میں تنکا ملتے ہیں عاجزانہ

ئیں منہ نہیں لگایا بنت العنب کو گاہے
منہ چاہئے جو کوئی کسو سے حساب لے

مت دم کشی کر اتنی ہنگامِ صبح بلبل
منہ لگایا نہ دُخترِ رز کو

لیا تو جاوے بھلا منہ سے نام یاری کا
کیا منہ لگے گلوں کے شگفتہ دماغ ہے

آہِ شرر فشاں جو نکلے ہے منہ سے ہر دم
کہیں خشک ہو چشمۂ چشم بھی

عشقِ میرؔ کسو سے اپنا اب تک ظاہر ہے نہ تھا

تم آئے چلو داعیہ کچھ تم کو اگر ہے
بے ذوقی میں ذوق کہاں جو کھاتا پینا بھائے مجھے

بولا کی میرے منہ پہ کیا کیا دہن دریدہ
بات نہ حل میں پھر گئی ہوگی منہ پر میرے آئی ہوئی

الہی ہووے منہ کالا شتاب اس دست خالی کا
ہزار مرتبہ منہ تک مرے جگر آیا

چڑھ جانے مغز میں نہ کہیں گرد لیے گل
مغرور سے ہمارے برخویش چیدہ مردم

تب تھا جوانِ صالح اب پیرِ مے کدہ ہوں
ناکس کی گفتگو نہیں روزِ شمار میں

فریاد خونچکاں ہے منہ سے ترے زیادہ
ئیں جوانی میں پارسائی کی

جو ہم ستم زدوں سے یار کچھ بھی یار رہے
پھولا پھرے ہے مرغِ چمن باغ باغ ہے

روشن ہے میرؔ غم نے کلب وکبد جلائے
لہو منہ پہ تا چند جاری رہے

حرفِ یار جو منہ سے نکلا ان نے بلا بے تابی کی

لب (ہونٹ)

دیوان اوّل دیوان ششم

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لیے لیکن
دھوکا ہے تمام بحر دنیا

اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش
میرؔ بھی تو مستِ طافح تھا شرابِ عشق کا

رات حیران ہوں کچھ چپ ہی مجھے لگ گئی میرؔ
اے سیل ٹک سمجھ کے قدم بادیے میں رکھ

ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ بازپسیں تھا
دیکھے گا کہ ہونٹ تر نہ ہوگا

سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا
لب پہ عاشق کے ہمیشہ نعرۂ مستانہ تھا

دردِ پنہاں تھے بہت پر لبِ اظہار نہ تھا
ہر سمت کھ ہے تشنہ لبی کا مری خطر

بحثِ نالہ بھی کیجیو بلبل
عشق میں افسوس سا افسوس اپنا کر چکے
ہے جنبشِ لب مشکل جب آن کے وہ بیٹھے
وے دن گئے کہ پہروں کرتے نہ ذکر اس کا
ضبط کرتے کرتے اب جو لب کو میں نے وا کیا
صد سخن آئے تھے لب تک پر نہ کہنے پائے ایک
عاقلانہ حرف زن ہو میر تو کر شیے بیاں
لب پہ لب رکھ کے ثنا اس گل کی کبھو سنئے ہم
ہم خشک لب جو روتے رہ جائیں بہہ چلیں
سخن غم سے آغشتہ خون ہے و لیکن
آئی جو لب پہ آہ تو میں اُٹھ کھڑا ہوا
قیامت رہا اضطراب اس کے غم میں
تا وصف ان لبوں کا زبان قلم پہ میر
خونچکاں شکوے ہیں دل سے تا زباں میری دے
رونے میں متصل ہے ہونٹوں پہ آہ میری
شب آہِ شرر افشاں ہونٹوں پہ پھری میرے
اب تو وہ حسرت سے آہ و نالہ بھی کرنا گیا
وصالِ خوباں نہ کر تمنا کہ زہر شیریں لبی ہے ان کی
ظلم سہے ہیں داغ ہوئے ہیں رنج اٹھے ہیں درد کھنچے
سیلِ بلا جوشاں تھا لیکن شرم سے پانی پانی تھا
احوال میر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا
ماہیں رکیں پر اس سے ملاقات ہو تو ہو
خشکیٔ لب کی ہے تری کیسی
میر اکثر عمر کے افسوس میں
یہ ذہن و ذکا اس کا تاثیر ادھر کی ہے
خموشی مجھ کو حیرت سے ہے ورنہ
لب پہ آکر بارہا پھر پھر گئی

سپہلے پیدا تو کر لبِ گفتار
زیرِ لب کہتے رہے ہم ایک مدت ہائے ہائے
جو چاہیں سو یوں کہیں لوگ اپنی جگہ بیٹھے
اب، نام یار اپنے لب پر گھڑی گھڑی ہے
سو بھی رہتا ہوں یہ کہتا ہائے دل نے کیا کیا
ناگہاں اس کی گلی سے اپنا جانا ہو گیا
زیرِ لب کیا جانیے کہتا ہے کیا مجذوب سا
یہ بساطِ خشک و خار ہے بستر اپنا
پر میر دشتِ عشق کا ہے آب تھا سو تھا
نہیں لب میرے آشنائے شکایت
بیٹھا گیا نہ مجھ سے تو ایسی ہوا کے بیچ
جگر پھر گیا رات ہونٹوں پہ آ کر
یا منہ میں عندلیب کے تھے برگ ہائے گل
سی لیا ہے تو کہے میں نے لبِ اظہار کو
جانا نہیں ہے سمجھا یہ باڈ کیا ہی ہے
سر کھینچتا یہ شعلہ تو مجھ کو جلا جاتا
کوئی دم ہونٹوں پہ آجاتا ہے گا ہے گاہے سر
خرابِ دوسوا جدا کریں گے ہلاک مل کر جدا کریں گے
اب وہ دل میں تاب نہیں جو لب سے آہ سر کھینچے
ساحل دریا خشک لبی دیکھے ہے میرے تر آیا
کچھ زیرِ لب کہا بھی سو دیر دیر رو کر
خاموش ان لبوں سے کوئی بات ہو تو ہو
چشم لیکن پُر آب ہے سو ہے
زیرِ لب بالائے لب ہے ہائے ہائے
ٹک ہونٹ ہلے تو وہ تہ بات کی پا جاوے
بھرے ہیں لب سے لے کر شکوے تا دل
جان کو یہ اضطرار دیکھیے کب تک رہے

لبوں پر ہے ہر لحظہ آہ شرر بار
کھٹکے ہیں خار ہو کر ہر شب دلِ چمن میں
رخصتِ جنبشِ لبِ عشق کی حیرت سے نہیں
جلوہ ہے مجھ سے لبِ دریائے سخن پر
تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبشِ لب کی
ہم سے خوش زمزمہ کہاں یوں تو
تھے ہمیں آرزو لبِ خنداں
خس بستہ نہ کیوں پلکیں ہر لحظہ رہیں میری
کل میرؔ جو یاں آیا طورِ اس کا بہت بھایا
دم بھی نہ لینے پایا پانی بھی پھر نہ مانگا
تشنہ لب مر گئے ترے عاشق
اپنے تو ہونٹ بھی نہ ہلے اس کے روبرو
مرے لب پہ رکھ کان آوازِ سن
کل وعدہ گاہ میں سے جوں توں کے ہم کو لائے
اس دشت میں اے سیل سنبھل ہی کے قدم رکھ
ہم زمزمہ تو ہو کے جز نالہ کش سے چپ رہ
غیر از خموش رہنے کے ہونٹوں کے سوتے
دل کس قدر شکستہ ہوا تھا کہ رات میرؔ
راہ میرؔ غریبانہ جاتا تھا چلا روتا
شکستہ بالی و لب بستگی پہ اب کے نہ جا
لبِ تشنگانِ عشق کے ہیں کام کے وہ لعل
لب سے لے کے تا سخن میں خونچکاں نکلے بھرے
مصلحت ہے میری خاموشی ہی میں اے ہم نفس
لبِ سوال نہ اک بوسے کے لیے کھولوں
چپکے رہے بھی چین نہیں بت کہے ہے یوں
جنبش بھی اُس کے آگے ہونٹوں کو ہو تو کہیے
بے زری سے داغ ہیں لیکن لبوں پر مُہر ہے
جلا ہی پڑا ہے ہمارا تو گھر بار
اتنے لب و دہن پر یہ نالہائے بلبل
مدتیں گزریں کہ ہم چپ ہی رہا کرتے ہیں
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں
میں صد سخن آغشتہ بخوں زیرِ زباں ہوں
لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں
سو عوض اس کے چشمِ تر دیکھو
جاتے نہیں آنکھوں سے لبِ یار کے عنابی
وہ خشک لبی تس پر جامہ گلے میں آئی
جس تشنہ لب کو اُن نے تلوار آ لگائی
نہ ملی ایک بوند پانی کی
رنجش کی وجہ میرؔ وہ کیا بات ہو گئی
کہ اب تلک بھی اک ناتواں آہ ہے
ہونٹوں پہ جان آئی پر آہ وہ نہ آئے
ہر سمت کو یاں دفن مری تشنہ لبی ہے
اے عندلیبِ گلشن تیرا لب و دہاں ہے
لیکن نہیں ہے یار جھگڑنے کا ڈھب مجھے
آئی جو بات لب پہ سو فریاد ہو گئی
ہر گام گرِ لب پہ یارانِ وطن کا تھا
چمن میں شور مرا اب تلک بھی ہے پر کا
کیا آب کو جو ہووے عقیقِ یمن میں آب
لیکھ ہے اظہار ہر ناکس پہ اپنا ننگ و عار
تو ہو چکے بات سے جو ہونٹ اپنے وا کروں
ہزار مہر و محبت میں بے نوائی ہو
لب بستہ بیٹھے رہتے جو ہو مدعا کہو
یوں اپنے طور پر تم باتیں بہت بنالو
کہئے حاجت اپنی لوگوں سے جو دے ہوں حال کچھ

ہاتھ/دست/دست و پا

دیوان اوّل

فرہاد ہاتھ تیشہ پہ ٹک رہ کے ڈالتا
تاچرخ نالہ پہنچا لیکن اثر نہ دیکھا
ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیئے
دے گی نہ چین لذت زخم اس شکار کو
ہو خشک تو بہتر ہے وے ہاتھ بہاراں میں
ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اٹھا کے چل
سبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے
اپنے شہید ناز سے بس ہاتھ اٹھا کہ پھر
کیا کیا دعائیں مانگے ہیں خلوت میں شیخ یوں
غیروں ہی کے ہاتھوں میں رہے دستِ نگاریں
گریباں سے رہا کوتہ تو پھر ہے
پنجۂ گل کی طرح دیوانگی میں ہاتھ کو
تھا بد شراب کتنا ساقی کہ مات مَے سے
تھی شب کسی کسائی تیغ کشید کف میں
کسی کو شوق یارب بیش اس سے اور کیا ہوگا
شاید نشے میں اس سے یہ سفاکیاں ہوئیں
سراہا ان نے ترا ہاتھ جن نے دیکھا زخم
بعد خوں ریزی کے مدت بے حنا رنگیں رہا
مشکل بہت ہے ہم سا پھر کوئی ہاتھ آنا
پوچھا جو میں نے دردِ محبت سے میرؔ کو
اگلے تھے دست بلبل و دامانِ گل بہم

پتھر تلے کا ہاتھ ہی اپنا نکالنا
کرنے سے اب دعا کے ہیں ہاتھ ہے اٹھایا
بشوئے ہے اس کے قتل و ستم پر ہائے خیالِ خام کیا
جو کھائے تیرے ہاتھ کی تلوار جائے گا
مانندِ نرگس جو جام نہیں رکھتا
ہو گا کہیں میں ہاتھ کسو داد خواہ کا
دست کوتاہ تا سبو نہ گیا
دیوانِ حشر میں اسے لایا نہ جائے گا
ظاہر جہاں سے ہاتھ اٹھایا تو کیا ہوا
کب ہم نے تیرے ہاتھ سے آزار نہ پایا
ہمارے ہاتھ میں دامن ہمارا
گر نکالا میں گریباں سے تو دامن میں رہا
میں نے جو ہاتھ کھینچا اس نے کٹار کھینچا
پر میں نے بھی بغل میں بے اختیار کھینچا
قلم ہاتھ آگئی ہوتی تو سو سو خط لکھا ہوتا
زخمی کسو اس کے ہاتھ کا نکلا سو چوٗد تھا
شہید ہوں میں تری تیغ کے لگانے کا
ہاتھ اس کا جو مرے لوہو میں گستاخانہ تھا
یوں مارنا تو پیارے آسان ہے ہمارا
رکھ ہاتھ ان نے دل پہ ٹک اک لیکے رو دیا
صحنِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا

دکھ ہانتھ دل پر میر کے دریافت کر کیا حال ہے
ہاتھ رکھے رہتا ہوں دل پر برسوں گزرے بجا ہیں
سرِ دورِ فلک بھی دیکھوں اپنے رُوبرو ٹوٹا
کفِ چالاک میں تیری جو تھا سر رشتہ جانوں کا
کفِ جاناں سے کیا امکان رہائی میر کوئی ہو
گریباں سے تب ہاتھ اٹھایا تھا ہیں تے
دستِ صیاد تک بھی نہ میں پہنچا جیتا
شرمندہ اثر کچھ باطن مرا نہیں ہے
بہت ہیں ہاتھ ہی تیرے نہ کر قفس کی فکر
قدم تیرے چھوڑے تھے جن نے اب وہ ہاتھ ہے سر ہے
ہوا ہے ہاتھ گلدستہ ہملا
میر صاحب زمانہ نازک ہے
رہنے کا پاس نہیں ایک بھی تار آخر کار
دست کش نالہ پیش رو گریہ
ضعف یاں تک کھنچا کہ صورت گر
ہر جنبد ملے سے دست دبغل اٹھتے ہیں خروش
دست دیا مارے وقتِ بسمل تک
تو دستیاں ہوں دست و گریباں ہاتھ کے
آئینے کی مثال پس از صد شکست میر
دامن نہ جھٹک ہاتھ سے میرے کہ ستم گر
اس طرح دل گیا کہ اب تک ہم
رکھا تھا ہاتھ دل پر آہ کرتے
چہرے پہ زخم ہے مرے ناخن کا ہر خراش
نیں پھاڑ گریباں کو درویش ہوا آخر
نکلا تھا آستیں سے کل مغبچے کا ہاتھ
بالیں پہ سر اک عمر سے ہے دستِ طلب کا
بہانے سہل پر دیتے کس محبوب کو کف سے

رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ ان دنوں بے تاب سا
اک دن ان نے گلے سے مل کر ہاتھ میں میرا دل نہ لیا
کر سنگِ محتسب سے پائے خم دستِ سبو ٹوٹا
گریباں سے مرے ہر اک ترا ٹانکا رفو ٹوٹا
اچنبھا ہے جو اس کے ہاتھ سے رنگ حنا چھوٹا
مری اُدر دامانِ صحرا ہوا تھا
بے قراری نے لیا مجھ کو تہہِ دام بہت
وقتِ سحر ہے شاہد دستِ دعا ہے شاہد
مرا تو کام انہی میں تمام ہے صیاد
مرے حق میں نہ ہونا ہی تھا یاں تک دسترس بہتر
کہ داغِ خوں بہت ہے آستیں پر
دونوں ہاتھوں سے تھا مے دستار
ہاتھ سے جائے گا سر رشتۂ کار آخر کار
آہ چلتی ہے یار، الم لے کر
رہ گئے ہاتھ میں قلم لے کر
کس کا ہے راز بحر میں یارب کہ یہ ہیں جوش
ہاتھ پہنچا نہ پائے قاتل تک
زیرِ زمیں بھی پہنچیں گے چاکِ کفن تلک
کھینچا بغل میں یار کو دستِ دعا سے ہم
ہوں خاکِ سرِ راہ کوئی دم میں ہوا ہوں
بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں
نہیں رہتا چراغ ایسی پَوَن میں
اب دیدنی ہوئی ہیں مری دستکاریاں
دے ہاتھ سے دامن کو اب تک بھی جھٹکتے ہیں
بہتوں کے خرقے چاک ہوئے خانقاہ میں
جو ہے سو گدا ، کس کنے جا ہاتھ پسار یں
قلم اس جرم پر کرنا ہے دستِ گل فروشاں کو

کام لے یار سے جو دستِ رسا رکھتا ہو
سایۂ گل میں لبِ جُو پہ گلابی رکھو
کھویا ہمارے ہاتھ سے آئینہ نے اسے
تلوار کھینچتا ہے وہ اکثر نشے کے بیچ
تیغ پر ہاتھ دم بدم کب تک
مَیں تو ہوں وہم دونوں کیا ہے خیال تجھ کو
اس پر کہ تھا وہ شبہ رگ سے اقرب
کیسے دست دپا گم جو میرؔ آ گیا
وے ہی چالاکیاں ہاتھوں کی ہیں جو اوّل تھیں
صورت گرِ اجل کا کیا ہاتھ تھا کہے تو
کس کس طرح سے ہاتھ نچاتا ہے وعظ ہیں
بلبل کی کف خاک بھی اب ہو گی پریشاں
نیاز ناتواں کا ناز سرو قد سے بر آوے
جنوں ان شورشوں پہ ہاتھ کی چالاکیاں ایسی
جمِ خوں کف تا آل پہ نرا میرؔ زبس
افسوس وے شہید کہ جو قتل گاہ میں
بسکہ دیوانگیٔ حال میں چالاک ہوئے
اٹھتا نہیں ہے ہاتھ ترا تیغ جور سے
گئے وقت آتے ہیں ہاتھ کب ہوئے ہیں گنواکے خراب سب
مفت یوں ہاتھ سے نہ کھو ہم کو
ہے جائے حیف بزم جہاں مل لے اے پتنگ
اب گریباں کہاں ہے اے ناصح
اب کی ہاتھوں میں شوق کے تیرے
آہ ان خوش قامتوں کو کیونکہ بر میں لائیے
خنجر بکف وہ جب سے سفاک ہو گیا ہے
چاک پر چاک ہوا جوں جوں سلایا ہم نے
ظالم کہیں تو مل کبھو داڑو پیٹے ہوئے

یا کوئی آئینہ سا دستِ دعا رکھتا ہو
ہاتھ میں جام کو تو آپ کو بدنام کرو
ایسے جو یاد دے آپ کو مغرور کیوں نہ ہو
زخمی جو اس کے ہاتھ کا ہو چور کیوں نہ ہو
اک لگا چک کہ مدعا ہے یہ
جھاڑ آستین مجھ سے ہاتھ آپ سے اٹھا رہ
ہرگز نہ پہنچا یہ دستِ کوتاہ
وفا پیشہ مجلس سے پا گئی
اب گریباں میں مرے رہ گئے ہیں تار کئی
کھینچے ہے تیغ ابرو فولاد کے قلم سے
دیکھا جو شیخ شہر عجب دست گاہ ہے
جامے کا تیرے رنگ ستم گر چمنی ہے
مثل مشہور ہے یہ نو کہ دست زور بالا ہے
مَیں ضامن ہوں اگر ثابت بدن پہ پیرہن نکلے
ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے
لگتے ہی اس کے ہاتھ کی تلوار مر گئے
سو گریباں مرے ہاتھ سے یاں چاک ہوئے
ناحق کشی کہاں تئیں یہ کیا سبھاؤ ہے
تجھے کرنا ہووے سو کر تو اب کہ یہ عمر برق شتاب ہے
کہیں پیدا بھی ہوتے ہیں ہم سے
اپنے اُپر جو کوئی گھڑی ہاتھ مل سکے
چڑھ گیا ہاتھ اس دوانے کے
دامن بادیہ کا آنچل ہے
جن کے ہاتھوں سے قیامت پر بھی عرصہ تنگ ہے
ملک ان ستم زدوں کا سب پاک ہو گیا ہے
اس گریبان ہی سے اب ہاتھ اٹھایا ہم نے
پھرتے ہیں ہم بھی ہاتھ میں سر کو لیے ہوئے

اگرچہ اب تو خفا ہو لیکن موئے گئے پر کبھو ہمارے
جو یاد ہم کو کروگے پیارے تو ہاتھ اپنے ملا کروگے

عشق کے آثار ہیں اے بوالہوس
داغ بہ دل دست بہ سر جاؤگے

دیوان دوم

جس ہاتھ میں رہا کی اس کی کمر ہمیشہ
اس ہاتھ مارنے کا سر پر بندھا ہے سہرا

ہاتھ آئینہ رویوں سے اٹھا بیٹھیں نہ کیونکر
بالعکس اثر پاتے تھے ہم اپنی دعا کا

عالم کی سیر میرؔ کی صحبت میں ہوگئی
طالع سے میرے ہاتھ وہ بے دست و پا لگا

کیا لطف ہے بجئے جو بُرے حال کوئی میرؔ
جینے سے مَیں تو ہاتھ اٹھایا بھلا کیا

دکھلاتے کیا ہو کیا دستِ حنائی کا مجھ کو رنگ
ہاتھوں سے مَیں تمہارے بہت ہوں جلا ہوا

کر ترک گرچہ بیٹھے ہیں پر ہے وہی تلاش
رہتا نہیں ہے ہاتھ ہمارا اُٹھا ہوا

نیمچہ ہاتھ میں مستی سے لہو کی آنکھیں
سج تیری دیکھ کے اے شوخ حذر ہم نے کیا

خاک ہے پکڑے اگر سونا بھی پھر
ہاتھ سے جس کے وہ سیمیں بر گیا

ہاتھ پر رکھ ہاتھ اب وہ دو قدم چلتا نہیں
جن نے بالش خواب کا برسوں مرا بازو کیا

سرگشتہ ایسی کس کی ہاتھ آگئی تھی مٹی
جو چرخ نن قضا نے یہ آسماں بنایا

دل پہ رکھتا ہوں کبھو سر سے کبھو ماروں ہوں
ہاتھ پاؤں کو ترے میں نہ لگایا ہوتا

مرا خوں تجھ پہ ثابت ہی کرے گا
کنارے بیٹھ کر ہاتھوں کو دھوتا

تیز دست اتنا نہیں وہ ظلم میں اب فرق ہے
یعنی لوہا تھا کڑا تیغ ستم کا گِر گیا

قدم کے چھونے سے استادگی مجھی سے ہوئی
کبھو وہ یاں تو مرے ہاتھ بھی لگا کرتا

منہ اس کے منہ کے اوپر شام و سحر رکھوں ہوں
اب ہاتھ سے دیا ہے سر رشتہ میں ادب کا

رہتا نہیں تڑپنے سے ٹک ہاتھ کے تلے
کیا جانوں دل کو میرؔ مرے کیا بلا ہوا

دامان و جیب دونوں ہوئے ٹکڑے ایک جا
اب کی یہ کام ہاتھ سے میرے سمٹ گیا

ہاتھ دامن میں ترے مارتے جھنجلا کے نہ ہم
اپنے جامے میں اگر آج گریباں ہوتا

ہاتھ کھینچا سو پیر ہو کر جب
تب گناہ کرنے کا نہ دست رہا

میرؔ کی نبض پہ رکھ ہاتھ لگا کہنے طبیب
آج کی رات یہ بیمار نہیں جینے کا

وہ جو کشش تھی اس کی طرف سے کہاں ہے اب
تیر و کماں ہے ہاتھ میں سینہ نشاں ہے اب

صنم فراق میں تیرے میں کچھ تو کر رہتا
پہ کیا کروں کہ مرا ہاتھ زیر سنگ ہے شوخ

خیال چاہ کے سر رشتے کا تجھے کب ہے
ترے تو ہاتھ میں شام و سحر تنک ہے شوخ

ایسے ہی تیز دست ہو خون ریزی میں تو پھر
مغتنم جان گر کسو کے تیئیں
لیا چہرہ دستی سے گر میر سر تک
سروں پہ ہاتھ کبھو تیغ پر کبھو اس کا
روز و شب کو اپنے یارب کیونکہ کریں گے روز و شب
سر رشتہ ہستی کو ہم دے چکے ہاتھوں سے
اس کارِ دست بستہ پہ دیکھا نہ مدعی
پنجہ مرجاں کا پھر دھرا ہی رہے
اٹھاتے ہاتھ کیوں نومید ہو کر
یہ ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانندِ جام سے
ہائے رے ہاتھ جہاں چوٹ پڑی دو ہی کیا
مشفقو ہاتھ مرے باندھو کہ اب کی ہر دم
تجھ سے متاعِ خوش کا کیونکر نہ ہوں معرف
گو کہ گردن ہٹیں یاں لہو میں بیٹھے
بند پا یا جیب میں یا سر سے مارا آہنگ ہو
اک خلق تلاشی ہے تم ہاتھ نہیں لگتے
لطفِ شراب ابر سے ہے سو نصیب کو
جوشِ محیطِ عشق میں کیا جی سے گفتگو
کیونکہ رکھا ہاتھ کے نیچے دل بیتاب کو
نہ لکھیں یار کو محضر ہمارے خونِ ناحق کا
لیے تسبیح ہاتھوں میں جو تو باتیں بناتا ہے
تو کیے کمھلائے جاتے ہو نزاکت ہائے ہائے
ہاتھ چڑھ جائیو اے شیخ کسو کے نہ کبھو
مقصود کے خیال میں بہتوں نے چھانی خاک
شاخِ گل تیری طرف جھکی ہو جو ہے اے مستِ ناز
تحرک بتاں کا مجھ سے لیتے ہیں قول یونہی
کام کرے کیا سعی و کوشش مطلب یاں ناپیدا تھا

رکھو گے تیغ جور کی یک چند میان کر
پہنچے ہے تیرے دست و پا سے نفع
نہ پہنچا کبھو ہاتھ اس کی کمر تک
کچھ ایک قسم نہیں میرے آشنا کی قسم
ہاتھ رکھے رہتے ہیں دل پہ بے تابی میں اکثر ہم
کچھ ٹوٹے ہی جاتے ہیں اب تارِ نفس ظالم
کیونکر نہ کام اپنا کرے کوہکن تمام
ہاتھ خوں میں مرے ڈبو لو تم
اگر پاتے اثر ہم کچھ دعا میں
یا تھوڑی دور ساتھ چلوئیں نشے میں ہوں
الغرض ایک ہے وہ شوخ ستم گاروں میں
جا الجھتے ہیں گریبان کے دو تاروں میں
یوسف کے رنگ پیارے کچھ میں لگا نہیں حسن
ہاتھ اٹھاتا ہے جفا سے وہ ستم گار کہاں
دستِ کوتہ میں نہ آیا اپنے وہ دامن کبھو
لڑکے تو ہو پر سب کو بالے ہی بتاتے ہو
جب لیویں جام ہاتھ میں تب آفتاب ہو
اس گوہرِ گرامی سے اب ہاتھ دھو رہو
وہ جو تڑپا لے گیا آسودگی و خواب کو
دکھا دیویں گے ہم محشر میں اس کے دستِ رنگیں کو
نہیں دیکھا ہے واعظ تو نے اس غارت گرِ دیں کو
ہاتھ لگتے میلے ہوتے ہو لطافت ہائے ہائے
لونڈے سب تیرے خریدار ہیں میخانے کے
عالم تمام وہم ہے یاں ہاتھ کیا لگے
چاہتی ہے تو بھی میرے ہاتھ سے اک جام لے
کیا ان سے ہاتھ اٹھاؤں گو اس میں جان جاوے
دست و پا بہتیرے مارے جب تک قدرت رکھتے تھے

تاثیر ہے دعا کو فقیروں کی میر جی
ٹک آپ بھی ہمارے لیے ہاتھ اٹھائیے

دست و پا گم کیے ہیں تو نے میر
تیری بے طاقتی سے پیدا ہے

کھنچتا ہی نہیں ہم سے قدم خم شدہ ہرگز
یہ سست کماں ہاتھ پہ اب کتنی کڑی ہے

گل کھائے ہیں افراط سے میں عشق میں اس کے
اب ہاتھ مرا دیکھو تو پھولوں کی چھڑی ہے

دیوان سوم

اڑتی رہے گی خاک جنوں کرتی دشت دشت
کچھ دست اگر یہ بے سر و ساماں بھی پائے گا

اس کے دامن تلک نہ پہنچا ہاتھ
تھا سرِ دست جیب چاک ہوا

پہلے گلے لگایا پھر دستِ جور اٹھایا
مارا تو ان نے لیکن احسان کرکے مارا

ان نے کھینچا ہے مرے ہاتھ سے داماں اپنا
کیا کروں گر نہ کروں چاک گریباں اپنا

آج ہمارا دل تڑپے ہے کوئی ادھر سے آوے گا
یا کہ نوشتہ ان ہاتھوں کا قاصد ہم تک لاوے گا

سعی و طلب بہت کی مطلب کے تئیں نہ پہنچے
ناچار اب جہاں سے بیٹھے ہیں ہاتھ اٹھا کر

ہیں میر ترک مے کر دنیا سے ہاتھ اٹھایا
درویش تو بھی تو ہے حق میں مرے دعا کر

رات دن ہاتھ ملتے رہتے ہیں
دل کے جانے کا ہے بڑا افسوس

قتل گہہ میں دست بوس اس کا کریں فی الفور لوگ
ہم کھڑے تلوار کھاویں نقش ملویں اور لوگ

دیر لگتا ہے گلے تلوار پر وہ رکھ کے ہاتھ
خوبیاں بھی تو بہت ہیں اس ستم ایجاد میں

پائے نگار آلودہ کہیں وہ سانجھ کو میر نے دیکھے تھے
صبح تک اب بھی آنکھوں میں اس کی پاؤں پھرتے ہیں

حق جو چاہے تو بندھی مٹھی چلا جاؤں گا
مصلحت دیکھی نہ میں ہاتھ کے پھیلانے میں

کیا دنگل کے ہاتھ سے ہو کتنے ان کے پاؤں
اکثر جنھوں کا ہاتھ ہے دستِ طبیب میں

ہم جستجو میں ان کی کیے دست و پا بھی گم
افسوس ہے کہ آئے نہ وہ راہ پر کبھو

گرچہ وہ گوہرِ تر ہاتھ نہیں لگتا لیک
دم میں دم جب تئیں ہے اس کے طلبگار رہو

ہرچند جانیں جاتی ہیں پر تیغِ جور سے
تم کو ہمارے سر کی سوں تم ہاتھ مت اٹھاؤ

گو دستِ لطف سر سے اٹھائے کوئی شفیق
دل کا لگاؤ اپنا ہے دستِ دعا کے ساتھ

اثر ہوتا تو کب کا ہو بھی چکتا
دعاے صبح سے اب ہاتھ اٹھا بیٹھ

موت جو آئے سر پر انسان دست و پا گم کرتا ہے
دیکھتے ہی شمشیر بکف کچھ آج اسے اوسان گئے

ہاتھ لگا وہ گوہرِ مقصد جیسا ہے معلوم ہمیں
محو طلب ہو اہلِ طلب سب خاک بھی یاں کی چھان گئے

شوق لکھتے قلم جو ہاتھ آتی
لکھتے کاغذ کے دستے کے دستے

بہت کوتاہ دامن خرقے شیخوں کے پھٹے پائے
کہیں نکلے تھے گورے ہاتھ اس کے آستیں سے

دیوانِ چہارم

سبزے کا ہوا اُودکش خطِ رخِ جاناں کے
تن کو جس جاگہ سے چھیڑوں ہوں وہاں ہے درد درد

اگرچہ چپ لگی ہے عاشقی سے مجھ کو حیرت ہے
دل ہاتھ سے گیا ہے لطفِ قضا سے میرے

دست بردل ہوں مدتوں سے میرؔ
دل کے اوپر ہاتھ رکھے ہی شام و سحر گزرے ہے یاں

ناز کی ہائے رہی طالع کی نکوئی سے کبھو
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے ہو گئے کیا میرے طورِ شتابی ہو

یا مست درگاہوں میں شب کہتے تھے شاہد بازیاں
آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز

اپنا تو دستِ کوتہ زہ تک بھی ٹک نہ پہنچا
خالی ہاتھ سیہ رُو ایسے کاہے کو تھے گریہ کناں

ہاتھوں لگے خوباں کے کچھ شے نہیں پھر ملتی

جو ہاتھ مرے چڑھتا تو پان کو کھا جاتا
ہاتھ لگتے دل کے ہو جاتا ہے میرا رنگ زرد

کبھو احوال پرسی تو کرو دل ہاتھ میں لا کر
افسوس کھو چلا ہوں ایسے گہر کو پا کر

دل ہے ویسا ہی بے قرار ہنوز
حال یہ تھا تو دل عاشق کا ہاتھ میں ٹک تولتے تم

پھول سا ہاتھوں میں ہم اس کو اٹھا لیتے ہیں
بیٹھا ہوں کٹڑے پاؤں نہیں تو کچھ چلنے میں ننگ نہیں

تسبیح لے کر ہاتھ میں یا میرؔ اب حضرت ہوئے
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

نقاش سے کہیں وہ دامن کشیدنی ہے
جن روزوں درویش ہوئے تھے پاس ہمارے دولت تھی

کیونکر کوئی اب ان سے دل میرا دلا جاوے

دیوانِ پنجم

کیا صورت ہے کیا قامت ہے دست و پا کیا نازک ہیں
بہر پرستشِ صنم تو میں ہاتھوں سے قیسِ رہبان کے

عشق میں ہوش و صبر سُنتے تھے
بعد مرے سبھے کو میرے ہاتھوں ہاتھ ملک لیں گے

اس زار نے ہاتھ ان کا جو کھینچا لگے کہنے
شاید اسی کے ہاتھ میں دامن ہو یار کا

ہاتھ پہنچا نہ اس کے دامن تک
خود گم ہے ناشکیب و مکدر ہے مضطرب

جھوٹ کہا تھا ہم نے کسو ہیں طور جو اس سے ظاہر ہے

ایسے پتلے منہ دیکھو جو کوئی کلال بنا دے گا
رشتۂ سبحہ توڑاؤں گا زنار گلے سے بندھاؤں گا

رکھ گئے ہاتھ سو تو کانوں پر
سو سو بار لیا ہے میں نے نام اس کا ان دانتوں پر

غش کرنے نہ لگ جاؤ کہیں چھوڑیے بس بس
ہو جس ستم رسیدہ کو دستِ دعا سے ربط

میں گریباں کروں نہ کیونکر چاک
کب تک رکھوں گا ہاتھ تلے پر غبارِ دل

ہاتھ چلے تو عاشقِ زار کو خاک و خوں میں لٹاؤ تم

پیش رد دستِ دعا ہے وہی خواہش ہے
اور سب چیز سے ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے ہیں

خون ریزی سے ہماری اچھلاہے ہاتھ اُٹھانا
یوں چاہیے کہ دلبر درویش سے دعالیں

سُنا ئیں نے کہ آخر ہاتھ اٹھایا اس نے دنیا سے
اگر پایا بھی محنت کر کشو ہمدم نے دنیا کو

دیکھ اس کو مجھ کو یاروں نے حیران ہو کہا
کس ڈھب سے لگ گیا ہے یہ گوہر گدا کے ہاتھ

دیکھ کے دست و پائے نگاریں چپکے سے وہ جاویں کیوں
منہ چوہے ہے یار د گویا مہندی اس کی لگائی ہوئی

عجب رنگِ حنا طائر ہے دست آموزِ خوباں کا
اڑے بھی تو بھی ہاتھوں ہی میں کر پرواز آتا ہے

کب سے ہم کو ہے تلاشِ دستِ غیب
تا کمر پیچ اس کا اپنے ہاتھ آئے

ہاتھ رکھ لیوے تو کہے بس اب
کیا جیئے گا بہت یہ گھائل ہے

دیوان ششم

طائرِ عمر کو نظر میں رکھ
غیب سے ہاتھ یہ شکار آیا

بوسوں سے ہاتھ مارتے ہیں سر پہ اس بغیر
ہو دیں ہیں ہم بھی دست بسر تو ہے کیا عجب

تھے دست بستہ حاضرِ خدمت میں میرؔ گویا
سیمیں تنوں کے عاشق ہیں زر خریدہ مردم

تماشا دیکھنا مقصود ہو تو مل فقیروں سے
کہ چٹکی خاک کی لے ہاتھ میں اکسیر کرتے ہیں

دھجیاں جامے کی کردوں گا جنوں میں اب کے
گر گریباں دری کا کام مرے ہاتھ رہے

پاؤں (پا / پائے)

دیوان اوّل

مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک
تمام عمر دیں زیر خاکِ پا اس کے
کھو جائے گی جو ادھر صبا تو یہ ہیو اس سے کب ہے وفا
ڈر ہے اس شمشیر زن کے جوہر آئینہ سال
رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی
کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
کیونکہ پڑتے ہیں ترے پاؤں نسیم سحری
جوں نقشِ پا ہے غربت حیران کار اس کی
اس کے پابوس کی توقع پر
اس کے پاؤں کو جا لگی ہے حنا
گزرے ہے لہو واں سرِ ہر خار سے اب تک
پائے پُر آبلہ سے مَیں گم شدہ گیا ہوں
مت رغم سے ہمارے پیادے حنا لگاؤ
کیا ہے خوں مرا پامال یہ سرخی نہ چھوٹے گی
ہوں رہگزر میں تیرے ہر نقشِ پا ہے شاہد
یارب رہِ طلب میں کوئی کب تلک پھرے
وہ سر چڑھا ہے آتا اپنی فروتنی سے
پائے ثبات بھی ہے نام آوری کو لازم
پشتِ پا ماری بسکہ دنیا پر
کوئی تو آبلہ پا دشتِ جنوں سے گزرا
پاؤں پر سے اپنے میرا سر اٹھانے مت جھکو

مَیں نقشِ پا کی طرح پائمال ہوں اپنا
جو زور کچھ چلے ہم عجز دست گاہوں کا
گر ایک میرِ شکستہ پا ترے باغِ تازہ میں خار تھا
سر سے لے کر پاؤں تک مَیں غرقِ آہن میں رہا
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
اس کے کوچے میں ہیں صد گنج شہیداں یکجا
آوارہ ہوں وطن سے جو یار تک نہ پہنچا
اپنے تئیں خاک میں ملائیے گا
خوب سے ہاتھ اسے لگائیے گا
جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا
ہر خار بادیہ کا میرا نشان دے گا
پابوس پر تمہارے سر ہر جوان دے گا
اگر تو قاتل اپنے پاؤں سو پانی سے دھوئے گا
اڑتی ہے خاک میری بادِ صبا ہے شاہد
تسکین دے کہ بیٹھ رہوں پاؤں گاڑ کر
کھویا ہمیں نے اس کو ہر لحظہ پاؤں پڑ کر
مشہور ہے نگیں جو بیٹھا ہے گھر میں جڑ کر
زخم پڑ پڑ گیا مرے پا پر
ڈوبا ہی جائے ہے لوہو میں سرِ خار ہنوز
تیغ باندھی ہے میاں تم نے کمر میں خوش غلاف

یک رنگیوں کی راہیں طے کر کے مر گیا ہے
دنیا ہے میرؔ حادثہ گاہ مقرری
ہم اپنی چاک جیبی کو سی رہتے یا نہیں
نہ پھر رکھیں گے تیری راہ میں پا ہم
خار کو جن نے لڑی موتی کی کر دکھلایا
تو زبوں شکار تو تھا وے میرؔ قتل گاہ میں
مست کر خرام سر پہ اٹھا لے گا خلق کو
ہر نقشِ پا ہے شوخ ترا رنگِ یاسمن
پاؤں میں وہ نشہ طلب کا نہیں
کس قدر الجھے ہیں میرے تار دامن کے کہ اب
نہ سوئے نیند بھر اس تنگنا میں تا نہ موئے
شاید کہ سر بلندی ہووے نصیب تیرے
دوڑے بہت ولیکن مطلب کو کون پہنچا
کس گناہ کا ہے پس از مرگ یہ عذر جان سوز
سحر پائے گل بے خودی ہم کو آئی
اسی تقریب اس گلی میں رہے
تجھے کیوں نہ ڈھونڈوں کہ سوتے ہی گذری
کیسے قدم سے اس کی گلی میں صبا گئی
تھا صید ناتواں میں لیکن ہوسے میرے
سر رکھیں اس کے پاؤں پر لیکن
آگے ہمارے عہد کے وحشت کو جا نہ تھی
وہ نقشِ پائے ہوں میں مٹ گیا ہو جو راہ میں
پائے گل اس چمن میں چھوڑا گیا نہ ہم سے
فلک اے کاش ہم کو خاک ہی رکھتا کہ اس میں ہم
کیونکہ طے ہو دشتِ شوق آخر کو مانندِ سرشک
تو ہی زمام اپنی نلتے تڑا کے مجنوں
آلودہ اس گلی کی جو ہوں خاک سے تو میرؔ

گل میں رگیں نہیں ہیں یہ ہیں نقشِ پائے بلبل
یاں سے تو اپنا پاؤں شتابی نکال چل
پھاٹے میں پاؤں دینے کو آئے کہاں سے تم
گئے گذرے ہیں آخر ایسے کیا ہم
اس بیابان میں وہ آبلہ پا ہیں ہی جس
ترے خوں سے ہیں حنائی کفِ پائے صیدِ بسمل
بیٹھا اگر گلی میں تری نقشِ پا کبھوں
کم گوشۂ چمن سے ترا رہگذر نہیں
اب تو سر مستِ خواب ہیں دونوں
پاؤں میں گڑ کر نہیں چبھنے کی فرصت خار کو
کہ آہ جا نہ تھی پا کے دراز کرنے کو
جوں گردِ راہ سب کے تو پاؤں سے لگا رہ
آئندہ تو بھی ہم سے ہو کر شکستہ پا رہ
پاؤں پر شمع کے پلتے ہیں سر پروانہ
کہ اس سست پیماں میں بو تھی کسو کی
منتیں ہیں شکستہ پائی کی
تری راہ میں اپنے پائے طلب کی
دل پھونک کر کے خاک مری سب اڑا گئی
پاؤں پہ ان نے اپنے بھر کر حنا لگائی
دست قدرت یہ میں کہاں پائی
دیوانگی کسو کی بھی زنجیرِ پا نہ تھی
نہ کچھ خبر ہے نہ سدھ ہے گی رہرواں میری
سر پہ ہمارے اب کی منت ہے بے پری کی
غبارِ راہ ہوتے یا کسو کی خاکِ پا ہوتے
میرے پاؤں میں تو پہلے ہی قدم چھالے پڑے
مدت سے نقشِ پا کے مانند راہ پر ہے
آبِ حیات سے بھی نہ دے پاؤں دھوئیے

شوق تھا جو یار کے کوچے ہمیں لایا تھا میرؔ
راہ دیکھ کے راہِ عشق میں پائے
گنار شہر وفا میں سمجھ کے کر مجنوں
رکھیو قدم سمجھ کے کہ تو جانتا نہیں
پاؤں رکتا نہیں مسجد سے دم آخر بھی

پاؤں میں طاقت کہاں اتنی کہ اب گھر جایئے
یاں میرؔ کشو کا سر نہ ہووے
کہ اس دیار میں میرؔ شکستہ پا بھی ہے
مانندِ نقشِ پا یہ سرِ راہ کون ہے
مرنے پہ آیا ہے پر لات چلی جاتی ہے

دیوان دوم

کہیں اس زلف سے کیا لگ چلی ہے
پاؤں کے نیچے کی مٹی بھی نہ ہوگی ہم سی
پاؤں دامن میں کھینچ لیں گے ہم
ہمراہ خوں تلک ہو گئے پاؤں کے چھوٹے سے
خواب میں کل پاؤں اپنے دوست کے ملتا تھا میں
ہم تو تھے سرگرم پا بوسی خدا نے خیر کی
ہم بھی دنیا کی طلب میں سر کے بل ہوتے کھڑے
مہندی لگی تھی تیرے پاؤں میں کیا پیارے
یہ ہاتھ دیکھ آگے مرے ساتھ غیر کے
کیا گرز کوئے محبت میں ہنسی ہے کھیل ہے
ہم عاجزوں کا کھونا مشکل نہیں ہے ایسا
خاک پا ہو کے ترے قد کا چمن میں رہتا
میں دور ہوں اگرچہ برابر ہوں خاک سے
تونے کہ پاؤں سے دل باہر نہیں رکھا ہے
عشق میں اے طبیب ہاں ٹک سوچ
سرسری مت جہاں سے جا غافل
کس رنگ راہ پائے نگاریں سے تو چلا
جنوں میں اب کی کام آئی نہ کچھ تدبیر بھی آخر
پاؤں میں پڑ گئے ہیں پھپھولے مرے تمام
کس بے گناہ کے خوں میں ترا پڑ گیا ہے پاؤں

پڑے ہے پاؤں بے ڈھب کچھ صبا کا
کیا کہیں عمر کو کس طرح بسر ہم نے کیا
ہاتھ گر گوشۂ فراغ لگا
ایسا گناہ مجھ سے وہ کیا ہوا کبیرا
آنکھ دشمن کھل گئی سو ہاتھ مل کر رہ گیا
نیچے کل خوش خلاف اس کا اگل کر رہ گیا
بارے اپنا پاؤں اس راہ میں بچل کر رہ گیا
ہنگامِ خونِ عاشق سر پہ جو تو نہ آیا
رکھتا ہے پاؤں مست ہو جیسے شراب کا
پاؤں رکھا جس نے ٹک ادھر پھر اس کا سر گیا
کچھ چیونٹیوں کو لے کر پاؤں تلے مل ڈالا
سرو اتنا نہ اکڑتا اگر انسان ہوتا
اس راہ میں نقش پا ہی مرا رہنموں ہوا
عیار پن یہ کن نے تیرے تئیں بتایا
پائے جا درمیاں ہے ہاں ٹک سوچ
پاؤں تیرا پڑے جہاں ٹک سوچ
ہوتے لگے ہیں خون قدم کے نشان پر
گئی کل ٹوٹ میرے پاؤں کی زنجیر بھی آخر
ہر گام راہ عشق میں گویا دبی ہے آگ
ہوتا نہیں ہے سرخ تو ایسا حنا کا رنگ

ادھر جانے کو آندھی تو ہے لیکن
گئے دن متصل جانے کے اس کی اُدر اُٹھ اُٹھ کر

معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے
لگی سر سے جوں شمع پا تک گئی

مت حنائی پاؤں سے چل کر کہیں جایا کرو
دے یاسمنِ تازہ شگفتہ میں کہاں میرؔ

گلبرگ سے ہے نازک خوبیٔ پا تو دیکھو
کنارہ یوں کیا جاتا نہیں پھر

پائے حنائی اس کے ہاتھوں ہی پہ رکھے ہیں
کر کے تعویذ رکھیں اس کو بہت بھاتی ہے

پاؤں میر کلبۂ احزاں میں اب رہتا نہیں
کم کشو کو میرؔ کی میّت کی ہاتھ آئی نماز

زنجیر تو پاؤں میں لگی رہتی ہمارے
خاک ایسی عاشقی میں ٹھکرائے بھی گئے کل

رقیبوں سے سر جوڑ بیٹھو ہو کیونکر
رکھنا تمہارے پاؤں کا کھوتا ہے سر سے ہوش

آگے خطے سے دماغ تمہارا عرش پہ تھا سو وے ہی تم
نظر آئے تھے وے حنائی پا

کجیٔ ذہن اس وادی میں گمرہی کے باعث ہے
سبک پائی سی ہے بادِ صبا میں

تفاوت ہو گیا اب تو بہت پاؤں کی طاقت میں
تم سرگراں تو مجھ سے نہ ہو میں نشے میں ہوں

سب اس داغ نے آہ کھایا ہمیں
دلی ہے آخر، نہ ہنگامہ کہیں برپا ہو میاں

پلٹے گئے لطف اس کے جو پاؤں کے نشاں میں
کیا ہے جھمک کفک کی رنگ حنا تو دیکھو

اگر پائے محبت درمیاں ہو
پر اس کو خوش نہ آیا یہ کارِ دست بستہ

وہ نظر پاؤں پہ وہ بات دواتی اس کی
رفتہ رفتہ اس طرف جانے کی مجھ کو لت ہوئی

نعش پر اس بے سروپا کے بلا کثرت ہوئی
کیا اور ہو رسوا کوئی آشفتہ سری سے

پاؤں کنے سے اس کے پر میرؔ جی نہ سرکے
ہمیں تو نہیں دیتے ٹک پاؤں چھونے

یہ چال ہے تو اپنی کسے پھر خبر رہے
پاؤں زمیں پر رکھتے تھے تو خدا پر منت رکھتے تھے

آج تک فتنہ ایک برپا ہے
سلیم الطبع کو تو پاؤں کا ہر نقش ہادی ہے

دیوان سوم

اڑ کر لگی ہے پاؤں میں زلف اس کی پیچدار
عاشقوں کی پا تمالی میں اسے اصرار ہے

ہو کے دیوانے ہم ہوئے زنجیر
آکڑوں کی پاؤں میں بیڑی ہوئی

دل جگر جل کے ہو رہے ہیں دونوں ایک
برگِ گل میں نہ دلکشی ہو گی

بازی نہیں یہ سانپ کی کہ جو کھلائے گا
یعنی وہ محشر خرام اب پاؤں پھیلانے لگا

دیکھ کر اس کے پاؤں کا توڑا
ہاتھ میں سونے کی وہ زنجیرِ یار

درمیاں آیا ہے جب سے پلٹے داغ
کفِ پلئے نگار کے سے رنگ

کب تک حنائی پاؤں بن اس کے یہ بے کلی
کہیں کیا کفِ پا میں میر آبلے
مجرم اس خاطر ہوتا ہوں بعضے بعضے شوخی کر
ان پاؤں کو آنکھوں سے ہم ملتے رہے جیسا
جب یاد آگئے ہیں پائے حنائی اس کے
پیام اس گل کو اس کے ساتھ دیتے
عرصہ کتنا سارے جہاں کا دحشت پر جو آجادیں
جب دیکھتے ہیں پاؤں ہی دالو ہو اس کے میر
سر نیچے ہو تو پاؤں ترا دابیں ہم کبھو
گودمیں میرے رکھ دیتا ہے پاؤں حنائی دینے کو
گو خط اس کے پشتِ پا کا زہر ہو
دستِ افشاں پائے کوباں شوق میں

لگ جائے ٹک چمن میں کہیں آنکھ جائے گل
چلیں ہم سروں پر مگر دھر قدم
عذرِ گناہ میں جاکر اس کے پاؤں کو ہاتھ لگاتا ہوں
افسوس سے ہاتھوں کو اب ویسا ہی ملتے ہیں
افسوس سے تب اپنے ہم ہاتھ ہی ملے ہیں
سبک پائی نہ ہوتی گر صبا میں
پاؤں تو ہم پھیلادیں گے پر فرصت ہم کو پانے دو
کیوں ہوتے ہو ذلیل تم اتنا تو مت دبو
دیتا دہی ہے جس کے تئیں کچھ بھی ہو دباؤ
یوں پامال جو میں ہوتا ہوں مجھ کو بھی تو دب سی ہے
بوسۂ کنجِ دہن تریاق ہے
صومعے سے میر بھی باہر گئے

دیوان چہارم

...لباس سے میرے اسے کیا وہ رفتہ رعنائی کا
دیکھا جو راہ جاتے تبختر کے ساتھ اُسے
رنڈ کے جوڑے سے ان نے ہم کو پاؤں حنائی اپنے کیے
دیر سے اس اندیشے نے ناکام رکھا ہے میر ہمیں
عشق کے جو دارفتہ ہوئے ہم رفتہ رفتہ دوار ہوا
گھاس ہے میخانوں کی بہتر ان شیخوں کے مصلّے سے
دنگ ہمارا جیسا اب ہے کل ہے کو آگے ایسا تھا
صبر کیا نہیں جاتا ہم سے رہ کے جدا نستاؤ تم
عشق کی راہ میں پاؤں رکھا سو رہنے لگے کچھ رفتہ سے
پاؤں کو دامنِ محشر میں ناچاری سے ہم کھینچیں گے
دل جو ہے تو پاؤں کو بھی دامن میں ہم کھینچ رکھیں
دیکھ رہیے خرام ناز اس کا

جامہ کا دامن پاؤں میں الجھا ہاتھ آنچل آ کلائی کا
پھر مجھ شکستہ پا سے نہ یک دم رہا گیا
خون ہمارا بسمل گہ میں کن رنگوں پامال کیا
پاؤں چھوئیں گے اس کے ہم تو وہ بھی ہاتھ لگا دے گا
پاؤں میں چکر ہوتا ہے، یاں سر میں بھی چکر ہے آج
پاؤں نہ رکھ سجادے پہ ان کے اس جادے سے راہ نہ کر
پاؤں میں مہندی اپنے لگا کر آفت لائے سر پہ تم
پاؤں کا رکھنا گرچہ ادھر کو عار سی ہے پر آؤ تم
آگے چل کر دیکھیں ہم اب گم ہو دیں یا پیدا ہوں
لائق اپنی وحشت کے اس عرصہ کا میدان نہیں
صبح سے لے کر سانجھ تلک ادھر ہی آنا جانا ہے
پر کسو پا سے گر رہا بھی جائے

دیوان پنجم

کوشش میں سر مارا لیکن در پہ کسو کے جا نہ سکا
غنچہ ہوا ہے خارِ بیاباں بعد زیارت کرنے کے
کشتی ہماری عشق میں کیا تھی پلک جھپکتے پاک ہوئی
کیا کام اس کو یاں کے نشیب و فراز سے
سیاحت خوب مجھ کو یاد ہے پر کی بھی وحشت کی
شوقِ جنوں ہے دیوانوں کے سرمیں پاؤں میں زنجیریں ہیں
کیا گل مہتاب و شبو کیا سمن کیا نسترن
سوئے تو غنچہ ہو کسو گلشن کے آس پاس
کیا کہوں آئے گھر سے گھر سے تو اک شوخی سے
دیکھ کر وہ راہ چلتا ہی نہیں ٹک ورنہ ہم
مستی و دیوانگی کا عہد ہے بازار میں
بٹھلا دیا فلک نے ہمیں نقشِ پا کے رنگ
میرؔ سے طے ہو گا بیابانِ محبت کس طرح
پائے ثبات کس کا ٹھہرا ہے اس کے دیکھے

تن پہ زبان شکر ہے ہر مو اپنی شکستہ پائی کا
پانی تبرک کرتے ہیں سب پاؤں کے میرے چھالوں کا
پائے ثبات نہ ٹھہرا دم بھر اس میدان میں رستم کا
تکتا ہے پاؤں دیکھ کے ہموارہ درد مند
پر اپنا پاؤں پھیلے دشت کے سر تیز خاروں پر
سنگ زناں لڑکے پھرتے ہیں ہر سر سودائی پر
اس حدیقے میں نہ نقشِ پا سے اس کے پائے گل
اس تنگنا میں پاؤں بھی پھیلا سکے نہ ہم
پاؤں کے مرے ہاتھ دیا بیٹھے ہیں
پاؤں اس کے آنکھوں پہ رکھ دیویں جو منظور ہو
پائے کوہاں دست افشاں آن کرد سودا کرو
اٹھنا ہمارا خاک سے ہے اب خدا کے ہاتھ
راہ ہے پُرخار میرے پاؤں میں ہیں آبلے
ہے ناز اک قیامت انداز اک بلا ہے

دیوان ششم

لوگ سر دینے جاتے ہیں کب سے
جو راہِ دوستی میں اسے میرؔ مر گئے ہیں
واماندہ نقشِ پا سے یک دست ہم ہیں بیکس
پائے گیر اس کے نہ ہوں کیوں دردمند
شور جن کے سروں میں عشق کے تھے

یار کے پاؤں کے نشانوں پر
سر دیں گے لوگ ان کے پائے نشاں کے اوپر
دشوار ہے پہنچنا اب اپنا کارواں تک
حلقہ حلقہ زلف وہ زنجیر ہے
وے جواں سارے پائے گیر ہوئے

جان (جی)

دیوان اوّل

الجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اس کے عشق میں
بے تاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
بوئے خوش سے جی رکا جاتا ہے اے بادِ بہار
آتش تیز جدائی میں یکایک اس بن
جی میں آتی ہے کہ کچھ اور بھی موندوں کیجے
کچھ دیر ہی لگی نہ دل کو تو تیر لگتے
ہم نے تو سادگی سے کیا جی کا بھی زیاں
جان گھبراتی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا
دل تاب ہی نہ لایا ٹک تا یاد رہتا ہمنشیں
مر رہتے جو کل ہم تو سارا یہ خلل جاتا
سنبھلنے میں جان کے ہوش و حواس و دم نہ تھا
آخر کو مر گئے ہم اس کی ہی جستجو میں
لگتی نہیں ہے دارو ہیں سب طبیب حیراں
شب درد و غم سے عرصہ مرے جی پہ تنگ تھا
تدبیر میرے عشق کی کیا فائدہ طبیب
کوچہ میں اس کے رہنے سے باز آ وگرنہ میر
ناکامیٔ صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ
یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
گور سے تاپ نہیں اٹھتے تو نے اگتی ہے
ہر چند ناتواں ہیں پہ آ گیا جو جی میں
نہیں گزرتی گھڑی کوئی مجھ خراب پہ آہ

دل سا عزیز جان کا جنجال ہو گیا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا
ہو گیا ہے چاک دل شاید کسو دلگیر کا
دل جلا یوں کہ تنک جی بھی جلایا نہ گیا
دردِ دل ایک غزل میں تو سنایا نہ گیا
اس صید ناتواں کا جی کیا شتاب نکلا
دل جو دیا تھا سو تو دیا سر جدا دیا
تنگ احوال ہے اس یوسفِ زندانی کا
اب عیش روزِ وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا
نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا
اسباب سارا لے گیا آیا تھا اک سیلاب سا
جی کے تئیں بھی کھویا لیکن اسے نہ پایا
اک روگ میں بسا ہا جی کو کہاں لگایا
آیا شب فراق تھی یا روز جنگ تھا
اب جان ہی کے ساتھ یہ آزار جائے گا
اک دن تجھے وہ جان سے بھی مار جائے گا
اب جی سے گزر جاتا کچھ کام نہیں رکھتا
ناداں پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا
جی گیا پر نہ ہمارا سرِ پر شور گیا
دیں گے ملا زمیں سے تیرا فلک قلابا
کہ جس میں غم سے ترے جی ڈھا نہیں جاتا

ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں
جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا
گل نے ہرچند کہا باغ میں رہ پر اس بن
بے کسا نہ جی گرفتاری سے شیون میں رہا
ناکسی سے پاس میرے یار کا آنا گیا
میرا جی تو آیا یہ آنکھوں میں سنتے
کب تلک یہ ستم اٹھائیے گا
تھی مصلحت کہ مرکر ہجراں میں جان دیتے
مت پوچھ کس طرح سے کٹی رات ہجر کی
جانِ بلب رسیدہ سے اتنا ہی کہنے پائے ہم
بس تو کہا تھا تیرے تئیں آ ڈ سمجھ نہ ظلم کر
جی گیا میر کا اس لیت و لعل میں لیکن
داد دو ورنہ ابھی جان سے کھیلوں ہوں میں
حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی خوبی اپنی قسمت کی
وعدہ تو کیا اس نے دمِ صبح کا لیکن
اب کے جو تیرے کوچے سے جاؤں گا تو سنیو
حال دل میر کا رو رو کے سب اے ماہ سنا
شکوہ کروں میں کب تک اس اپنے مہرباں کا
خون سے میرے ہوئی یک دم خوشی تم کو ولیک
مدعا جو ہے سو وہ پایا نہیں جاتا کہیں
تلوار مارنا تو تمہیں کھیل ہے ولے
ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
ستم میں غم میں سرانجام اس کا کیا کہیے
آہ کس انداز سے گزرا بیاباں سے کہ میر
ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا
جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
تو برسوں میں ملے ہے یاں فکر یہ رہے ہے

خیال بھی کبھو گزرا نہ پرفشانی کا
اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا
جی جو اچٹا تو کسی طرح لگایا نہ گیا
ایک دل غم خوار رکھتے تھے سو گلشن میں رہا
بس گیا میں جان سے اب اس سے یہ جانا گیا
کہ دیدار بھی ایک دن عام ہو گا
ایک دن یونہی جی سے جائیے گا
دل کھول کر نہ غم میں میں ایک بار رویا
ہر نالہ میری جان کو تیغ کشیدہ تھا
جاوے اگر تو یار تک کہیو ہماری بھی دعا
آخر کارِ بے وفا جی ہی گیا نہ میر کا
رہ گیا ظلم ہی تیرا، نہ بہانا ہی گیا
دل جلانا نہیں دیکھا کسو فریادی کا
ہم جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا
اس دم تئیں مجھ میں بھی اگر جان رہے گا
پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا
شب کو القصہ عجب قصۂ جانکاہ سنا
القصہ رفتہ رفتہ دشمن ہوا ہے جاں کا
مفت میں جاتا رہا جی ایک بے تقصیر کا
ایک عالم جستجو میں جی کو اپنے کھو گیا
جاتا رہے نہ جان کسو بے گناہ کا
سنے عشق کو ہے حرفے حسن کو حجابا
ہزاروں حسرتیں تھیں تس پہ جی کو مار رہا
جی ہر اک نخچیر کا اس صید افگن میں رہا
سب کہیں گے یہ کہ کیا اک نیم جاں مارا گیا
پہ سخن تا بلب نہیں آتا
جی جائے گا ہمارا اک دم کو یا رہے گا

جی کھنچ رہے ہیں ادھر عالم کا ہو گا بلوہ
جیتے جی پاس ہوکے نہ نکلا کسو کے میرؔ
تری ہی راہ میں مارے گئے سب ہی آخر
ہیں صید گہ کے تیری صیاد کیوں نہ دھڑکے
جی اپنا میں نے تیرے لیے خوار ہو دیا
جس صید گاہِ عشق میں یاروں کا جی گیا
جی تو ایسے کئی صدقے کیے تجھ پر لیکن
آنکھیں کھلیں مری جب جی میرؔ کا گیا تب
کف چالاک میں تیری جو تھا سر رشتہ جانوں کا
ہنوز آوارۂ لیلیٰ ہے جانِ رفتہ مجنوں کی
ابلہ وہ جو ہووے خریدار گل رخاں
کچھ اور گاتے ہیں جو رقیب اس کے روبرو
کوئی رہتا ہے جی بے جی ترے کوچے کے آنے سے
ان نے تو تیغ کھینچی تھی پر جی چلا کے میرؔ
دھوکے ترے کسی دن میں جان دے رہوں گا
سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت
قیس وفرہاد اور وامق عاقبت جی سے گئے
امکاں نہیں جیتے جی ہو قید سے آزاد
تقصیر نہ خوباں کی نہ جلاد کا کچھ جرم
اس راز کو رکھ جی ہی میں تا جی بچے تیرا
جی میں تھا اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہیے میرؔ
جی سدا ان ابروؤں ہی میں رہا
عاشقی و بے کسی و رفتگی
تو نہ تھا مردنِ دشوار میں عاشق کی آہ
جی لیا بوسۂ رخسارِ مخطط دے کر
جانبر تمہارے ہاتھ سے ہوگا نہ اب کوئی
بیٹھا ہوں میرؔ مرنے کو اپنے میں مستعد

گر شانے تو تے اس کی زلفوں کا تار کھینچا
وہ دور گرد بادیۂ عشق دور تھا
سنو تو ہم کو ہے درپیش جی کے جانے کا
کہتے ہیں صید جو ہے بے جان ہے ہمارا
آخر کو جستجو نے تری مجھ کو کھو دیا
مرگ اس شکار گہ کا شکارِ رمیدہ تھا
حیف یہ ہے کہ تنک تو بھی پشیماں نہ ہوا
دیکھے سے اس کے ورنہ میرا بھی جی جلا تھا
گریباں سے مرے ہر اک تماشا نکا رفو ٹوٹا
موئے پر بھی رہا ہوتا نہیں وابستۂ الفت کا
اس سودے میں صریح ہے نقصان جان کا
دشمن ہیں میری جان کے یہ جی ہے تن کا
تبھی آسودہ ہوگا میرؔ صاحب جی سے جاوے گا
ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا
کرتا ہے ماہ میرے گھر سے گزار ہر شب
تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت
سب کو مارا عشق نے مجھ خانماں ویراں سمیت
مر جانے تب ہی چھوٹے گرفتارِ محبت
تھا دشمن جانی مرا اقرارِ محبت
زنہار جو کرتا ہو تو اظہارِ محبت
پر کچھ کہا گیا نہ غم دل حیا سے آج
کی بسر ہم عمر تلواروں کے بیچ
جی رہا کب ایسے آزاروں کے بیچ
حسرتیں کتنی گرہ تھیں رمق اک جان کے بیچ
عاقبت ان نے ہمیں زہر دیا پان کے بیچ
دیکھنے لگے ہو ہاتھ میں تلوار بے طرح
پیدا نہ ہوں گے مجھ سے بھی جانباز میرے بعد

بھولا جا ہے غمِ بتاں میں جی
مت عیب کر جو ڈھونڈوں میں اس کو کہ مدعی

کر رحم ٹک کب تک ستم مجھ پہ جفا کار اس قدر
جی میں آوے سو کیجیو پیارے

جاتا ہے آسماں لیے کوچے سے یار کے
تیرے خرامِ ناز پہ جاتے ہیں جی چلے

جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میر
لوحِ تربت پہ مری پہلے یہ لکھیو کہ اسے

دل پہ کب اکتفا کرے ہے عشق
کہتے نہ تھے کہ جان سے جلتے رہیں گے ہم

دل پُرخوں تو تھا گلابی شراب
آزار دیکھے کیا کیا ان پلکوں سے اٹک کر

یہ عشق بے اجل کش ہے بس اب اے دل توکل کر
مرتے ہیں تیرے نرگسِ بیمار دیکھ کر

آنکھوں میں آن رہا جی جو نکلتا ہی نہیں
لب پہ آئی یہ جان کب کی ہے

آ رہا ہے جی مرا آنکھوں میں اک پل اور ہوں
ٹک تو انصاف کر اے دشمنِ جانِ عاشق

تن کام میں ہمارے دیتا نہیں ذرا بھی کچھ
توشۂ آخرت کا فکر رہے

باقی یہ داستاں ہے اور کل کی رات ہے
جانبیں ہیں فرش رہ تیری مت ہال ہال چل

تا شام اپنا کام کھنچے کیونکہ دیکھئے
اللہ رے عندلیب کی آوازِ دلخراش

یہ تیغ ہے یہ طشت ہے یہ ہم ہیں کشتنی
آئے تو ہو طبیباں تدبیر گرد کرو تم

ہوتا نہ دل کا تا یہ سر انجام عشق میں
غرض آتا ہے پھر خدا ہی یاد

یہ جی بھی یونہی جائے گا رہتا ہے تو کدھر
یک سینہ خنجر سیکڑوں اک جان و آزار اس قدر!

ایک ہوتا نہ درپئے آزار
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

رکھ ٹک قدم زمیں پر ستم گار دیکھ کر
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

یار دشمن ہوگیا جاں سے مار آخر کار
جائے گا جان بھی یہ غم لے کر

اچھا نہیں ہے، آ، نہ ہمیں امتحان کر
جی ہی اپنا چلا نہ صہبا پر

جی لے گئے یہ کلنٹے دل میں کھٹک کھٹک کر
اگرچہ جان جاتی ہے چلی لیکن تغافل کر

جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر
دل میں میرے ہے گرہ حسرتِ دیدار ہنوز

اس کے موقوف یک اشارہ ہنوز
پر نہیں جاتا کسو کے دیکھنے کا غم ہنوز

میان سے نکلی پڑے ہے تری تلوار ہنوز
حاضر ہیں میرؔ ہم تو اپنی طرف سے جاں تک

جی سے جانے کا ہے سفر نزدیک
گر جان میری میرؔ نہ آپہنچے لب تلک

اے رشکِ حور آدمیوں کی سی چال چل
پڑتی نہیں ہے جی کو جفا کار آج کل

جی ہی نکل گیا جو کہا ان نے ہائے گل
کھیلے ہے کون ایسی طرح جان پر کہ ہم

ایسا نہ ہو کہ میرے جی کا ضرر کرو تم
لگنے ہی جی کے مر گئے ہوتے بلا سے ہم

آسودگی تو معلوم اے میرؔ جیتے جی یاں
آیا کمال نقص میرے دل کی تاب بیں
غم کھینچنے کی کچھ تو توانائی چاہیے
ہوویں شیفتہ کیوں اضطراب پر عاشق
نہیں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
تربت سے عاشقوں کے نہ اٹھا کبھو غبار
وہ ترکِ صید پیشہ مرا قصد کیا کرے
مر کر بھی ہاتھ آوے تو میرؔ مفت ہے وہ
جی میں پھرتا ہے میرؔ وہ میرے
یہ بے قراریاں نہ کبھو ان نے دیکھیاں
پچھتاییے نہ کیونکر جی اس طرح سے دے کر
نظر آتے ہیں ہوتے جی کا وبال
سبھی آتشیں ہیں نالے سبھی زمہریری آہیں
گیا جان سے اک جہاں لیک شوخ
ایک بیمارِ جدائی ہوں میں آپ ہی تس پر
کبھو قاصد جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں
تجھ بن اس جان مصیبت زدہ غمدیدہ پہ ہم
جنس گراں کو تجھ سے جو لوگ چاہتے ہیں
جاتا ہے اک ہجومِ غم عشق جی کے ساتھ
کہاں کے شمع و پروانے گئے مر
جن کے لیے اپنے تو یوں جان نکلتے ہیں
یہ جی جو میرؔ گلے کا ہے ہار تو ہی لے
نہ آیا وہ تو کیا ہم نیم جاں بھی
چلے ہے تو تو اے جانِ المناک
مارا مجھے بھی سان کے غیروں میں ان نے میرؔ
دیا عاشق نے جی تو عیب کیا ہے
اک فقط ہے سادگی تس پہ بلائے جان ہے تو

آرام تب ہی پاؤں جب جی سے ہاتھ اٹھاؤں
جاتا ہے جی چلا ہی مرا اضطراب میں
سو یاں نہ دل میں تاب نہ طاقت ہے جان میں
کہ جی کو کھو کے دل بے قرار پاتے ہیں
اک آگ میرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں
جی سے گئے وے نہ گئیں رازداریاں
دبلے پنے سے تن میں مرے جان ہی نہیں
جی کے زیاں کو بھی ہم سود جانتے ہیں
جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں
جان کا ہیاں ہماری بہت سہل جانیاں
یہ گوہرِ گرامی ہم مفت کھو چلے ہیں
حلقہ حلقہ تمہارے بال ہمیں
میری جان پر رہا ہے غرض اک عذاب تجھ بن
نہ تجھ سے گئیں یہ دل آزاریاں
پوچھنے والے جدا جان کو کھا جلتے ہیں
جان و ایمان و محبت کو دعا کرتے ہیں
کچھ نہیں کرتے تو افسوس کیا کرتے ہیں
وہ روگ اپنے جی کو ناحق بسا لیتے ہیں
ہنگامہ لے چلے ہیں ہم اس بھی جہان میں
بہت آتش بجاں تھے اس چمن میں
اس راہ میں وہ جیسے انجان نکلتے ہیں
ترے گلے کے لیے میں یہ ہار لایا ہوں
بغیر اس کے ملے دنیا سے جاویں
ٹک اک رہ جا کہ ہم رخصت ہو آویں
کیا خاک میں ملائیں مری جانفشانیاں
یہی میرؔ اک ہنر ہوتا ہے ہم میں
عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں

خوبرو سب کی جان ہوتے ہیں
پھر جئیں گے جو تجھ سا ہے جاں بخش
مسافر ہووے جی اس کا خراماں دیکھ کر تجھ کو
اعجاز عیسوی سے نہیں بحث عشق میں
جی جاوے تو قبول تیرا غم نہ جائیو
خلاف ان اور خوباں کے سدا یہ جی میں بستا ہے
ہمیں تو نزع میں شرمندہ آ کے ان نے کیا
نہیں جیتے جی تو ممکن ہمیں تجھ بغیر سونا
دیکھا کہاں وہ نسخہ اک روگ میں بساہا
شب نالہ آسماں پر جی سخت کر کے پہنچا
گزر جان سے اور ڈر کچھ نہیں
کسی کے واسطے رسوائے عالم ہو پہ جی میں رکھ
جاویں نثار ہونے کو ہم کس بساط پر
دیار حسن میں غالب کہ خستہ جانوں نے
کہیں تو ہیں کہ حبث میر نے دیا جی کو
اس تیغ زن سے کہیو قاصد مری طرف سے
صبح سے یاں پھر جان و دل پر روز قیامت رہتی ہے
جو ئیں نہ ہوں تو کرو ترک ناز کرنے کو
تو تو دچار ہو کے گیا کب کا یاں ہنوز
اس کی طرزِ نگاہ مت پوچھو
جز جرم عشق کوئی بھی ثابت کیا گناہ
کیا موافق ہو دوا عشق کے بیمار کے ساتھ
راہ اس شوخ کی عاشق سے نہیں رک سکتی
نہ ٹھہری کچھ اک جان بر لب رسیدہ
ہو جہاں میر اور غم اس کا
بات شکوہ کی ہم نے نگاہ نہ کی
سو ملک پھرا لیکن پائی نہ وفا اک جا

آرزوئے جہان ہوتے ہیں
ایسا جینا ہمیں ضرور نہیں
جسے میرے وطن میں کبک خوش رفتار کہتے ہیں
تیری ہی بات جانِ مجسم بہت ہے یاں
رکھتا نپٹ عزیز ہوں اس میہماں کو میں
یہی تو میر اک خوبی ہے معشوق خیالی میں
رہا ہے ایک رمق جی سو کیا نثار کریں
مگر آنکھ مرکے کیجے تہِ خاک خواب تجھ بن
جی پھر کبھو نہ جیتا بہتیری کیں دوائیں
تھیں نیم کشتۂ یاس اکثر مری دعائیں
رہِ عشق میں پھر خطر کچھ نہیں
کہ مارا جائے جو ظاہر کرے اس رازِ پنہاں کو
اک نیم جاں رکھے ہیں سو وہ جب قبول ہو
دوا کے واسطے بھی مہر تک نہ پائی ہو
خدا ہی جانے کہ کیا جی میں اس کے آئی ہو
اب تک بھی نیم جاں ہوں گر قصدِ امتحاں ہو
رات کبھو آ رہتے ہو تو دن ہم کو دکھلاتے ہو
کوئی تو چاہیئے جی بھی نیاز کرنے کو
گزرے ہیں اپنی جان سے ناچار ایک دو
جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو
ناحق ہماری جان لی اچھے ہو واہ واہ
جی ہی جلتے نظر کئے ہیں اس آزار کے ساتھ
جان جاتی ہے چلی خوبیٔ رفتار کے ساتھ
ہمیں مدعا گفتگو تھی کسو کی
جس سے عالم کی جان پر آئی
بلکہ دی جان اور آہ نہ کی
جی کھا گئی ہے میرا اس جنس کی نایابی

کوئی رہنے والی ہے جانِ عزیز
کس کس کا داغ دیکھیں یارب غمِ بتاں میں
کوئی بات نکلے ہے دشوار منہ سے
ملائی خوب مری خوں میں خاک بسمل گاہ
میں کہا میرؔ جاں بلب ہے شوخ
اضطراب و قلق و ضعف میں کس طور جیوں
دلا اس کے گیسو سے کیوں لگ چلا تو
اب کے بھی سیرِ باغ کی جی میں ہوس رہی
در پئے جان ہے قراولِ مرگ
تنک تو لطف سے کچھ کہہ کہ جاں بلب ہوں میں
بن جی دئیے نہیں ہے امکاں یہاں سے جانا
گئے جی سے چھوٹے بتوں کی جفا سے
کہتے ہیں حجاب رخِ دلدار ہے ہستی
عشق میں نہ خوف و خطر چاہئے
ہ دم تیغ پہ ہو کیوں نہ میرؔ
نازکی کو عشق میں کیا دخل ہے اے بوالہوس
گل دیکھ کر چمن میں تجھ کو کھلا ہی جا ہے
قربانِ گہِ محبت وہ جا ہے جس میں ہر سو
اپنے ہی جی میں آخر انصاف کو کہ کب تک
سیں غش آگیا تھا وہ بدن دیکھ
صد نالۂ جانکاہ ہیں وابستہ چمن سے
ہوں دوست جو کہتا ہوں سن اے جان کے دشمن
ہم آپ سے جاتے رہے ہیں ذوقِ خبر میں
ہے جی میں غزلِ در غزل اے طبع یہ کہئے
اپنا شعار پوچھو تو مہرباں وفا ہے
جیتے ہی جی تلک ہیں سارے علاقے سو تو
جیوں سے جاتے ہیں ناچار آہ کیا کیا لوگ

گئی گر نہ امروز فردا گئی
رخصت طلب ہے جاں بھی ایمان اور دیں بھی
ٹک اک تو بھی سن لے کسو جاں بلب کی
یہ تھوڑی منتیں ہیں مجھ پہ سخت جانی کی
تو نے کوئی خبر کو بھیجا بھی
جان واحد ہے مری اور ہیں آزار کئی
یہ اک اپنے جی کی بلا کیا نکالی
اپنی جگہ بہار میں، کنج قفس رہی
کسو کے تو شکار ہیں ہم بھی
وہی ہے بات مری جاں بلب کوئی دم کی
بسمل گہہ جہاں میں اب ہم تو میرؔ آئے
یہی بات ہم چاہتے تھے خدا سے
دیکھیں گے اگر یونہی بھلا جان بھی جا لے
جان کے دینے کو جگر چاہئے
جی پہ رکھیں گے تو گزر جائیں گے
یاں صعوبت کھینچنے کو جی میں طاقت چاہیے
یعنی ہزار جی سے قرباں ہو رہا ہے
دشوار جان دینا آساں ہو رہا ہے
تو بہ ستم کرے گا ہم درگزر کریں گے
بڑی کلول ٹلی ہے جان پر سے
کوئی بال شکستہ پسِ دیوار نہ ہووے
بہتر تو ترک ہی ہے تا خوار نہ ہووے
اے جان بلب آمدہ رہ، تا خبر آوے
شاید کہ نظیریؔ کے بھی عہدے سے بر آوے
پر اس کے جی میں ہم سے کیا جانیے کہ کیا ہے
عاشق ترا تو مجھ کو فارغ ہی ہو چکا ہے
کبھو تو جانبِ عشاق بھی گزر جائیے

غیروں پہ اگر کھینچو گے شمشیر تو خوباں
اس شکار افگن کے کوچہ سے نہیں جاتا ہے ظلم
اب کیا کریں نہ صبر ہے دل کو نہ جی کو تاب
مرتا ہے کیوں تو ناحق یاری برادری پر
ہاتھ کیا آوے وہ کمر ہے ہیچ
یاں جو وہ نونہال آتا ہے
اب جان جسم خاک سے تنگ آگئی بہت
شب گئے تھے باغ میں ہم ظلم کے مارے ہوئے
قصد گر امتحان ہے پیارے
کام میں قتل کے مرے تن دے
میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے
یک حرف کی بھی مہلت ہم کو نہ دی اجل نے
دل گر میاں انصوں کی غیروں سے جب نہ تب تھیں
قبر عاشق پر مقرر روز آتا کیجئے
ہر صبح تو خورشید ترے منہ پہ چڑھے ہے
اب چیت کر نہیں کچھ تازہ ہوا ہوں بیکل
بارے نسیم ضعف سے کل ہم اسیر بھی
قبول کر شیے تری رہ میں جی کو کھو دینا
کچھ ہے جواب جو میں کروں حشر کو سوال
مرے اس اک کے مرجانے سے وہ غافل ہے کیا جانے
کب تلک جی رکے خفا ہووے
نہیں وسواس جی گنوانے کے
اس بے دمی میں بھی کبھو دل بھر اٹھے ہے دم ترا
اس آرزوئے وصل نے مشکل کیا جینا مرا
بیتابیوں میں تنگ ہم آئے ہیں جان سے
جی میں تھا عرش پہ جا باندھئے تکیہ لیکن
جی ڈوبتا ہے اس گہر تر کی یاد میں

اک اور مری جان پہ بیداد کرو گے
ایک اگر جی سے گیا تو نیم بسمل ایک ہے
کل اس گلی میں آٹھ پہر غش پڑے رہے
دنیا کے سارے نلتے ہیں جیتے جی تلک کے
یوں کوئی جی میں کیا خیال رکھے
جی میں کیا کیا خیال آتا ہے
کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے
جان کو اپنی گلِ مہتاب انگارے ہوئے
اب تلک نیم جان ہے پیارے
اب تلک مجھ میں جان ہے پیارے
جان ہے تو جہان ہے پیارے
تھا جی میں آہ کیا کیا پر کچھ نہ کہنے پائے
مجلس میں جب گئے ہم غیرت نے جی جلائے
جو گیا ہو جان سے اس کو بھی جانا کیجئے
ایسا نہ ہو یہ سادہ کہیں جی سے اتر جائے
آیا ہوں جب بخود میں جی اس میں جا رہا ہے
سنا ہے میں جی کے گلستاں تلک گئے
جو کچھ بھی پائیے تجھ کو تو آشنا بھی ہے
مارا تھا تو نے جان سے کہہ کس سبب مجھے
گزرنا جان سے آساں بہت مشکل ہے کیا جانے
آہ کریے کہ ٹک ہوا ہووے
ہائے رے ذوق دل لگانے کے
اک کم شتابی بے وفا اب تک تو مجھ میں جان ہے
ورنہ گزرنا جان سے اتنا نہیں آسان ہے
وقتِ شکیب خوش کہ گیا درمیان سے
بستر! خاک ہی میں اب تو بچھایا ہم نے
پایانِ کارِ عشق میں ہم مر چلے ہوئے

جی ڈہا جائے ہے سحر سے آہ   رات گزرے گی کس خرابی سے

دیوان دوم

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
جاتی ہے گزر جی پر اس وقت قیامت سی
در پے ہمارے جی کے ہوا غیر کے لیے
ہوا ہوں تنگ بہت کوئی دن میں سن بیجو
گیا میں جان سے وہ بھی ٹک آتا تو کیا ہوتا
میرے مُردے سے بھی وہ چونکے ہے
جی کوئی لگتا ہے اس کے اٹھ گئے پر باغ میں
جی دیتے ہیں مرنے پر سب شہر محبت میں
جب نہ تب مرنے کو تیار رہے عشق میں ہم
کہتے نہ تھے کہ صاحب اتنا نہ کڑھا کریے
میرؔ اظہارِ محبت میں گیا جی نہ ترا
جی دے کے لیتے ایسے معشوق بے بدل کو
کر دں یاد اسے میں جو ہوں آپ میں
نظر میں آوے گا جب جی کا کھونا
طفلی کی ادا تیری یہ جاتی نہیں جی سے
گر عشق نہیں ہے تو یہ کیا ہے بھلا مجھ کو
تکلیف نہ کی ہم نے اس وحشی کو مرنے کی
اس بدزباں نے حرفِ سخن آہ کب کیا
کچھ آگے کئے ہوتے جو منظور لطف تھا
تفصیلِ حال میری تھی باعثِ کدورت
جی ہی جاتے سنے ہیں عشق کے مشہور ہوئے
جی میں تھا خوب جا کے خرابے میں رہیے
اٹھے تعب فراق کے جی سے کہاں تلک
کیا کروں ناچار مرنے کو ہوا تیار میں

کیا خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا
یاد آوے ہے جب تیرا ایک بارگی آ جانا
انجام کار مدعی کا مدعا ہوا
کہ جی سے ہاتھ اٹھا کر وہ اٹھ گیا نہ رہا
قدم دو ساتھ میری نعش کے جاتا تو کیا ہوتا
اب تلک مجھ میں جان ہے گویا
گل نے بہتیرا کہا ہم سے نہ ٹک ٹھہرا گیا
کچھ ساری خدائی سے یہ طور نیا دیکھا
جی کے تئیں اپنے کبھو ہم نے نہ جانا کیا تھا
اس غم نے میرؔ تجھ کو جی سے ندان ہارا
ہائے نادان بہت تو نے چھپایا ہوتا
یوسف عزیز دلہا سستا بہت بکایا
سویاں جی ہی اب بھول جانے لگا
ملے گا نیند بھر تب مجھ کو سونا
ہم دیکھتے تجھ کو تو، تو منہ کو چھپا جاتا
جی خود بخود اے ہمدم کاہے کو کھپا جاتا
تھا میرؔ تو ایسا بھی دل جی سے اٹھا جاتا
چپکے ہی چپکے ان نے ہمیں جاں بلب کیا
ہم جی سے اپنے جا چکے تم قصد تب کیا
سو جی کو خوش نہ آیا ہر گز ملال تیرا
کیا کیا ہم نے کہ اس راز کو اظہار کیا
سیلاب آیا آگے چلا گیا ہنگوں ہوا
دل جو بجا رہا نہ ہمارا بجا ہوا
دل کی روز و شب کی بیتابی سے جی گھبرا گیا

سراپا آرزو ہم لوگ ہیں کا ہے کو رندوں ہیں
ہر ذی حیات کا ہے سبب جو حیات کا
کچھ بھی معاش ہے یہ کہ ان نے ایک چشمک
قاصد کو دے کے خط نہیں کچھ بھیجنا ضرور
اب گھٹتے گھٹتے جلی میں طاقت نہیں رہی
کھو ہی رہا نہ جلن کو نا آزمودہ کار
ہم نے جو کچھ اس سے دیکھا سو خلافِ چشم داشت
کوتاہ تھا فسانہ جو مرجاتے ہم شتاب
ئیں غش کیا جو خط لے ادھر نامہ بر چلا
بلبل کو موا پایا کل پھولوں کی دُکاں پر
سنگِ بالیں میر کا حوبانٹ کا روڑا ہوا
سبز بختی یہ ہے اس کے طائرِ سدرہ کو رشک
اس کامِ جان و دل نے عالم کا جان مارا
کب جی بچے ہے یار و خوش رو و مُو بتاں سے
یہ رنگی بھی ہوتی ہے جی ہی چلا گیا
کبھو جو آن کے ہم سے بھی تو ملا کرتا
محبت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ
سیکڑوں بے بسوں کا جان گیا
داغِ خوباں ہے خاک میں بھی ساتھ
پھرتے پھرتے تلاش میں اس کی
کون جی سے نہ جائے گا اے میر
جی ڈوب جائے دیکھیں جہاں بھر نظر ادھر
جاں بخشیاں جو پیشتر از خط کیا کیے
مرفہ نہیں ہے مطلق جانِ عزیز کا بھی
شوقِ رخ یادِ لب غم دیدار
بلا آشوب تھا گو جان پر آغازِ الفت میں
دریا چلا ہے آج تو بوس و کنار کا

ہے ہے ہیں اب تلک بھی جیتے و ہے جی مار مار اپنا
نکلے ہے جی ہی اس کے لیے کائنات کا
جب مدتوں ہمارا جی دیکھنے کو ترسا
جاتا ہے اب تو جی ہی ہمارا چلا ہوا
ٹک لگ چلی صبا کہ دیا سا بڑھا دیا
ہوتا نہ میر کاش طلب گارِ عشق کا
اپنا عزرائیل وہ جانِ مجسّم ہو گیا
جی پر وبال سب ہے یہ عمرِ دراز کا
یعنی کہ فرطِ شوق سے جی بھی ادھر چلا
اس مرغ کے بھی جی میں کیا شوق تھا چمن کا
سخت کر جی سو گیا اس جا سے وہ رنجور کیا
جو شکار اس تیغ کے سایہ تلے بے جاں ہوا
زلفوں کی درہمی سے برہم جہان مارا
گر صبح بچ گیا تو پھر شام آن مارا
کل حالِ میر دیکھ کے غش مجھ کو آ گیا
تو تیرے جی میں مخالف نہ اتنی جا کرتا
سدا ئیں تو رہتا ہوں بیمار سا
پر یہ تیرا نہ امتحان گیا
جی گیا پر نہ یہ نشان گیا
ایک میرا ہی یوں نہ جان گیا
حیف یہ ہے کہ تو جوان گیا
تم کہتے ہو نہیں مرے چاہِ ذقن میں آب
ان ہی لبوں سے خلق خدا جاں بلب ہے اب
اے میر تجھ سے ظالم ہے احتراز واجب
جی میں کیا۔ کیا مرے رہا صاحب
ہوا سو تو ہوا، اندیشۂ انجام کرئیے اب
گر جی چلا دے کوئی دوا نہ تو دعب ہے اب

ہزاروں خواہشِ مردہ نے سرِ دل سے نکالا ہے
دیکھئے کب ہو وصال اب تو لگے ہے ڈر بہت
آزاد ہیں تو عشق کے جاتا ہے بھول جی
سخت کر جی کیونکہ یکباری کریں ہم ترکِ شہر
پر وہ اٹھتا ہے تو پھر جان پہ آ بنتی ہے
میرزائی کا کب اسے میرؔ چلا عشق میں کام
خضر و عیسیٰ کے تئیں نام کو جیتا سُن لو
آتی ہے نحن کی بو دوستیٔ یار کے بیچ
گرچہ چھپتی نہیں چاہ پہ وہ منکر پاک
کس طرح جی سے گزر جاتے ہیں آنکھیں مُوند کر جو
ہے اگر ذوق وصال اس کا تو جی کھو بیٹھے
کرتے تو ہو ستم پہ نہیں رہنے کے حواس
جان کا صرفہ نہیں ہے کچھ تجھے کشتے میں میرؔ
بر آر میرؔ سے کس طرح تیری صحبت ہو
جی بھول گیا دیکھ کے چہرہ وہ کتابی
ہر آن وہ انداز ہے کہ جس میں کہے جی
اک بار تو نے آکر خاطر نہ میری رکھی
تجھ سے دو چار ہونا پھر آہ بن نہ آیا
کیفیتیں ہزار ہیں اس کام جاں کے بیچ
مرنے پہ جان دیتے ہیں وارفتگانِ عشق
چمکی ہے جب سے برق سحر گلستاں کی اُور
آنکھیں سی کھل ہی جائیں گی جو مر گیا کوئی
اس باعثِ حیات سے کیا کیا ہیں خواہشیں
وہ سخت باز داؤ میں آتا نہیں ہے ہائے
بندگی ہے خدمت عالی میں ہم کو دیر سے
رہ جاؤں چپ نہ کیونکہ برا جی میں مان کر
کہتے ہیں چلتے وقت ملاقات ہے ضرور

قیامت جی کو ہے دیدار کو ٹک عام کر دیجے اب
کوفت گزرے ہے فراق یار میں جی پر بہت
یوں تو ہوئی تھیں یاد میں بیماریاں بہت
ان لگی کو جس میں ہم نے کھلائے ہیں تیر بہت
خجلی عاشق کی نہیں عشق کے اظہار کے بیچ
کچھ تعب کھینچے کو تاب تو ہو جان کے بیچ
جان ہے ورنہ کب اس کے کسو بیمار کے بیچ
جی لیے ان نے ہزاروں کے یونہی پیار کے بیچ
جی ہی دینا پڑے ہے عشق کے اقرار کے بیچ
دیدنی ہے دردمندوں کے بھی مر جانے کی طرح
ڈھونڈ کر اک کاڑھتے اب اس کے بھی پانے کی طرح
کچھ اور ہو گئے جو کسو خستہ جاں کی طرح
غم کوئی کھاتا ہے میری جان غم کھانے کی طرح
تجھے تو تام سے اس خستہ جاں کے ننگ ہے شوخ
ہم عصر کے علامہ تھے پر کچھ نہ رہا یاد
اس مخترع جور کو کیا کیا ہے ادا یاد
میں جی سے اپنے گزرا سو بار تیری خاطر
دی جان میرؔ جی نے ناچار تیری خاطر
دیتے ہیں لوگ جان تو ایک ایک آن پر
ہے میرؔ رسم و راہ دیار دفا کچھ اور
جی لگ رہا ہے خار و خسِ آشیاں کی اُور
دیکھا نہ کر غضب سے کسو خستہ جاں کی اُور
پر دم بخود ہی رہتے ہیں ہم جی کو مار کر
کس طور جی کو ہم نہ لگا بیٹھیں ہار کر
کر رکھی ہے جان اپنی ہم نے حضرت پر نثار
آؤ بھلا کبھو تو سو جاؤ زبان کر
جاتے ہیں ہم بھی جان سے ٹک دیکھ آن کر

آیا نہ چل کے یاں تئیں وہ باعثِ حیات
تم تیغ جور کھینچ کے کیا سوچ میں گئے
اب تنگ ہوں بہت میں مت اور دشمنی کر
جب تک شگفتہ تھے کچھ اتنا نہ جی رکے تھا
کیا رہروانِ راہِ محبت ہیں طرفہ لوگ
کیا کیا نہ لوگ کھیلتے جاتے ہیں جان پر
طاقت نہیں ہے جان میں کڑھنا تعب ہے اور
آہمنشیں کسو کے مت عشق کی ہوس کر
جی رک گیا کہیں بھی تو ہووے گا اندھیرا
یکایک یوں نہیں ہو جاتے پیارے جان کے لاگو
کیا جلنے وہ کہ گزری ہے یاروں کے جی پہ کیا
سو بار ایک دم میں گیا ڈوب ڈوب جی
جان تو آخر جانے والی تھی
دیکھیں تو تیغ اس کی اب کس کے سر چڑھے ہے
داغ ہو کر جان دی اس نے تمہارے واسطے
جی جل گیا تقرب اغیار دیکھ کر
دیکھی ہے جب سے اس بتِ کافر کی شکل میرؔ
کیا کہوں تم سے میں کہ کیا ہے عشق
حق تو سب کچھ تھا ہی ناحق جان دی کس واسطے
ملنے میں میرؔ گاہے ملک تن دیا نہ اس نے
کیا سہل ہاتھ جی سے اٹھا بیٹھتے ہیں ہائے
مجنوں و کوہکن نہ تلف عشق میں ہوئے
کیونکر کہیں کہ شہرِ وفا میں جنوں نہیں
کب لگ سکے ہے عشق جہاں سوز کو ہوس
جان دی یاروں نے تب آنکھیں کھلیں
مر تو نہیں گیا میں پر جی ہی جانتا ہے
عشق ہے اے طبیب جی کا روگ

مارا ہے ان نے جان سے ہم کو تو جان کر
مرنا ہی اپنا جی میں ہم آئے ہیں ٹھان کر
لاگو ہو میرے جی کا اتنی ہی دوستی کر
پچھتانے ہم نہایت سینے کے چاک سی کر
اغماض کرتے جاتے ہیں جی کے زیان پر
اطفالِ شہر لائے ہیں آفت جہان پر
بے لطفیاں کرو ہو یہ تس پر غضب ہے اور
جاتی ہیں یونہی نادان جانیں ترس ترس کر
مت چھیڑ ابر مجھ کو یونہی برس برس کر
کبھو آدم سے ہو ہی جاتی ہے تقصیر بھی آخر
مطلق کسو سے اس کا نہیں دل لگا ہنوز
پہ بحرِ غم کی پائی نہ کچھ انتہا ہنوز
اس پہ کی ہوتی میں نثار اے کاش
دیکھتے ہیں یار جی میں اس کی جفا کی خواہش
مشتِ خاکِ میرؔ پر سو تم نہ لے کر آئے شمع
ہم اس گلی میں جب گئے تب واں سے لائے داغ
جاتا نہیں ہے جی تنک اسلام کی طرف
جان کا روگ ہے بلا ہے عشق
حوصلے سے بات کرتا کاش کے منصور ٹک
حاضر رہا ہوں میں تو اپنی طرف سے جان تک
یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ
مرنے پہ جی ہی دیتے ہیں اس خانداں کے لوگ
اس خصمِ جاں کے سایے دوانے ہیں یاں کے لوگ
ماہی کی زیست آب سمندر کا جی ہے آگ
کن نے پایا آہ یاں آرام سہل
گزرے ہے شاق مجھ پر جیسی جدائیے دل
لطف کر ہے جو کچھ دوا معلوم

تو لاگو نہ ہو جی کا تو ناچار ہے ورنہ
تربت سے ہماری نہ اٹھی گرد بھی اے میرؔ
گذرے ہے جی میں گہ وہ دہن گاہ وہ کمر
مطلق جہاں میں رہنے کو جی چاہتا نہیں
جی ہی نکل گیا جو گیا یار پاس سے
لب کی ہمت صرف کر جو اس سے جی اپنا ٹھہرا
کوئی ہم سا بھی اپنی جان کا دشمن کہیں ہوگا
کچھ روبرو ہوئے پر جو سیکھے تو سیکھے میرؔ
بردباری ہی میں کچھ قدر ہے گو جی ہو فنا
تھا سب کو دعویٰ عشق کا لیکن نہ ٹھہرا کوئی بھی
جی جن نے دیکھا تھا اسے بیخود ہوا جیتا بھی پھر
نہیں جی سنبھالتا ہوں وہ ہنس کے ٹالتا ہے
شہر میں تو موسم گل میں نہیں لگتا ہے جی
ہجر کی کوفت جو کھینچیں ہیں انہی سے پوچھو
عشق کے شہر کی بھی رسم کہے ہیں گھٹتے ہم
جی اگر زلفوں کے سودے میں تیرے ہوں تو نہ لول
ہے عشق ہی سے چار طرف بحث و گفتگو
تک دل کی بیقراری سے جاتے ہیں جی بہلے
پروا اسے ہو کاہے کو ناکام گر مروں
کہتے ہیں جی ہیں جو کہ ٹھانے ہیں
گو جان کر تجھے سب تعبیر کر رہے ہیں
گو راہِ عشق میں ہو شمشیر کے دم اوپر
یوں قیدیوں سے کب تئیں ہم تنگ تر رہیں
وعدہ تو جب ہو صبح کا تب ہم بھی جاں بلب
کیا کہیے آہ جی کو قیامت ہے انتظار
دم زدن مصلحت وقت نہیں اے ہمدم
ہم سے ناکس تو بہت پھرتے ہیں جی دیتے ولے

اس جنسِ گرانمایہ سے گزرے نہیں کب ہم
جی سے گئے پر نہ کیا ترک ادب ہم
کیا جانیں لوگ رکھتے ہیں کیا کیا خیال ہم
اب تم بغیر اتنے ہوئے ہیں وبال ہم
جسمِ ضعیف و زار میں اب میرے جاں نہیں
پھر دعا ہے میرؔ مت کر لو اگر ایسا کروں
بھری مجلس میں بیٹھے عشق کا اقرار کرتے ہیں
جی کے الجھنے کا اسے کیا ماجرا لکھوں
عود پھر لکڑی ہے ڈوبے نہ اگر پانی میں
دانستہ اپنی جان سے دل کو اٹھایا ایک میں
پھر میرؔ جیتے جی بخود ہرگز نہ آیا ایک میں
یاں مشکلیں ہیں ایسی واں یہ مسائلے ہیں
یا گریباں کوہ کا یا دامنِ صحرا ہو میاں
دل دیے جاتے ہیں جی اپنے لیے جاتے ہیں
درد جانکاہ جو ہو اس کو دوا کہتے ہیں
پہلی قیمت کے تئیں مشک بہا کہتے ہیں
شور اس بلائے جاں کا جہاں میں کہاں نہیں
ہر دم تپش سر لیے مرے جگر کے تئیں
اس کام جاں کو مجھ سے تو کچھ کام بھی نہیں
خوبرو کس کی بات مانے ہیں
ہم لوگ تیرے اوپر سو جی سے مر رہے ہیں
وسواس کیا ہے ہم تو جی سے گزر رہے ہیں
جی چاہتا ہے جا کے کسو اور مر رہیں
جیسے چراغِ آخرِ شب تا سحر رہیں
آتا نہ کاش وعدۂ دیدار درمیاں
جی میں کیا کیا ہے مرے پر لب اظہار نہیں
زخمِ تیغ اس کے اٹھانے کا سزاوار کہاں

گھبرانے لگتیاں ہیں اک اک کے تن میں جانیں
اب آتے ہو تو آؤ ہر لحظہ جو گھٹے ہے

اس تن پہ نثار کرتے لیکن
مجھ سے کتنے جان سے جاتے رہے

جان کوئی کیوں نہ دو اس بے مروت کے لیے
ہونا پڑے ہے دشمن ہر آن اپنی جاں کا

چاہیے ہے اور کچھ عاشق کو کیا
مے ملک لب کہ اس نے مار ڈالا

برسوں میں کبھو ایدھر تم ناز سے آتے ہو
جی میں تو ہے دیکھئے آوارہ میرؔ کو

جی چاہتا ہے عیش کریں ایک رات ہم
دشمن ہیں اپنے جی کے تمہارے لیے ہوئے

مارے گئے سو گزرے جی پھر بھر آتے ہیں کیا
ہر چند ساتھ جان کے ہے میرؔ عشق لیک

جی تلک تو منہ نہ موڑیں تجھ سے ہم
لوہو پینا جلن کھانا دیکھنے

وصل اس کا خدا نصیب کرے
کیا کہئے جانیں کیونکہ بے پردہ جاتیاں ہیں

آدے کہنے میں رہا ہو غم سے اپنا حال کچھ
ماہ سے ماہی تلک اس حال میں ہیں مبتلا

آگ سی پھکتی ہی دن رات رہا کی تن میں
جی گیا اس کے نیر کے ہمراہ

تھی تاب جی میں تب تئیں رنج و تعب کھنچے
عشق میں ذلت ہوئی خفت ہوئی تہمت ہوئی

ہم نے تو عاشقی میں کھویا ہے جان کو بھی
رندھنے نے جی کے خاک میں ہم کو ملا دیا

کی شستشو بدن کی جس دن بہت ہی ان نے
کرتے ہیں جو وفائیں ان ہی کے حوصلے ہیں

پھر لطف کیا جو آکر آدھا بھی تم نہ پاؤ
اپنی ہی نظر میں ٹھہرے جل تو

کس کی میت کے گیا ہمراہ تو
آشنا ہوتا نہیں وہ دوستی دشمن کبھو

کوچے میں دوستی کے ہر کوئی آ تو دیکھو
جان کا خواہاں اگر محبوب ہو

کہیے کچھ کوئی جو جی کی اماں ہو
پھر برسوں تئیں پیارے جی سے نہیں جاتے ہو

لیکن خدا ہی جانے وہ گھر میں ہو نہ ہو
تو ہووے چاندنی ہو گلابی شراب ہو

تم بھی حقوق دوستی کے کچھ ادا کرو
آیندہ میرؔ صاحب دل مت کہیں لگاؤ

اس دردِ لادوا کی کچھ تو دوا کرو
کر جفا و جور خاطر خواہ تُو

کیا مزاج عشق میں مرغوب ہو
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

اس معنی کا بھی ہوگا اظہار رفتہ رفتہ
جاں بلب رہتے ہیں پر کہتے نہیں ہیں حال کچھ

کیا بلائے جان ہے میرا تمہارا حال کچھ
جان غمناک تیرے غم میں جلا کیا کیا کی

تھی تواضع ضرور مہماں کی
وہ جسم اب نہیں ہے وہ قدرت نہیں رہی

آخر آخر جان دی یاروں نے یہ صحبت ہوئی
صدقے ہیں میرؔ جی کے وے ڈھونڈتے ہیں وارے

گویا کہ آسمان بہت آ گیا درے
دھوئے تھے ہاتھ میں نے اس دن ہی اپنی جاں سے

تم چھیڑتے ہو بزم میں مجھ کو تو ہنسی سے
پر مجھ پہ جو ہو جائے ہے پوچھو مرے جی سے

چھوڑ جانا جاں بلب ہم کو کہاں کا ہے سلوک
گھر کے گھر یاں بیٹھے جاتے ہیں تم اٹھ کر گھر چلے

ہر قدم پر جی سے جانا ہر دم اوپر بے دمی
لحظہ لحظہ آگے تھے کیا کیا قیامت مر چلے

نایاب اس گہر کی ہے کیا تلاش آساں
جی ڈوبتا ہے اس کا جو تہ سے آشنا ہے

اب تو ہم جو چلتے ہیں ٹک تیرے ابرو خم ہوتے
کیا کیا رنج اٹھائے تھے جب جی میں طاقت رکھے تھے

سنتے تھے کہ جاتی ہے تر سے دیکھنے سے جاں
اب جان چلی جاتی ہے ہم دیکھتے ہیں ہائے

مایوس نہ کس طور جہاں سے رہیں ہم میرؔ
اب تاب بہت جان میں کم دیکھتے ہیں ہائے

جی نہیں رہتا ہے ٹک ناچار ہم کو اس کی اور
گرتے پڑتے ضعف میں بھی روز جایا چاہیے

گرچہ رزدی رنگ کی بھی ہجر ہی سے ہے ولے
منہ مرا دیکھو ہو کیا یہ کوفت جی پر دیکھیے

آتے ہو جب جان یاں آنکھوں میں آ رہتی ہے آہ
دیکھیے ہم کو تو یوں بیمار و مضطر دیکھیے

سر مار مار بیٹھے تلف جی ہو کب تک
ٹک اٹھ کے اب نصیبوں کو بھی آزمائیے

آ گئے ہیں تنگ جاں سے قیدِ حیات میں
اس بند سے ہمارے تئیں اب چھڑائیے

جی ہی کھپ جاتا ہے طنز آمیز ایسے لطف سے
ہنس کے جب کہتا ہے سب میں آئیے جی آئیے

حالانکہ خصمِ جان ہیں پر دیکھیے جو خوب
ہیں آرزو دلوں کی بھی یہ مدعا ہیں سیے

ہے جی ہی لاگ کچھ اور اے فاختہ وگرنہ
دیکھے نہ کوئی سروِ چمن اس جواں سا ہے

وہ سیم تن جو ننگا تو لطفِ تن پہ اس کے
سو جی کیے تھے صدقے اک جان و مال کیا ہے

جانے میں قتل گہ سے ترا اختیار ہے
پر جانیں جو گئی ہیں سو وہ رہ پُر غبار ہے

رہتے رہتے منتظر آنکھوں میں جی آیا نداں
دم غنیمت جان اب مہلت کوئی دم اور ہے

جی تو جانے کا ہمیں اندوہ ہی ہے لیک میرؔ
حشر کو اٹھنا پڑے گا پھر، یہ اک غم اور ہے

شوق وصال ہی میں جی کھپ گیا ہمارا
یا آنکہ ایک دم وہ ہم سے جدا نہیں ہے

سرکا ہے جب وہ برقع تب آپ سے گئے ہیں
منہ کھولنے سے اس کے اب جی کھپا کرے ہے

کیا جانے کیا تمنا رکھتے ہیں یار سے ہم
اندوہ ایک جی کو اکثر رہا کرے ہے

بنتی ہے سامنے اس کے کیے سجدہ ولے
جی سمجھتا ہے جو اس بت سے ادا نکلے ہے

دل تڑپتا تھا نہایت جان دے تسکین کی
بارے اپنی ایسی مشکل کی بھی آسانی ہوئی

دل تو اس زلف میں جی کا کل پیچاں میں میرؔ
جا بھی نکلے اس کنے تو ہم پریشاں سے گئے

اب ہم فقیر جی سے دل کو اٹھا کے بیٹھے
اس خصمِ جاں کے در پر تکیہ بنا کے بیٹھے

یہ قیامت اور جی پر کل گئی پائیز میں
دل خس و خاشاکِ گلشن سے لگایا چاہیے

طپش سے رات کی جس توں کی جی سنبھالا ہے
دل داغ کب نہ دیکھا جی بار کب نہ پایا
تڑپا ہے ایسا ایسا جو غش رہا ہے مجھ کو
جان کے ساتھ ہی آخر مرضِ عشق گیا
وہ جو پھرتا ہے مجھ سے دور ہی دور
اب گردِ سر پھرِدں ہوں تے ہوں فقیر محض
کی اس طبیب جاں نے تجویز مرگِ عاشق
جی رشک سے گئے ادھر کو صبا چلی
صحبت ہے پردیسی ہی اسے جان کی آسائش
یار بن تلخ زندگانی تھی
عاشقی جی ہی لے گئی آخر
کیا کفِ دست ایک میدان تھا بیاباں عشق کا
چاہ کر اس بے وفا کو آخر اپنی جان دی
تجھ کنے بیٹھے گھٹا جاتا ہے جی
یوں تو مردے سے پڑے رہتے ہیں ہم
ہائے اس کے شربتی لب سے جدا
اب کی اس کی راہ میں جو ہو سو ہو
کیا کہیں تم سے کہ اس شعلہ بغیر
عشق آدم میں نہیں کچھ چھوڑتا
اٹھ چلے پر اس کے غش کرتے ہیں ہم
آ نہیں پھرتا وہ مرتے وقت بھی
دیکھتے تھے کیا کیا بنائیں پیشتر
آسماں شاید وے کچھ ہم گیا
کاش کے برقع رہے اس رخ پہ میرؔ
جی میں وہ طاقت کہاں جو ہجر میں سنبھلے ہیں
جی کو بجا رکھیں گے تو جانیں گے عشق میں
گردش ہوں ہر قدم پہ میں ڈہا جاتا ہے جی ہر دم

نہیں ہے دل، کوئی دشمن بغل میں پالا ہے
کیا کیا نہالِ خواہش پھولا پھلا کیا ہے
دل اک بغل میں جی کا دشمن پلا کیا ہے
جی بھلا ٹک نہ ہوا ہم نے دوا کیا کیا کی
ہے یہ تقریب جی کے جانے کی
رکھتا تھا ایک جان سو تجھ پر نثار کی
آزار کے مناسب تدبیر کیا نکالی
کہیے کہ آج صبح عجب کچھ ہوا چلی
ساتھ آن کے سونا بھی پھر منہ کو چھپانا بھی
دوستی دشمنِ جانی تھی
یہ بلا کوئی ناگہانی تھی
جان سے جب اس میں گزرے تب ہمیں راحت ہوئی
دوستی اس کی ہماری دشمنِ جانی ہوئی
کاہشیں کیا کیا اٹھا جاتا ہے جی
پر وہ آتا ہے تو آ جاتا ہے جی
کیا بتاشا سا گھلا جاتا ہے جی
یاد بھی آتا ہے یا جاتا ہے جی
جی ہمارا کچھ جلا جاتا ہے جی
ہوتے ہوتے کوئی کھا جاتا ہے جی
یعنی ساتھ اس کے چلا جاتا ہے جی
حیف ہے اس میں رہا جاتا ہے جی
سو تو اب آپ ہی ڈہا جاتا ہے جی
رات سے کیا کیا رکا جاتا ہے جی
منہ کھلے اس کے چھپا جاتا ہے جی
اب ٹھہرتے ہی نہیں ہیں پاؤں ٹک سر کے تمے
ہر چند میرؔ صاحب قبلہ ہیں منگرے
پہنچتا ہوں کبھو در پر ترے سو اس خرابی سے

کعبے میں جاں بلب ہے ہم دوریٔ بتاں سے
تصویر کے سے طائر خاموش رہتے ہیں ہم
نکلا جو کوئی واں سے تو پھر مرکے ہی نکلا
سرگرم جلوہ بدر ہو ہرچند شب کو لیک
یاں تک آنے میں جتنا کمث کرتے ہو کرو
آہ کیا سہل گذر جاتے ہیں جی سے عاشق
خاک سے چرخ تلک اب تو رکا جاتا ہے
تلخ اب تو اپنے جی کو بھی لگتی ہے بات وُوں
ناتوانی سے اگر مجھ میں نہیں ہے جی، تو کیا
کیونکہ نہ چپکے چپکے یوں جان سے گزرئیے
جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی
عاشق کو مرگئے ہی بنتی ہے عاشقی میں
جی میں بگڑ رہا ہے تب میرؔ چپ ہے بیٹھا
دوری میں اس کی گور کنارے ہم آرہے
کل کہتے ہیں اس بستی میں میرؔ جی مشتاقانہ مُوئے
مجنوں و کوہکن کو آزار ایسے ہی تھے
جی ڈوب گئے اپنے اندوہ کے دریا میں
اس قدر جی میں ہے دغا اس کے
جی دئے بن وہ دُرِ مقصود کب پایا گیا
ہم نہ کہتے تھے رہے گا ہم میں کیا جاں سے گئے
شوق ہم کو کھپائے جاتا ہے
وہ کھلے بال سوئے ہے شاید
دور اگرچہ گیا ہوں مَیں جی سے
وہ اگر چت چڑھا رہا ایسا
جی نہیں میرؔ میں نہ بولو تند
زیرِ فلک رکا ہے اب جی بہت ہمارا
واشد ہوئی نہ بلبل اپنی بہار میں بھی

آئے ہیں پھر کے یارو اب کی خدا کے ہاں سے
جی کچھ اچٹ گیا ہے اب نالہ و فغاں سے
اس کوچے سے جلتے ہوئے دیکھا کیے جی سے
کب جی لگے ہیں اپنے کسو ناتمام سے
اب تو جانا جان سے ناچار ہم ٹھہرا چکے
ڈھب کوئی سیکھے ان لوگوں سے مرجانے کے
ڈول اچھے نہیں کچھ جان کے گھبرانے کے
جیسے کسو کے زخم پہ تیر اک دو آ لگے
عشق جو چاہے تو مُردوں سے بھی اپنا کام لے
کہئے کتھا جو اس سے باتوں کی راہ نکلے
ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے
کیا جان جس کی خاطر شرمندگی اٹھاوے
چھیڑو ابھی تو کیا کیا باتیں بنا کے لاوے
جی رات دن جنھوں کے کھنچیں ان ہیں کیا ہے
تجھ سے کیا ہی جان کے دشمن وے بھی محبت رکھتے تھے
یہ جان سے گئے سب بیمار ایسے ہی تھے
وے جوش کہاں اب ہم مدت ہوئی وہ بیٹھے
کہ دُعا کرئیے تو دغا سمجھے
بے جگر تھے میرؔ صاحب جان کھوتے رہ گئے
سو ہی بات آئی لے اٹھے اس پاس سے جاں سے گئے
جان کو کوئی کھائے جاتا ہے
رات کو جی مرا بکھر جا ہے
کب وطن میرے یہ خبر جا ہے
آج کل جی سے مہر اتر جا ہے
بات کہتے ابھی وہ مر جا ہے
اس بے فضا قفس میں مطلق ہوا نہیں ہے
کیا جانیے کہ جی میں یہ کیسی گھمڑی ہے

جس مرض میں کہ جان جاتی ہے
دلبروں ہی کی وہ جدائی ہے

دانستہ اپنے جی پہ کیوں تو جفا کرے ہے
اتنا بھی میرے پیارے کوئی کڑھا کرے ہے

حالت میں غش کے کس کو خط لکھنے کی ہے فرصت
اب جب نہ تب ادھر کو جی ہی چلا کرے ہے

تپش سے رنگ اڑ جاوے قلق سے جان گھبراوے
دیا ہے دل الٰہی ہم کو یا کوئی بلا دی ہے

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے
ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے

دل پریشاں ہوں میں تو خوش وے لوگ
عشق میں جن کے جی ٹھکانے ہیں

کچھ بے سبب نہیں ہے خاطر مری پریشاں
دل کا الم جدا ہے غم جان کا جدا ہے

دیوان سوم

خاک وخوں میں لوٹ کر رہ جانے ہی کا لطف ہے
جان کو کیا سلامت نیم جاں میں لے گیا

ہم تو سو سو بار مرتے رہتے ہیں اک آن میں
عشق میں ایسے گزرنا جان سے مشکل ہے کیا

عمر آوارگی میں سب گزری
کچھ ٹھکانا نہیں دل و جاں کا

جی آنکھوں میں آیا ہے جگر منہ تئیں میرے
کیا فائدہ یاں جل کر اگر یار اب پایا

کیا کام کیا ہم نے دل یوں نہ لگانا تھا
اس جان کو جوکھوں کو اس وقت نہ جانا تھا

لوگ دل دیتے سُنے تھے میرؔ دے گزرا ہے جی
لیک اپنے طور ان نے بھی تو اک سودا کیا

جی رہے ڈوبتے دریائے غم عشق میں لیک
بوالہوس کی سی طرح ہم نے کنارا نہ کیا

ہم رہ چکے جو ایسے ہی غم میں کھپا گئے
معلوم جی کی چال سے ہوتا ہے، جائے گا

رات سے آنسو مری آنکھوں میں پھر آنے لگا
یک رمق جی تھا بدن میں سو بھی گھبرانے لگا

میں منتظر جواب کا نامے کے مر گیا
ناچار میرؔ جان کو اودھر رواں کیا

جب جی سے گزر گئے ہم میرؔ
اس کوچے میں تب ہوا گزارا

اب کیا کریں کہ آیا آنکھوں میں جی ہمارا
افسوس پہلے ہم نے ٹک سوچ کر نہ دیکھا

جی کو جنجال دل کو ہے الجھاؤ
یار کے حلقہ حلقہ بالوں کا

دیکھوں میں اپنی رات کو خونناب تھا سوتھا
جی دل کے اضطراب سے بیتاب تھا سوتھا

یہ جانتا تو اس سے ہم خواب میں نہ ہوتا
ایکا خیال جی کا ایسا خیال اس کا

نیم جاں صدقے کی اس پر نہ نیاں دیکھا نہ سُو د
ہم تو کچھ دوستی میں وارے کا سارا نہ کیا

جب تو نے نظر پھیری تب جان گئی اس کی
مرنا تیرے عاشق کا مرنا کہ بہانا تھا

سہل ایسا نہ تھا آخر جی سے مرا جانا تھا
ٹک رنجہ قدم کر کر مجھ تک اسے آنا تھا

یاد خط میں اس کے جی پھر آگئے گھبراتا رہا
دوں کس کو دوش دشمنِ جانی تھی دوستی
بے تاب تہ تیغِ ستم دیر رہا میں
دن جی کے الجھنے ہی کے جھگڑے میں کٹے ہے
طاقت تعب کی غم میں تمہارے نہیں ہے اب
کل کچھ صبا ہوئی تھی پر افشاں قفس میں بھی
کوشش اپنی تھی عبث پر کی بہت
سب حوزے محو دعائے جان ہیں
جی ہی ہٹے نہ میر تو اس کو کیا کروں میں
گرمی سے گفتگو کی کرتے قیاس جاں پر
سے بے خبری مجھ کو ترے دیکھے سے ساقی
جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اس کے
کر باغباں حیا کچھ گل کو نہ ہاتھ میں مل
دل جلا آنکھیں جلیں جی جل گیا
دل لگا ہو تو جی جہاں سے اُٹھا
وصل و جدائی سے ہے مبرّا وہ کام جاں
اب کی ہزار رنگ گلستاں میں آئے گل
ہوا ہوگا خالی بدن جاں سے جب
اٹک شتاب جاتے ہیں ورنہ جہاں سے ہم
ہر بات کے جواب میں گالی کہاں تلک
جی کے تئیں چھپاتے نہیں یوں تو غم سے ہم
جی جائے کسو کا کہ رہے تم کو قسم ہے
عشق کا محو دست شیریں ہوں
ہونے یہ چاہ میں مشکل کہ جی گیا ہوتا
کھا گیا اندوہ مجھ کو دوستان رفتہ کا
جائیں تو جائیں کہاں جو گھر رہیں کیا گھر رہیں
عشق نے خوار و ذلیل کیا ہم سر کو بکھیرے پھرتے ہیں

رات کا بھی کیا ہی منہ آیا تھا پر جاتا رہا
اس سودے میں صریح ہیں نقصانِ جاں کیا
جب تک نہ گئی جان مجھے صبر نہ آیا
رات اس کے خیالات سے رہتے ہیں قضایا
گویا کہ جان جسم میں سارے نہیں ہے اب
وہ بے کلی تو جان کو یارے نہیں ہے اب
کیا کریں ہم چاہتا تھا جی بہت
آرزو اپنی بھی ہے تو جی بہت
ہر چند بیٹھتا ہوں مجلس میں اس سے ہٹ ہٹ
شعلہ ہے شمع ساں یاں ہر یک سخن زباں پر
ہر لحظہ میری جان مجھے میری خبر کر
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر
دیتی ہے جان بلبل پھولوں کے رنگ و بو پر
عشق نے کیا کیا ہمیں دکھلائے داغ
موت کا نام پیار کا ہے عشق
معلوم کچھ ہوا نہ ہمیں یاں سوائے شوق
پر اس بغیر اپنے تو جی کو نہ بھائے گل
سچلے ہیں گے یہ راہ جو بھر قدم
کچھ ہو رہے ہیں غم میں ترے نیم جاں سے ہم
اب جاں بلب ہوئے ہیں تمہاری زباں سے ہم
پر تنگ آگئے ہیں تمہارے ستم سے ہم
مقدور تلک درپئے آزار رہو تم
جان کا بھی نہیں ہراس کہیں
نہ رہتے اگر جیتے ہم مسالہ نہ کریں
ڈھونڈتا ہے جی بہت پر اب انھیں پاؤں کہاں
یار بن لگتا نہیں جی کاش کے ہم مر رہیں
سوز و درد و داغ و الم سب جی کو گھیرے رہتے ہیں

بے دماغی بے قراری بے کسی بے طاقتی
ہوا تن ضعف سے ایسے کہے تو
تیغ کی نوبت کب پہنچے ہے اپنے جی کے غارت میں
نکل آتا ہے گھر سے ہر گھڑی ننگے بلن باہر
بازارِ وفا میں سرِ سودا تھا سبھوں کو
رہتا ہوں سدا مرنے کے نزدیک ہی اب میر
تن میں جب تک ہے جاں تکلف ہے
جہاں ہو تیغ بکف کوئی سادہ جا لگتا
بلائے جان ہے وہ لڑکا پری زاد
کہوں ہوں میر سے دل دے کہیں تا جی لگے تیرا
کوچہ ہر یک جائے دلکش عالم خاکی میں ہے
گل پھول سے بھی اپنے دل تو نہیں لگتے ٹک
دل ہی اپنا نہیں فقط بے چین
کیا کہوں منہ تک جگر آتا ہے جب رکتا ہے دل
ہو کے عاشق ترے جان و دل و دیں کھو بیٹھے
دیکھیں تو میر کیا ہو بے طاقتی سے حالت
جائے ہے جی نجات کے غم میں
اس بحرِ حسن پاس نہ خنجر تھا کل نہ تیغ
رہے کس کو ساتسی کہ اب ضعف سے
چلا یار کی اُور جاتا ہے جی
لاگ ہے جی کے تئیں اپنے اسی یار سے ایک
مدت ہوئی کہ کوئی نہ آیا ادھر سے یاں
تا چند وہ ستم کرے ہم در گزر کریں
قتل کیے پر غصہ کیا ہے لاش مری اٹھوانے دو
ضعف بہت ہے میر تمہیں کچھ اس کی گلی میں مت جاؤ
جی جائے ہے جو اپنے یہ ہوتی ہے مار مار
آپ تو اپنے بنے اب کہ جلے جی سب کا

کیا جیئے وہ جس کے جی کو روگ یہ اکثر رہیں
کہ اب جی ہی نہیں اس ناتواں میں
عاشق زار کو مار رکھے ہے اک ابرو کی اشارت میں
بٹھا یہ آپڑا ہے عیب اس آسائشِ جاں میں
پر بیچ کے جی ایک خریدار ہوا میں
اس جان کے دشمن سے بھلا یار ہوا میں
ہم میں اس میں ابھی حجاب ہے میاں
اب اپنی جان کا کچھ احتیاط مجھ کو نہیں
اسی کا شور ہے پیر و جواں میں
جو ہو نقصانِ جاں اس کا تو کیونکر پھر مناؤں میں
پر کہیں لگتا نہیں جی ہائے میں دل دھوں کہاں
جی لوگوں کے بے جاناں کس طور بہلتے ہیں
جی کو بھی روز اضطراب ہے یاں
جان میری تن میں کیسی کیسی گھبراتی ہے میاں
جیسا کرتا ہے کوئی ویسا ہی پاتا ہے میاں
اب تو بدیر جائیں اپنی سنبھلتیاں ہیں
ایسی جنت گئی جہنم میں
میں جان دی ہے حسرتِ بوس و کنار میں
مرا جی بھی کرنے لگا سائیں سائیں
جو ہو اختیاری تو ادھر نہ جائیں
اور سب یاروں کا ہم لوگ تو سب کرتے ہیں
جاتی رہے گی جان اسی رہگزر سے یاں
اب جی میں ہے کہ شہر سے اس کے سفر کریں
جان سے ہم بھی جاتے رہے ہیں تم بھی آؤ جانے دو
صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو
جاتے ہیں اس گلی میں کہاں ہم مگر کبھو
ہم کو کہتے ہیں کہ تم جی کے تئیں مار رہو

عشق میں کیا دخل ہے نازک مزاجی کے تئیں
اس کی تلوار سے گم جان کو رکھتے نہ عزیز
غریب شہر خوباں ہوں مرا کچھ حال مت پوچھو
لگا جی اس کی زلفوں سے. بہت ہم میر پچھتائے
تدبیر کو مزاج محبت میں دخل کیا
سر پہ عاشق کے نہ یہ روز سیہ لایا کرد
شوق سے دیدار کے بھی آنکھوں میں کھنچ آیا جی
پایا گیا وہ گوہر نایاب سہل کب
ایسی جان کس ہے ہم میں رنج نہ دینا صاحبوں کو
کوئی بھی اس طرح سے اپنے جی پر کھیل جاتا ہے
ہے تمنائے وصال اس کی مری جان کے ساتھ
موتن پہ ہم نہ سوختہ جانوں کی ہے نمود
سودائے عاشقی میں تو جی کا زیاں ہے
جلا جی بہت قصۂ میر سن کر
کس طرح تڑپے ہے کیا کیا جی گھٹا جاتا ہے جائے
بیخودی سے جی چلا جاتا ہے ہوں صاحب فراش
کہتے تو ہیں کہ ہم کو اس کی طلب نہیں کچھ
خانہ خراب ہوں خواہش دل کا آہ نہایت اس کو نہیں
وصل اس طبیب زادے کا جی چاہتا رہا
گیا اس ترک کی آمد کو سن جی
یہ طرحدار لڑکے دیں بیٹھنے تب اس کو
سنگ واشد ہوئی دل کو نہ جی کی لاگ کچھ پائی
مرگ کے حل جدائی میں جئیں یوں کب تک
سوز دروں نے آخر جی ہی کھپا دیا ہے
دیکھئے کیا ہو سانجھ تلک احوال ہمارا ابتر ہے
خواہش بہت جو ہو تو کاہش ہے جان و دل کی
دل اور جگر یہ تو جلے آتش غم میں

کوہکن کے طور سے جی توڑ کر محنت کرد
مرتے اس خواری سے توحید حرم کا ہے کو
ہوا جی زلف و کاکل کے لیے جنجال مت پوچھو
ہوا ہے مدعی ایک ایک اپنا بل مت پوچھو
جانکاہ اس مرض کی نہ کوئی دوا کرو
جی الجھتا ہے بہت مت بال سلجھایا کرد
اس سے یہیں دیکھنے ہم کو بہت آیا کرد
نکلا ہے اس کو ڈھونڈنے تو پہلے جان کھو
ایک ہی وار میں ہو چکنے گا دوسری ضربت مت کرتیو
مگر بازیچہ سمجھے میر عشق خورد سالوں کو
جان ہی جائے گی آخر کو اس ارمان کے ساتھ
ہے سوزش دروں سے بروں دود ہر جگہ
پھرتے ہیں میر ڈھونڈتے ہی شود ہر جگہ
بلا سوز تھا اس کہانی کے ساتھ
ساتھ اس کے دل لگا ہے جس کسی کا وائے وہ
بے خبر اے کاش بالیں پر مرے آ جائے وہ
پر جی اسی کو اپنا ڈھونڈے ہے ڈھب نہیں کچھ
جان لبوں پر آئی ہے پر، تو بھی گرم طلب سی ہے
آخر اس آرزو ہی میں بیمار ہم ہوئے
تھمی ہم سے نہ اک دم بھی ادائی
جب جی سے کوئی اپنے ہر طرح دل اٹھائے
رہے وس دن جو اپنی عمر کے یاں ہم سو مہماں سے
جان بے تاب رہے دل کو اک آزار رہے
ٹھنڈا دل اب ہے ایسا جیسے بجھا دیا ہے
دل اپنا تو بجھا سا دیا ہے جان چراغ مضطر ہے
کچھ کم گراں دلوں میں اے میر چاہ کو بھی
جی کیونکہ بچاؤں کہو اس آگ کی تف سے

بے طاقتی دل سے مری جان ہے لب پر
کڑھتے ہمیشہ رہنا ہم تو بغیر اس کے
برسوں گزرے ہیں ملے کب تئیں یوں پیار ہے
اس بے مہر صنم کی خاطر سختی سی سختی کھینچے ہم
گئے ہی جی کے فیصل ہو نیاز و ناز کا جھگڑا
فراق یار کو آساں نہ سمجھو
مر گئے دم کب تلک رکتے ہیں
ہر بار دیکھے ہے تو ادھر ہی آہ شب نے
برسوں تلک جی کو مار مار رہے
نوچتے ناخن سے منہ یا چاک کرتے سب جگر
جی ہی دیتے کا نہیں کڑھنا فقط
گیا میر کے جی کی سن کر وہ شوخ
یار کا جور و ستم کام ہی کر جاتا ہے
کبھو ہو زیر لب کیا دیکھ کر ہم ناتوانوں کو
اس زلف کا ہر بال رگِ جان ہے اپنی
نکلے ہے جی کا رستہ آواز کے رکن سے
جی غش کرے ہے اب تو رفتار دیکھ اس کی
کیا چال نکالی ہے کہ جو دیکھے سو مر جائے

تم ٹھہرو کوئی دم تو مرا جی بھی ٹھہر جائے
کیا روگ دوستی نے جی کو لگا دیا ہے
دور سے دیکھ لیا اس کو تو جی مار رہے
جی پگھلے کیا اس کا ہم پر رحم کہاں وہ پتھر ہے
کہیں وہ تیغ کھینچے بھی کہ بندہ سر جھکا دیوے
کہ جان و تن کی مشکل ہے جدائی
بارے جی کے ساتھ ہی سانسے گئے
کچھ تو اثر کیا ہے جی میں بھی بارے تیرے
رات دن ہم امیدوار رہے
جی میں ہے آگے ترے کچھ دستکاری کیجیے
اس کے در سے جانے کی حسرت بھی ہے
لگا کہنے سب کو یہی راہ ہے
کتنا جی عاشق بیتاب کا مر جاتا ہے
ہماری جان میں طاقت نہیں باتیں اٹھانے کی
یاں جی ہی بکھرتا ہے صبا وہ جو بکھر جائے
آزردہ ہو نہ بلبل جاتے ہیں ہم چمن سے
دیکھیں نبھے ہے اپنی کس طور اس چلن سے
بھیچک کوئی رہ جائے کوئی جی سے گزر جائے

دیوان چہارم

کیا میں ہی جاں بلب ہوں بیماریٔ دلی سے
دل کو گل کہتے تھے درد و غم سے مرجھایا گیا
کیا تعجب ہے جو کوئی دل زدہ نکہ مرے
جل سوز آہ و نالہ سمجھتا نہیں ہوں میں
عشق کی ہے بیماری ہم کو دل اپنا سب درد ہوا
یارب ہماری جانب یہ سنگ کیوں ہے عائد
دیکھا نہ ادھر ورنہ آتا نہ نظر پھر میں

مارا ہوا ہے عالم اس درد لا دوا کا
جی کو مہماں سنتے تھے مہمان سا آیا گیا
اضطرابِ عشق میں جی تن سے گھبرایا گیا
یک شعلہ میرے جی سے اٹھا تھا جلا گیا
رنگِ بدن میت کے رنگوں بیٹھے جی ہی زرد ہوا
جی ہی سے مارتے ہیں جو نام لے وفا کا
جی مفت مر جاتا اس شوخ کا کیا جاتا

بعدِ مرگ چراغ نہ لاوے گور پہ وہ عاشق کی آہ
جان اپنا تو ہم نے مارا تھا
عشق بازی میں کیا موئے ہیں میر
طائر کی بھی رہتی ہے پھر جان چمن ہی میں
جلے ہیں مونڈھے پھٹی ہے کہیں جیسی ہے چھپی کہی
اگرچہ جہاں مَیں نے سب چھان مارا
سادگی میری نے آہ نہ جانا جی ہی اس میں جاتا ہے
وفاداری نے جی مارا ہمارا
گلہ لب تک نہ آیا میر ہرگز
عشق کیا کیا آفتیں لاتا رہا
عشق سے ہو حال جی میں کچھ تو کہیے دیکھیو
جاں بخشی اس کے ہونٹوں کی سُن آبِ زندگی
داخل دیوانگی ہی تھی ہماری عاشقی
کیا گئی جان و دل سے تاب شتاب
روز و شب کی اپنی معیشت نقل کریں کیا تم سے میر
گریہ و زاری سے روز و شب کی شکوے کچھ نہیں
کیا گذری ہے جی پہ ہمارے ہم سے تو پوچھے میر کہو
میر کھڑے اک ساعت ہی میں غش تم کر گرتے ہو
عشق کیا ہو ہم نے کہیں تو عشق ہمارا جی مارے
جان کو قید عناصر سے نہیں ہے وار ہی
نقصانِ جاں صریح تھا سودے میں عشق کے
ٹکڑے ٹکڑے کر دکھایا مَیں نے اس کو اس لیے
جلتے تو ہیں پہ خواہشِ دل موت ہے تری
میر نہ کہتے تھے ہم تجھ سے حال نہیں کچھ رہنے کا
گل سے دل کی کل بگڑی ہے جی مارا ہے کل ہو کر
اس کام جاں کے جلوؤں کائیں ہی نہیں ہلاک
آفات میں ہے مرغِ چمن گل کے شوق میں

بیچتے جی بھی داغ ہی تھا میں اس کی بے پروائی کا
کچھ ہمارا ہی اس میں وارا تھا
آ گئے ہی جی انھوں نے ہارا تھا
گل آئے جہاں بھی وہ جس آبِ رواں آیا
قیامت اس کی ہے تنگ پوشی ہمارا جی تو بہ تنگ آیا
وے اس کی نایابی نے جان مارا
عشق کا اس پہ کار کے مَیں نے لوگوں میں اصرار کیا
اسی میں ہو گا کچھ وارا ہمارا
کھپا جی ہی میں غم سارا ہمارا
آخر اب دوری میں جی جاتا رہا
ایک دن باتیں ہی کہتے کرتے سنایا گیا
ایسا چھپا کہیں کہ کہا جائے مر گیا
یعنی اس سودے میں ہم نے جان کا نقصان کیا
آنسو کتے ہیں اب شتاب شتاب
دن کو قیامت جی پہ رہے ہے سر پہ بلا لاتی ہے رات
مجھ کو رونا ہے یہ جی کو اس سے ہے الفت بہت
آنے لگی ہے درد و غم سے صاحب لب پر آہ بہت
تاب نہیں کیا ضعف ہے دل میں جی میں طاقت کیا ہے آج
یونہی نکو تو دلبر اپنا ہم سے ہوا ہے بدتر آج
تنگ آئے ہیں بہت اس چار دیواری کے بیچ
ہم جان کو نکالی ہے جی کے زیاں کی طرح
یعنی جی مارا کرد آئندہ پیادے اس طرح
پھر بھی ہمیں نظر نہیں جی کے زیان پر
چاہ بلائے جان و دل ہے آہ جانتے سے چاہ نہ کر
آج لہو آنکھوں میں آیا درد و غم سے رو رو کر
آفت عجب طرح کی ہے سارے جہان پر
جو کھوں ہزار رنگ کی رہتی ہے جان پر

چندیں ہزار جانیں گئیں اس کی راہ میں
دوستاں حسن و خوبی ہے کیا چیز
بے یار کس کا جینے کو جی چاہتا ہے میرؔ
عشق ہمارا جی لئے رہے ہم نادان ہیں کیا محفوظ
الفت سے پرہیز کیا کر کلفت اس میں قیامت ہے
جی سارے تن کا کھینچ کر آنکھوں میں آرہا ہے
بازار کی بھی جنس پہ جی دیتے ہیں عاشق
شہد لب سے اس کے چپکا جی کا حرف کچھ نہ کیا
ہوئے صید زلبوں ہم منتظر ہی خاک جی دلگیر
خستہ جانی نے تنگ خلق کیا
بن بیں چمن میں جی نہیں لگتا یار کدھر کو جاویں ہم
اک آدھ دن شنوگے ستا کے رہ گئے ہم
بستر میں مردہ سا تھا میں جان سی مجھ میں آجاتی
عشق میں گام اول اپنے جی سے گزرنا پیش آیا
میں کہا دیکھو ادھر ٹک تم تو میں بھی جان دوں
اب اپنی جان سے ہیں تنگ دل دکھا ہے بہت
اے وائے دل گئے پر جی بھی گیا ہمارا
بالوں میں اس کے دل الجھا تھا خوب ہوا جو تمام ہوا
دل تو ان میں پھنس جاتا ہے جی ڈوبے ہے دیکھ ادھر
دل جگر ہو گئے بے تاب غم عشق جہاں
جی مارا بے تابی دل نے اب کچھ اچھا ڈھنگ نہیں
شاید کہ جان و تن کی جدائی بھی ہے قریب
جی ہی جائے میرؔ جو اپنا دیر کی جانب گیا کرئیے
میرؔ ملائے جان رہے ہیں دونوں فراق و وصل اس کے
جی گیا ایک دم سرد ہی کے ساتھ اپنا
لیں ناکام رہیں گے کب تک جی میں ہے اک کام کریں
بجلی سا مرکب اس کا کڑک کر چمک گیا

ایک آدھ تو بھی مر رہے ہے نیم جاں ہنوز
ٹھہری ہے جان سی بھی شے کیا چیز
کرتے ہیں ہم ستم زدہ ناچار بود و باش
ایسی شے کا زیاں کھینچے تو دانا ہووے کیا محفوظ
یعنی درد و رنج و تعب ہے آفت جان بلا ہے عشق
کس مرتبہ میں ہم بھی ہیں دیکھنے کے شائق
سر بیچتے پھرتے ہیں گرفتار ہیں ہم لوگ
میرؔ جو دیکھا اپنے حق میں کیا زہر قاتل ہے دل
سواری سے کشور کے گوا تھے اب گرد کیا حاصل
پیرا سے مجھ سے عار ہے تا حال
واہ خرابے سے نکلی گھر کی بستی میں کیونکر جاویں ہم
کانپا کرے ہے جی سو ٹھہرا کے رہ گئے ہم
کیا ہوتا جو رنجہ قدم کر میرے سرہانے آتے تم
اس میدان میں رکھ کے قدم کیا مرلے سے ڈر جاویں ہم
ہنس کے بولے یہ تری باتیں ہیں پر دیکھیں گے ہم
ملا ہی دیں گے تری تیغ کو گلو سے ہم
یعنی کہ میرؔ برسوں پچھتا کے رہ گئے ہم
یعنی گیا جب بیچ سے جی ہی تب پھر کچھ جنجال نہیں
چاہ رنج گو چاہ نہیں ہے بال اس کے گو جال نہیں
جی بھی ہم شوق کے ماروں کو دغا دیتے ہیں
رنگ طپیدن کی شوخی سے منہ پر میرے رنگ نہیں
جی کو ہے اضطراب بہت اب فراق میں
یوں تو مزاج طرف کعبہ کے بہتیرا ہم لاتے ہیں
ہجر کی راتیں وہ بھاری تھیں ملنے کے دن یہ گھڑیاں
ہم جو خوش زمزمہ تھے اس کے گرفتاروں میں
رسوا ہو کر مارے جاویں اس کو بھی بدنام کریں
لوگوں کے سینے پھٹ گئے جانیں دھڑک گئیں

غضب ہے یہ اندازِ رفتارِ عشق
دلکشی اس بزم کی ظاہر ہے تم دیکھو تو ہو
چلتے جو اس کو دیکھا جی اپنے کھنچ گئے ہیں
دیتی ہے طول بلبل کیا سوزشِ فغاں کو
ہوا ہے مخترع بے رحم خونریزی بھی کرنے میں
عشق کے بے تاب کی آزار میں مت کر شتاب
دشمن اپنا میں تو فکر دوستی ہی میں رہا
نازکی کوئی یہ بھی ٹھسک ہے جی کاہے کو کڑھاتے ہو
غیر کی ہمراہی کی غیرت جی مارے ہے عاشق کا
جی تو جلا احباب کا مجھ پر عشق میں اس شعلے کے پر
جی رکا سکتے سے پرے کچھ تو
عہد یہ تھا کہ نہ بے وصل بدن سے جاوے
منہ کر بھی میری جانب سوتا نہیں کبھو وہ
حیرتِ طلب تو کام نہیں ہے کسو کے ساتھ
وحشت چمن میں ہم کو کل صبح بیشتر تھی
جان وجہل سے گزرا نہیں میر جن کی خاطر
شور کیا جو میں نے شبانگہ بیتابی سے دل کی بہت
ایک دم دکھلائی دیتا بھی مرتے آ کہیں
اے کاش اب نہ چھوٹے صیاد قیدیوں کو
گیا بھول جی شیب میں جو ہمارا
گرامی گہر میر جی تھا ہمارا
ہمیں ہی عشق میں جینے کا کچھ خیال نہیں
انھی کی طبع جاں لے میر مائل ہو گی سنبل کے
جو بحث جی سے وفا میں ہے سو تو حاضر ہے
کہو سو کہیے فراق اس کا تو میرے جی کو کھپا گیا ہے
تا یہ گرفتہ وا ہو کہاں لے کے جائیے
میر ستم کشتہ کی سماجت ہے مشہور زمانہ کی

چلے جائیں جی ہم تماشا کریں
لوگ جی دیتے چلے جاتے ہیں کس حیرت سے یاں
ہم اور میر یاں ہیں بے اختیار دونوں
اک نالہ حوصلے سے بس ہے وداعِ جاں کو
تم مارے جان سے جب تک نہ تشنت داد عاشق ہو
جان دیتے دیر لگتی ہی نہیں دل ریش کو
اب رکھوں کیونکر سلامت جان عشق اندیش کو
کرتے ہو تمکین سے ایسے جیسے کہیں کو جاتے ہو
پاس کبھو جو آتے ہو تو ساتھ اک تحفہ لاتے ہو
رُو ہی نہیں ہے بات کا ہرگز اپنے جانبداروں کو
آسماں ہو گیا ورے کچھ تو
سو جدا ہوتا ہے کی جی نے دعا اپنے ساتھ
کیا جانوں اس کے جی میں ہے اس طرف سے کیا کچھ
جان عزیز ابھی ہے مری آبرو کے ساتھ
بے اس کے پھول گل سے جی ایک دم لگانہ
بچ کر نکلتے ہیں وے میرے مزار سے بھی
کہنے لگا جی تنگ آیا ان مہر و فلک کے ماروں سے
شوق سے آنکھوں میں کوئی دم مرا جی ہے ابھی
جی ہی سے مارتی ہے آزادی بے پری کی
بہت یاد آئی گئی وہ جوانی
وے عشق میں قدر ہم نے نہ جانی
وگرنہ سب کے تئیں جان اپنی پیاری ہے
نہیں دیکھے جنھوں نے گیسوئے پرپیچ وخم تیرے
پہ فرطِ شوق سے مجھ کو ملال خاطر ہے
دروں میں آگ اک لگا گیا ہے بروں کو یکسر جلا گیا ہے
آتے ہیں اس کی خفگی میں تنگ جاں سے بھی
جان دیے ہی آگے سے اس کے کب وہ ظالم ٹلتا ہے

صبر کیا نہیں جاتا ہم سے ضعف بھی ہے بیتابی ہے
ہماری جان لبوں پر سے مشوئے گوش گئی
اس رفتہ کی جاں بخشی ٹک آتے ہوئے اس کے
راہ جاناں سے ہے گزر مشکل
ہے اپنی مہر ورزی جانکاہ و دلگدازاں
چاہت میرؔ سبھی کرتے ہیں رنج و تعب میں رہتے ہیں
ہو ملتفت کہ ہم بھی جیتوں میں آویں چندے
عشق ہمارے درپئے جاں ہے کیسی خصومت کرتا ہے
سخت جانی ہے نہ ٹک ہو جو خبر گھر میں اسے
میرؔ قیس و کوہکن ناچار گزرے جان سے

سہل نہیں ہے جی کا ڈہنا کیسی خانہ خرابی ہے
کہ اس کے آنے کی سن گن کچھ اب بھی یاں پاوے
رکھتے ہی قدم مجھ میں پھر جان گئی آئی
جان ہی سے مگر کوئی گزرے
اس رنج میں نہیں ہے امید بہتری کی
تم جو ابھی بے تاب ہو لیے جی سے ہاتھ اٹھاؤگے
یہ عشق بے محابا تا چند جان مارے
چین نہیں دیتا ہے ظالم جب تک عاشق مرتا ہے
صبح تک ہم رات دیواروں سے سر مارے گئے
دو جہاں حسرت لیے ہمراہ بیچارے گئے

دیوان پنجم

بجلی سا چمک گیا آنکھوں سے بھوویں پڑنے لگیں
آتا سُن ناداری سے ہم نے جی دینا ٹھہرایا ہے
عشق ہو حیوان کا یا انس ہو انسان کا
عاشق و معشوق کی میں طرفہ صحبت میرؔ کی
عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
آیا یاں سے جاتا ہے تو جی کا چھپانا کیا حاصل
رنج بہت کھینچے تھے ہم نے جی کی طاقت تمام ہوئی
اے بکھیلے یہ تھی کہاں کی ادا
جست و جو بھی اس کی کیجیے جس کا نشاں کچھ پیدا ہو
ایک نہ خواہش بر آئی تا جی کا غبار نکل جاتا
جیتے جی میت کے رنگوں لوگ مجھے اب پاتے ہیں
ہے حُسن کیا متاع کہ جس پر نظر پڑی
مفلس ہو مر گیا نہ ہوا وصل یار کا
تیری ہی رہگذر میں یہ جی جا رہا ہے شوخ
بات کہتے جی کا جانا ہو گیا

ابر نمط خنگی سے اس بن جی بھی نہ ندھا دل بھر آیا
کیا کہیے اندیشہ بڑا تھا اس کی منہ دکھلانی کا
لاگ جی کی جس سے ہو دشمن ہے اپنی جان کا
ایک جی مارے ہے مرہون ایک ہے احسان کا
جی کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا
آج گیا یا کل جاوے گا صبح گیا یا شام گیا
اپنے کیے پر یاد رہے یہ وہ بھی بہت پچھتاوے گا
کھب گئی جی میں تیری بانکی ادا
پانا اس کا میرؔ ہے مشکل جی تو یونہی کھووے گا
کاشکے آہو چشم اپنا آنکھوں کو پاؤں سے مل جاتا
جوشِ بہار عشق میں یعنی سرتا پا میں زرد ہوا
وہ جان بیچ کر ہی خریدار ہو گیا
ہجراں میں اس کے جی بھی گیا اور زر گیا
شنیو کہ میرؔ آج ہی کل میں گزر گیا
مرنا عاشق کا بہانا ہو گیا

تنگ پوشی تنگ ورزی اس کی جی میں کھب گئی
بات ہے جی مارنا بازیچہ قتلِ عام ہے
بہت کی جستجو اس کو نہ پایا
عشق صمد میں جان چلی وہ چاہت کا ارمان گیا
موسم گل کا آیا شاید داغ جنوں کے سیاہ ہوئے
ہجر نے جی مارا ہے ہمارا کیا کہیے کیا مشکل ہے
جان مسافر ہو جاوے گی لب پہ ہے موقوف آہ
دل کو اس بے مہر سے ہم نے لگایا ہے عبث
دیکھ کر اس کو کھڑے سوچی ہے ہم عاشق ہوئے
جی کے جاتے وہ جو نو خط آتا تو بابت بھی تھی
گھر آئے ہو فقیروں کے تو آؤ بیٹھو لطف کرو
آج ہمیں بدحالی سی ہے حال نہیں ہے جان ہے بیچ
کبک کی جان مسافر ہو وے دیکھے خرام ناز اس کا
غم اندوہ عشقی سے ہر لحظہ نکلتی رہتی ہے
جی بچنے کی طرح نظر آتی نہیں کوئی
سر راہ اس کے مرتے ہی اٹھیں گے
جان گویاں ہے گرم رفتن لیت لعل دل دیسی ہے
چاہ کا جو اسرار کیا تو فرط شرم سے جان گئی
گل کھائے بے نہر بلبل نے شور قیامت کا سا کیا
حالِ پریشاں سن مجنوں کا کیا جلتا ہے جی اپنا
پڑ ناتواں ہوں مجھ پر بھاری ہے جی ہی اپنا
قدر جان کیونکر ہو وے تو صرفہ بھی ہم میر کریں
ملیے کیونکر نہ کف افسوس جی جاتا ہے میر
بے قراری نے یونہی جی مارا
خون ہوئی دل ہی میں امیدِ وصال
رخصت میں پابوس کی سب کا جی جاتا تھا سو ان نے
بیمارئ دلی پر میں صبر کر رہا ہوں

کیا ہی وہ محبوب خوش ترکیب خوش پوشاک تھا
اب تو ہے عہد چند اگر وہ چند وہ سفاک تھا
ہمیں درپیش ہے اب جی کا کھونا
تازہ کیا پیمان صنم سے دین گیا ایمان گیا
دل کھینچتا ہے جانب صحرا جی نہیں لگتا گھر میں اب
اس سے جدا رہنا ہوتا ہے جس سے ہے ہم کو پیار بہت
سب کچھ کہیو جاتے ہوئے تم مت کہیو رخصت کی بات
مہر کی رکھ کر توقع جی کھپایا ہے عبث
بیٹھے بیٹھے ناگہاں یہ رنج اٹھایا ہے عبث
لطف کم مردہ پہ اب عاشق کے آیا ہے عبث
کیا ہے جان بن لیپنے کنز سوان قدم میں بنا ہے آج
کیا ناشق ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے جہان کے بیچ
نام نہیں لیتا ہے کوئی اس کا میرے وطن کے بیچ
جان غلط کر میر آئی ہے گویا تیرے بدن کے بیچ
کرتا ہے میرے خون پہ بیامراد بے طرح
یہ جی چاہ رہا ہے اسی رہگزر پر
کیا کیا مجھ کو جنوں آتا ہے اس لڑکے کے بہانوں پر
عشق شہرت دوست نے آخر مارا مجھ کو رسوا کر
دیکھ چمن میں اس بن میرے جیکے جی بہلانے پر
عاشق ہم بھی میر آ رہے ہیں اس ڈھب کے دیوانے پر
مجھ سے اٹھیں گے اس کے ناز و عتاب کیونکر
منہ موڑیں کیا آنے سے اس کے اپنی جان کے جانے پر
ڈوبتی ہے کشتی ورطہ سے نکل ساحل کے پاس
اس کے نے عہد نہ قرار افسوس
مر رہے جی کو مار مار افسوس
ہاتھ میں عاشقِ وارفتہ کا دل نہ لیا افسوس افسوس
جی کو نہیں ہے میرے مطلق دوا کی خواہش

اب وہی میرؔ جی کھپاتا ہے
عشق میں جی بھی ہم گنوا بیٹھے
نفع کثیر اٹھایا کر عشق کی تجارت
جی میرؔ نے دیا نہ ہوا لیک وصلِ یار
جیسے غمِ ہجراں میں اس کے عاشق جی کھو بیٹھتے ہیں
دیوانے ہیں شہرِ وفا کی راہ و رسم کے ہم تو میرؔ
ہر صورت کو دیکھ رہو ہو ہر صورت کو جھانکو ہو
ہم نہ کہا کرتے تھے تم سے دل نہ کسی سے لگاؤ تم
جان گیا گوہر گرامی ہے
جی تو پھٹا دیکھ آئینہ ہر لوحِ مزار کا جامہ تھا
جوانی میں نہ رسوائی ہوئی تا میرؔ غم کہتے
حسن کیا جنس ہے جی اس پہ لگا بیٹھے ہیں
قالب میں جی نہیں ہے اس بن ہمارے گویا
رنج و عنا کہ دشمنِ جانِ عزیز ہیں
ان اُجڑی ہوئی بستیوں میں جی نہیں لگتا
دل لگنے کی چوٹ بری ہے اس صدمے سے خدا حافظ
ہر جگہ دلکش ہے اس کی برگ گل سے جسم ہیں
کیونکر مجھ کو نامہ نمط ہر حرف پہ پیچ و تاب نہ ہو
جی مارے شب مہ نے ہمارے قہر کیا مشاطہ نے
دیر سے ہیں بیمارِ محبت ہم سے قطعِ امید کرو
آنا اس کا ظاہر ہے پژمردہ پان نہ لایا کرو
خواہش نہ ہووے دل کی جو حاصل تو موت ہے
سوچے تھے کہ سودائے محبت میں ہے کچھ سود
ڈر جان کا جس جا ہے وہیں گھر بھی ہے اپنا
عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
ہائے غیوری جس کے دیکھے جی ہی نکلتا ہے اپنا
عشق کیا سو جان چلی ہے الفت تھی یا کلفت تھی

ہم کو ہوتا نہ اس سے پیار اے کاش
ہو گیا کیا زیاں دریغ دریغ
راضی ہیں میرؔ اب تو ہم جان کے زیاں تک
افسوس ہے کہ مفت ہوا یہ جہاں ہلاک
برسوں بارے چرخِ فلک تو ایسے ہو دیں پیدا لوگ
دل سے کہے جی دینے والے قاطبۃً گھر گھر ہیں لوگ
آگے عشق کیا ہوتا تو پھرتے جی نہ کھپاتے تم
جی دینا پڑتا ہے اس میں ایسا نہ ہو پچھتاؤ تم
بدلے اس کے جہان دیتے ہیں
پھاڑ گریباں تنگ دلی سے ترک لباس کیا یاں ل
ہوئے اطفال تہہ بازار گاہک جی کے پیری میں
عزلتی شہر کے بازار میں آ بیٹھے ہیں
حیرانِ کار یارب ہم کیسا ڈول ڈالیں
ان سے بچاؤ اس کی عنایات ہو تو ہو
ہے جی میں ہم میں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو
بارے سعی و کشش کوشش سے جی کو اپنے بچاتے رہو
ایک جا تو جی لگاؤ دل کے تئیں بیجا کرو
سو سو قاصد جان سے جاویں اک کو ادھر سے جواب ہو
بل کھائے بالوں کو دیا بل اس کے گلے کے ہار کے ساتھ
جانیں ہی جاتی دیکھی ہیں ہم نے اشخاص آثار کے ساتھ
جی ہی نکل جائے گا اپنا یونہی ذوقِ خبر کے ساتھ
احوال میرؔ دیکھ نہیں جی کو مار رکھ
اب دیکھتے ہیں اس میں تو جی ہی کا ضرر ہے
ہم خانہ خرابوں کو تو یاں گھر ہے نہ در ہے
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے
دیکھے اس کی اُدھر نہیں پھر عشق کی یہ بھی غیرت ہے
کوٹے گئے ہیں سب اعضا یہ محبت تھی یا محنت تھی

اب تو تنڈھال پڑے رہتے ہیں ضعف ہی اکثر رہتا ہے
اس مغرور کو کیا ہوتا ہے حال شکستہ دکھائے سے

ظلم وستم سب سہل ہیں اس کے ہم سے اٹھتے ہیں کہ نہیں
گرچہ گھبرا کے لب پہ آئی ولے

بس گئی جاں خراب مدت کی
دامن پر فانوس کے تھا کچھ یونہی نشاں خاکستر کا

اٹکھیلیوں سے چلتے طفلی میں جان مارے
سیر چمن میں کچھ تو جی سے ہوس نکلتی

مر گئے عشق میں نازک بدنوں کے آخر
دو چار روز آگے چھاتی گئی تھی کوٹی

خط اس کو لکھ کے غم سے بیخود ہوا ہوں یعنی
جان بخشی غیر ہی کیا کر

یادِ زلفِ یار جی مارے ہے میر
یہی عشق ہے جی کھپا جاتا ہے

کیا دشوار گذر ہے طریقِ عشق مسافر کش یارو
وہ ناوک دلدوز ہے لاگو مرے جی کا

دل کی تلاش میں اٹھ کے گئے تھے شاید یاں پیدا ہو سو
ایسے قماری سے دل کو لگا کر جیتے رہنا ہو نہ سکا

شاید کہ وصل اس کا ہووے تو جی بھی ٹھہرے
گو ہاتھ وہ نہ آوے دل غم سے خون کرتا

دل بھی بھرا رہتا ہے میرا جی بھی رندھا کچھ جاتا ہے
آہن دلوں نے مارا ہے جی غم میں ان کے ہم

دشمنِ جاں تو ہے دلوں میں بہم
چاہت روگ برا ہے جی کا میر اس سے پرہیز بھلا

شاید لمبے بال اس ماہ کے بکھر چلے تھے باڈ چلے
حسرتِ لطفِ عزیزانِ چمن جی میں رہی

تو بلبل آزردہ نہ ہو گل پھول سے باغ بہاراں میں
آئے گئے اس کے کوچے میں جب تک جی میں طاقت تھی

جس کو شبہ ہووے نہ ہرگز جی کے ہمارے جانے سے
لوگ جو پرسشِ حال کرے ہیں جی تو انھوں نے کھایا ہے

جان کو اضطراب ہے سو ہے
حال اپنا خراب ہے سو ہے

شوق کی میں جو نہایت پوچھی جان جلے پروانے سے
نامِ خدا ہوا ہے اب وہ جوان بارے

موسم میں گل کے بلبل افسوس ہے نہ چھوٹی
جان کا دینا محبت کی گنہ گاری ہے

ہجراں کا غم تھا تہہ میں سختی سے جان ٹوٹی
قاصد کے بدلے یاں سے جی ہی مرا چلا ہے

مجھ کو یہی نیم جاں بہت ہے
سانپ کے کاٹے کی سی یہ لہر ہے

کہ جاناں سے بھی جی ملا جاتا ہے
جی سے اپنے گذر جاتا ہے جو اس راہ سے گزرتا ہے

تو سامنے ہو ہمدم اگر تجھ کو جگر ہے
جان کا اپنے گرامی گوہر اس کی گلی میں کھو آئے

رفتہ رفتہ شاہد بازی اس کے جی بھی اپنا ہار گئے
ہوتی نہیں ہے اب تو تسکین دل خبر سے

ہے لاگ میرے جی کو اس شوخ کی کمر سے
کیا جانوں میں روؤں گا کیسا دریا چڑھتا آتا ہے

پھرتے ہیں نعل سینوں پہ اپنے جڑے ہوئے
دوستی کا حساب ہے سو ہے

اگلے لوگ سنا ہے ہم نے دل نہ کسو سے لگاتے تھے
دل تو پریشاں تھا ہی میر ادات سے جی بھی گھبراتا ہے

سر پہ دیکھا نہ گل و سرو کا سایہ ہم نے
رنج کش الفت ہے عاشق جی اپنا بہلاتا ہے

دیوان ششم

دل لے کے میری جان کا دشمن ہوا نِدان
گرچہ ہجراں میں تِرے جاناں تھا مرا جی چلا
ہم نہ سلجھے نہ اس کے الجھے بال
جس کے لگائی جی میں نہ اس کی ہوس رہی
کیا جانوں عشق جان سے کیا چاہتا ہے میرؔ
بے ہیچ اس کا غصہ یارو بلائے جاں ہے
وعدہ خلافی اس ظالم کی کھا گئی میری جانِ حزیں
میں رنجِ عشق کھینچے بہت ناتواں ہوا
بازار میں جہان کے ہے حسن کیا متاع
دشمن ہو جی کا گاہک ہوتا ہے جس کو چاہا
جی ہے جہاں قیامت درد و الم رہا واں
وے محوِ ناز ہی رہے آئے نہ اس طرف
جہاں میں رہنے کو جی بہت تھا نہ کر سکے میرؔ کچھ توقف
ہے جان تو جہاں ہے مشہور ہے مثل
اس گلی سے جی اٹھتا ٹک نہیں
چلنا اپنا قریب ہے شاید
جسم کی حالت جی کی طاقت نبض سے کر معلوم طبیب
جی کے لگاؤ کیے سے ہم نے جی ہی جاتے دیکھے ہیں
جان و دل دونوں کر گئے ہیں غش
بے سدھ پڑا رہوں ہوں بستر پہ رات دن میں
کیا لوگ ہیں مجہول سودائے عاشقی میں
چلتے تھے ہولے ہولے ہم یوں تو عاشقی میں
ہم جاں بلب پتنگوں کی سدھ لیجیو شتاب
میلان دلربا ہو کیونکر وفا کے اوپر
سودائے عاشقی میں جی کا زیاں ہے لیکن

جس بے وفا سے اپنے تئیں پیار ہو گیا
پر یہ تھا دل میں کہ شاید دیوے تو دادِ وفا
جان کو اپنی پیچ و تاب رہا
یعنی کہ ایک وار ہی میں پار کر دیا
خونریزی کا مجھے تو سزا وار کر دیا
ہرگز منا نہ ہم سے بہتیرا ہی منایا
گرمی کرے وہ مجھ سے جب تک تب تک میں ہی سرد ہوا
مرنا تمام ہو نہ سکا نیم جاں ہوا
سو جی سے جس نے دیکھا خریدار ہو گیا
کی دوستی کہ یارو اک روگ میں بسایا
بیمارِ عاشقی میں ، شب صبح تک کراہا
میں منتظر تو جی سے گیا ان کا کیا گیا
بنا تھی ناپائدار اس کی اس سے رہنا بنا نہ اپنا
کیا ہے گئے پہ جان کے گو پھر جہاں رہا
دل جگر کرتے ہیں پتھر ہم بہت
جاں کرے ہے اب اضطراب بہت
کہنے لگا جانیں کیا ہو گا یہ تو ہے بیمار بہت
اس پہ نہ جانا آہ بڑا ہے الفت کا آزار بہت
دیکھ اس رشکِ مہ کو ان کے بیچ
کیا آفت آ گئی ہے اس نیم جاں کے اوپر
اغماض کرتے ہیں سب جی کے زیاں کے اوپر
پر ان نے جی ہی مارا آخر جلا جلا کر
موقوف اپنا جانا ہے اب ایک آہ پر
دیتا ہے جان عالم اس کی جفا کے اوپر
ہم راضی ہو رہے ہیں اپنے زیانِ جاں تک

دل نہیں مجھ کو ملا یہ کوئی جی کا ہے وبال
اس کی جانب سے رحمت ہو تو جی پھٹکے ہے دنیا میں
ہے اپنا جی ہی درہم تس پر ہے عشق کا غم
اجڑی اجڑی بستی میں دنیا کی جی لگتا نہیں
مر گئے نا امید ہم مہجور
بیے وفقہ اس ضعیف پہ جور و ستم نہ کر
اس کے قربانیوں کی سب سے جدا ہے رہ دیم
رشک ایک آدھ کا جی مارتا ہے عاشق کا
محبت میں دشوار دینی ہے جان
جی مارتے ہیں تازہ کرشمہ بالاتفاق
اب دیکھوں اس کوئیں تو مرا جی نہ چل پڑے
جی خواب مرگ لے گئے حسرت ہی میں ندان
جی پھٹ گیا ہے رشک سے چسپاں لباس کے
اے کاش فصل گل میں گشی ہوتی اپنی جان
دیکھیں عاشق کا جی بھی ہے کہ نہیں
آمادۂ فنا کچھ کیا میرؔ اب ہوا ہے
عشق میں ہم نے جان کتنی کی ہے
دل لیا جس غمیں کا تو نے شوخ
دل غم سے خوں ہوا تو بس اب زندگی ہوئی
اب صبر میرؔ ہو نہیں سکتا فراق پر
لے عشق میں گئے دل پر اپنی جان سے
وہ دل نہیں رہا ہے نہ اب وہ دماغ ہے
دیکھیں تو میرؔ کیونکر ہجراں میں ہم جئیں گے
کچھ نہیں جان ان کے پیشِ تار ہو
کہو تو کب تئیں یوں ساتھ تیرے پیار ہے
دیوانگی بدن سے مرا جی بھی ہے اداس
حالِ خراب جسم ہے جی جانے کی دلیل

گفتنی ہو تو کہوں اے میرؔ میں کچھ اس کا حال
اس جانب سے تب بیٹھے ہیں مرنا کر کے مقرر ہم
رہتے ہیں دم بخود ہم آفت رسیدہ مردم
تنگ آئے ہیں بہت ان چار دیواروں میں ہم
خواہشیں جی کی اپنے جی میں رہیں
طاقت تعب کی کم ہے بہت میری جان ہیں
اول وعدہ دل و جان فدا کرتے ہیں
ہر طرف اس کو تو دو چار دعا کرتے ہیں
نجاتے شتا سہل آزار کو
جیتا جو میرا چاہو تو ان کو جدا کرو
تم ہو فقیر میرؔ کبھو یہ دعا کرو
اک شب نہ سوئے ہم کسو گل پیرہن کے ساتھ
کیا تنگ جامہ لپٹا ہے اس کے بدن کے ساتھ
مل جاتی یہ ہوا کوئی دن اس ہوا کے ساتھ
تنگ ہے جانِ ناصبور سے وہ.
جی مفت دینے کو وہ تیار ہے ہمیشہ
کیا محبت نے دشمنی کی ہے
دے گیا جی ہی اک سرور سے وہ
جانِ امیدوار سے شرمندگی ہوئی
یک عمر جان و دل کی فریبندگی ہوئی
خالی ہوا جہاں جو گئے ہم جہان سے
بجی تن میں اپنے بجھتا سا کوئی چراغ ہے
ہے اضطراب دل کا بے طاقتی ہے جاں کی
گھر میں شمعی رنگوں کے اندھیر ہے
کہ دیکھا جب تجھے تب جی کو مار رہے ہے
منزل خراب ہو دے تو مہمان کیا کرے
جب تن میں حال کچھ نہ رہے جان کیا رہے

نہیں جو دیکھا ہے ہم نے اس کو ہوا ہے نقصان جان اس کا
بس اب رہ چکی جانِ غمناک بھی
اچھی ہی ہے یہ جنسِ وفا یاں لیک نہ ہم نے پائی کہیں
مانند سبحہ عقدے نہ دل کے کبھو کھلے
اچھا ہوتا نہیں مریضِ عشق
دوستی نے تو ہماری جانگدازی خوب کی
گھر میں جی لگتا نہیں اس بن تو ہم ہو کر اداس
لب پہ میرے آن کر بارہا پھر پھر گئی
چلی جاتی ہے دھڑکوں ہی میں جاں بھی
اسی کا دم بھرا کرتے رہیں گے
عشق کیا کوئی اختیار کرے
اس دستِ عشق میں ہیں یہ تنگ آئے جان سے
پڑتا ہے پھول برق سے گلزار کی طرف
راہ تک تک کر ہوئے ہیں جاں بلب
سگئے جل حرِ عشقی سے جگر دل
اے عشق بے محابا تونے تو جان مارے
تم کو تو التفات نہیں جانِ زار پر

ادھر نہ دیکھے جو وہ کبھو تو نگہ کا اس کی گمزویاں ہے
جو ایسی ہی تن کی نزاری رہے
داغ ہوتی ہے جان ہماری اس شے کی نایابی کی
جی اپنا کیونکہ اچٹے نہ روزے نماز سے
ساتھ جی کے ہے دل کی بیماری
آہ اس دشمن نے یہ عاشق نوازی خوب کی
دور جلتے ہیں نکل ہجراں سے گھبرائے ہوئے
جان کو یہ اضطراب دیکھئے کب تک رہے
یہیں سے کہتے ہیں جاں کو رواں ہے
بدن میں اپنے جب تک نیم جاں ہے
وہی جی مارے جس کو پیار کرے
آنکھیں ہماری لگ رہی ہیں آسمان سے
دھڑکے ہے جی قفس میں غم آشیان سے
پروہی اب تک بھی یاں اوسیر ہے
رہی تھی جان سو برسوں جلا کی
ٹک حسن کی طرف ہو کیا کیا جوان مارے
اب ہم ملیں گے اور کسو مہربان سے

سَر

دلیوانِ اوّل

بس طبیب اُٹھ جا مری بالیں سے مت دے دردِ سر
ہم کشتگانِ عشق ہیں ابرو و چشمِ یار
زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا
کب نیازِ عشق نازِ حُسن سے کھینچے ہے ہاتھ
بارے سجدہ ادا کیا تہِ تیغ
یک دو چشمک اِدھر گردشِ ساغر کہ مدام
تو کن نیندوں پڑا سوتا تھا دروازہ کو موندے شب
سر اُٹھاتے ہی ہو گئے پامال
اے پائے خم کی گردشِ ساغر ہو دستگیر
مرے پاس اس کی خاکِ پائے بیماری میں رکھا تھا
قدم دشتِ محبت میں نہ رکھ میرؔ
جب آیا آہ تب اپنے ہی سر پر
ہم بے نصیب سر کو پتھر سے کیوں نہ پھوڑیں
کھینچے گی کب وہ تیغِ ناز یا رب
سکھے تو نخلِ صنوبر ہوں اس چمن میں مَیں
جی بکھرے دل ڈھے ہے سر بھی گرا پڑا ہے
ہجراں کی کوفت کھینچے بیدل سے ہو چلے ہیں
اس دردِ سر کا لکا سر سے لگا ہے میرے
فلک نے گر کیا رخصت مجھے سیرِ بیاباں کو
آوے ہے پہلے قدم سر ہی کا جانا درپیش!
سرِ پُرشور سے میرے نہ کرو کوئی سوال
سودا جو اس کے سر سے گیا زلفِ یار کا

کامِ جاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا
سر سے ہمارے تیغ کا سایہ نہ جائے گا
سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا
آخر آخر میرؔ سر بر آستاں مارا گیا
کب سے یہ بوجھ میرے سر پر تھا
سر چڑھی رہتی ہے یہ گردشِ ایام بہت
مَیں جو کھٹ پٹ پر تری کرتا رہا سر کو پٹک کھٹ کھٹ
سبزۂ نو دمیدہ کے مانند
مرہونِ دردِ سر ہو کہاں تک مرا خمار
نہ آیا سر مرا بالیں پہ اودھر جو گیا ڈھل کر
کہ سر جاتا ہے گامِ اوّلیں پر
گیا یہ ہاتھ کب اس کی کمر تک
پہنچا کبھو نہ جبّہ اس سنگِ آستاں تک
رہے ہیں دیر سے سر کو جھکا ہم
کہ سر سے پاؤں تلک دل ہی بار لایا ہوں
خانہ خراب تجھ بن کیا کیا خرابیاں ہیں
سر مار مار یعنی اب ہم بھی سو چلے ہیں
سو سر کا ہووے صندل میں میرؔ جانتا ہوں
نکالا سر سے میرے جائے مُو خارِ مغیلاں کو
دیکھتا ہو جو سرِ عشق میں پا رکھتا ہو
حشر تھی داخلِ خدّامِ ادب مت پوچھ
تو تو بڑی ہی میرؔ کے سر سے بلا گئی

گئی چھاتی اس تیغ کی سر سے جب کی
عشق میں تیرے گزرتی نہیں بن سر پٹکے

احوال بہت تنگ ہے اے کاش محبت
وے دن گئے کہ اُٹھ کر جاتے تھے اس گلی میں

کب تھی ہمیں تمنا اے ضعف یہ کہ ٹک ہمیں
سر دے کے میرؔ ہم نے فراغت کی عشق میں

ہر شو سر تسلیم رکھے صید حرم میں
دیواروں سے سر مارتے پھرنے کا گیا وقت

ہے دین سر کا دینا گردن پہ اپنے خوباں
آفت رسیدہ ہم کیا سر کھینچیں اس چمن میں

شیخ کی تُو نماز پر مت جا
شمشیر ستم اس کی اب گو کہ چلے ہر دم

رکھ دیکھ کے راہ عشق میں پائے
یوں کانوں کان گل نے نہ جانا چمن میں آہ

وا اس سے سرِ حرف تو ہو گو کہ یہ سر جائے
تو جہاں کے بحرِ عمیق میں سرِ پُر ہوا نہ بلند کر

خون ریزی میں ہم سوں کی جو خاک برابر ہیں
اِن منعموں میں زاہد پھر سر زدہ مت آنا

کیا میرؔ تو روتا ہے پامالیٔ دل ہی کو
آتش کے شعلے سر سے ہمارے گزر گئے

تلوار آپ کھینچئے حاضر ہے یہاں بھی سر
کوئی سر سنگ سے مارو کسی کا واپسیں دم ہو

بسکہ تیرا ہوا بلا گرداں
اپنا سرِ شوریدہ تو وقفِ خم چوگاں ہے

حسرت لطف عزیزانِ چمن جی میں رہی
دشت و کہسار میں سر مارتے چندے تجھ بن

جلے دھوپ میں یاں تلک ہم کہ تب کی
صورت اک یہ رہی ہے عمر بسر کرنے کی

اب دست تلطف کو مرے سر سے اُٹھا لے
اب سعی چاہتے ہے بالیں سے سر اُٹھاتے

پر زیرِ تیغ اس کی ہم ٹک تو سر ہلاتے
قسمے ہمارے بوجھ تھے بارے ادا ہوئے

وہ صید فگن تیغ بکف تا کدھر آوے
اب تو ہی گر پھر کبھو اس اُور در آوے

جیتے ہیں تو تمہارا یہ قرض ادا کریں گے
جوں نخلِ خشک ہم کو نے سایہ نہ ثمر ہے

بوجھ سر کا سا ڈال آتا ہے
شوریدہ سر اپنے سے ہم باندھ کفن بیٹھے

یاں میرؔ کسو کا سر نہ ہووے
سر کو پٹک کے ہم پسِ دیوار رہ گئے

ہم حلق بریدہ ہی سے تقریر کریں گے
کہ یہ پنج روزہ جو بود ہے کسو موج پُر کا حباب ہے

کب سر تُو فرو لایا ہمت تری عالی ہے
مندیل تری اب کے ہم نے تو بچالی ہے

اِن لونڈوں نے تو دلی سب سر پہ اٹھالی ہے
بس اے تب فراق کہ گرمی میں مر گئے

بس عاشقی کی ہم نے جو مرنے سے ڈر گئے
وہ آئینے میں اپنے ناز پر مائل ہے کیا جانے

سر کو میرے دوار رہتا ہے
آ بوالہوس گر ذوق ہے یہ گُو ہے یہ میداں ہے

سر یہ دیکھا نہ گل و سرو کا سایہ ہم نے
قیس و فرہاد کو پھر یاد دلایا ہم نے

برسوں سے مری اس کی رہتی ہے یہی صحبت
تیغِ ستم سے اس کی مرا سر جُدا ہوا
تقصیرِ جان دینے میں ہم نے کبھو نہ کی
ٹھیکرے کو قدر ہے اس کو نہیں
سر ہی چڑھا رہے ہے ہر اِک بادہ خوار کے
اِک دم میں یہ عجب کہ مرے سر پہ پھر گیا
کیا کہیے کہ پتھر سے سر مارتے ہم گزرے
پھوڑا تھا سر تو ہم نے بھی پر اس کو کیا سیں
لکھا ہے بازہیں در بدر کے پھرنے سے
کیا کوئی زیرِ فلک اونچا کرے فرقِ غرور
جب رات سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی
گلی سے یار کی ہم لے گئے سرِ پُرشور
سرکنا اس کے درباں پاس سے شب کو بھی ہے مشکل
شب نہ کرتا شور اس کوچے میں گر میں جانتا
ہم سر ہی جاتے عشق میں اکثر سُنا کیے
دیر سے خانہ میں مرے سر پر
یاں سر فرو نہ لائے ناداں کوئی وگرنہ
ساتھ ہی اس سرِ عریاں کی یہ وحشت کرنا
فائدہ سر جھکے گا شیب میں میرؔ
کیا سر جھکار ہے ہو میرؔ اس غزل کو سُن کر
آئی ہے اس کے کوچے سے ہو کر صبا کچھ اور
عشق کی رہ نہ چل خبر ہے شرط
نہ دے ماریں چوکھٹ سے سر کو تو کہیو
دست دے گی کب اس کی پابوسی
قدم تلے ہی رہا اس کے یہ سرِ پُرشور

تیغ اس کو اُٹھاتا تو سر مجھ کو جھکا جاتا
شکرِ خدا کہ حقِ محبت ادا ہوا
جب تیغ وہ بلند ہوئی سر جھکا دیا
ٹوٹے جب کاسۂ سرِ فغفور کا
ہے شیخِ شہر یا کوئی جِن ہے پڑھا ہوا
جو آبِ تیغ برسوں تری تا کمر رہا
لیل اپنا زمانہ تو بن یار بسر آیا
جو چشمِ روزگار میں فرہاد آ گیا
سروں پہ اپنے ہے احساں شکستہ پائی کا
ایک پتھر حادثے کا آلگا سر چِر گیا
ناچار میرؔ منڈکری سی مار سو رہا
وگرنہ شام سے ہنگامہ ہی رہا کرتا
سرِ زنجیر زیرِ سر رکھے ہے ہم اسیروں کا
اس کی بے خوابی سے ہنگامہ میرے سر پہ رہا
اس راہ خوفناک میں کیوں تم نے پا رکھا
حال ممدود دار بست رہا
جیسے سجود میں ہے جیسے نماز واجب
پگڑی الجھی ہے مری اب تو بیابان کے بیچ
پیری سے آگے اے جواں ٹک سوچ
بارے نظر کرو ٹک اے مہرباں زمین پر
کیا سر میں خاک ڈالتی ہے اب ہوا کچھ اور
اولِ گام ترکِ سر ہے شرط
رسائی ہوا چاہیے اس کے در تک
دیر سے سر پٹک رہے ہیں ہم
جو کہائیے تو مرے طالعِ رسا کی قسم

کیوں سر چڑھے ہے ناحق ہم بخت سیاہوں کے
اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا
ملا تیوری چڑھلائے تو لگا ابرو بھی خم کرنے
پیری سے جھلتے جھلتے پہنچا ہوں خاک تک میں
یاد میں اس کی قد و قامتِ دلکش کے میرؔ
دیکھیں پیش آوے ہے کیا اب تو جوں سیل
گیا کوچے سے تیرے اُٹھ کے میرؔ آشفتہ سر شاید
اب جو نصیب میں ہے سو دیکھ لوں گا میں بھی
زلف اور خال و خط کا سودا نہیں ہے اچھا
شرم کرنی تھی مرا سر کاٹ کر
منصور کی نظر تھی جو دار کی طرف سو
میں جو نرمی کی تو دُونا سر چڑھا وہ بدمعاش
شہر میں حشر کیوں نہ برپا ہو
پھوڑ ڈالیں گے سر ہی اس در پر
گر تانسے وہ سر پہ لے تیغ نہ آ پہنچے
ہر چند بہرِ خوباں سر مسجدوں میں مارے
بڑوں بڑوں کو جھکاتے ہی سر بنے اس دم
کہاں تک سر کو دیواروں سے یوں مارا کرے کوئی
ہم اس راہِ حوادث میں بسانِ سبزہ واقع ہیں
جمع کر خاطر مری جینے سے مجھ کو خوب ہے
کیا جانے تیغ اس کی کب ہو بلند عاشق
کام کیا بال ہما سے چترِ شہ سے کیا غرض
دیکھ سیلاب اِس بیاباں کا
لگا میں گردِ سر پھرنے تو بولا
کیا میرؔ سر جھکادیں ہر کم بغل کے آگے
آرزو اس بلند و بالا کی
دیوار سے پٹک سر میں جب مُوا تو بولا

مت پیچ میں پگڑی کے بالوں کو گھر س ظالم
مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں
مؤثر کچھ ہوا سر مارنا محرابِ طاعت میں
وہ سرکشی کہاں ہے اب تو بہت دبا ہوں
اپنے سر ایک قیامت نئی لا رہتے ہیں
ہم بھی اس راہ میں سر گاڑے چلے جاتے ہیں
پڑا دیکھا تھا میں نے راہ میں اس کے سنگِ بالیں کو
تم دستِ لطف اپنا سر سے مرے اٹھالو
یارو بنے تو سر سے جلد اس بلا کو ٹالو
سو تو ان نے اور ٹیڑھی کی کلاہ
پھل وہ درخت لایا آخر سر بریدہ
کھاتے ہی کو دوڑتا ہے اب مجھے غلوا سمجھ
شور ہے میرے سر میں کیسا کچھ
منت اٹھتی نہیں ہے درباں کی
منزل کو عاشق اپنے مقصد کی نہ جا پہنچے
پر ان کے دامنوں تک دستِ دعا نہ پہنچے
پکڑ کے تیغ وہ اپنی اگر بلند کرے
رکھوں اس در پہ پیشانی نصیب ایسے کہاں میرے
کہ فرصت سر اٹھانے کی نہیں تک پائمالی سے
جی بچا تب جانئے جب سر سے یہ کلول ٹلے
یوں چاہیئے کہ ہر دم سر کو جھکا کے بیٹھے
سر پہ اک دیوار ہی کا اس کی سلیہ چاہیئے
کیسا سر کو جھکائے جاتا ہے
تمہارا میرؔ صاحب سر پھرا ہے
نام خدا انھوں کی عزت بہت بڑی ہے
کیا بلا میرے سر پہ لاتی ہے
کچھ اس ستم زدہ کے آثار ایسے ہی تھے

دیوانِ سوم

مجھے سر در گریباں رہنے دو ہیں بے توقع ہنس
شکرِ خدا کہ سر نہ فرو لائے ہم کہیں
پامالی عزیزوں کی رکھتی تھی نظر میں ٹک
عجب دن میرؔ تھے دیوانگی میں دشت گردی سے
نہ پتھروں سے جو سر کو دو پارہ میں کرتا
آخر کو خواب مرگ ہمیں جا سے لے گئی
دے مارنے کو تکیہ سے سر ٹک اٹھا تو کیا
ہم سر نہ کھینچتے تو وہ تیغ کھنچ نہ سکتی
وے دن کہاں کہ مست سرانداز خم میں تھے
کھنچی تیغ اس کی تو یاں نیم جاں تھے
سر کاٹ کر ہم اس کے قدموں کے تلے رکھا
جب نہ تب ملتا ہے بازاروں میں میرؔ
مبر چنیں اور اڑتی پھرے ہے ہماری خاک
زانو پہ سر ہے قامت سرگشتہ کے سبب
سر زیر پر ہے دیر سے اے ہم صفیر ہم
ہمیں سرکشی سر بلندی سے کیا
دربان سنگدل نے خبر واں تلک نہ کی
اس جنوں میں کہیں ہے سر پر خاک
سر مارتا ہوں ایدھر اُودھر دُور تلک جاتا ہوں نکل
سر مارتے ہیں سنگ سے فرہاد کے سے ننگ
سختی ستم اس سے جدا رہنے میں وئے
دو سپئے حق ہیں میرے خورد و کلاں
ہر چند جانیں جاتی ہیں پر تیغ جور سے
واقف ہو شانِ بندگی سے قیدِ قبلہ کیا
موت جو آئے سرِ انساں دست و پا گم کرتا ہے

کسو پتھر سے سر پٹکوں گا اب جو سر اُٹھاؤں گا
کیا جانے سجدہ کہتے ہیں کس کو سلام کیا
اتنا بھی تمہیں آکر یاں سر نہ اٹھانا تھا
سر اُوپر سایہ گستر ہوتے تھے کیکر جہاں میں تھا
زمانہ غم کا مرے کس طرح بسر آتا
جی دیتے تک بھی سر میں اسی کا خیال تھا
بستر سے کب اُٹھے ہے غم عشق کا گِرا
اپنا گناہ ، اپنی تقصیر، میرؔ صاحب
سراب تو جو جھرا ہے شکستہ سبو کی طرح
خجالت سے رہ گئے سر کو جھکا کر
ٹیڑھی ہے اس کی طرفِ کلاہ اس طرف ہنوز
ایک لوطی ہے وہ ظالم سر فروش
سر سے گئی نہ جی بھی گئے پر ہوائے شوق
پیری میں اپنی آن گے ہیں قدم سے ہم
واقف نہیں ہوائے چمن سے اسیر ہم
رہے ضعف سے ہم تو سر در قدم
سر مار مار صبح کی ، اس آستاں سے ہم
ٹکڑے ہو کر گیا لباس کہیں
پاس نہیں جو پاتا اس کو کیا کیا میں گھبراتا ہوں
دیکھیں تو ہم بھی کیا ہے ہمارے نصیب میں
سر سنگ سے نہ ماریں تو کیونکر بسر کریں
یہ وبال اپنے کوئی سر پر لو
تم کو ہمارے سر کی سوں تم ہاتھ مت اٹھاؤ
سر کو کہیں جھکا کہ ہے مسجود ہر جگہ
دیکھتے ہی شمشیر بکف کچھ آج اسے اوسان ہوئے

آگے جنوں سے چھاؤں میں تھے سرو وگل کی ہم
سر پر ہمارے سایہ فگن اب کریل ہے

مرنے ہی کا مہیا اپنے رہا کیا ہوں
واں تیغ اُٹھائی اُن نے یاں سر جھکا دیا ہے

سر کشو سے فرو نہیں آتا
حیف بندے ہوتے خدا نہ ہوتے

گل کو سر پر رکھیں سب ہی لیکن
اب دماغ اپنا کب اٹھاتا ہے

کہیں سو کیا کہیں سر پر ہمارے
قیامت شامتِ اعمال لائی

کوہِ غم سر پر اٹھا لیجے نہ کہیے منہ سے کچھ
عشق میں جوں کوہکن کچھ بردباری کیجیے

سیّد ہیں میر صاحب درویش و دردمند
سر رکھیے ان کے پاؤں پہ جاتے ادب ہیں یے

سر پھوڑتا ہمارا اس لڑکے پر نہ دیکھو
ٹک دیکھو اس شکستِ طرفِ کلاہ کو بھی

عشق کی ہے راہ کیا مشکل گزر
سر کا جاتا جس میں ہر ایک گام ہے

دیوانِ چہارم

نَیں نے نکل جنوں سے مشقِ قلندری کی
زنجیرِ سر ہوا ہے تھا سلسلہ جو پا کا

اے کاش مرے سر پہ اک بار وہ آ جاتا
ٹھہراؤ سا ہو جاتا یوں جی نہ چلا جاتا

داغ تھا جو سر پہ میرے شمع ساں
پاؤں تک مجھ کو وہی کھاتا رہا

کوہِ فرہاد سے کہیں آگے
سر مرا اور سنگِ خارا تھا

جھکے سلام کسی کو کرنا سجدہ ہی ہو جاوے ہے
سر جاوے گو اس میرا سر نہ فرو میں لاؤں گا

سر ہی سے سر راہ یہ سب ہے ہجر کی اُس کی کلفت میں
سر کو کاٹ کے ہاتھ پہ رکھ کے آپ ہی ملنے جاؤں گا

قیامت کو جرمانہ شاعری پر
مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا

درد سر کا پہر پہر ہے اب
زندگانی ہے دردِ سر ہے اب

عزلتی میرؔ جوں صبا اس بن
خاک بر سر ہے در بدر ہے اب

سر رگڑتے اس آستاں پر میرؔ
یاری کرتے اگر ہمارے نصیب

خیال رکھیے نہ سرکشی کا سنو ہو صاحب کہ پیری آئی
خمیدہ قامت بہت ہوا ہے جھکائے سر ہی رہا کرو اب

کل کہتے ہیں ہوگی قیامت کل کی کل ہیں لیں گے دیکھ
یاں تو قیامت عشق میں اس کے ہے گی اپنے سر پر آج

مر گیا فرہاد جیسے، مرتے بارے اس طرح
سر کوئی پتھر سے مارے تو بھی مارے اس طرح

لیک تو ہم تم ہوتے نہیں ہیں سر بہتیرا مار چکے
اب بہتر ہے تیغِ ستم کی جلد لگا کر توڑ دو کر

اس رفتہ پاس اس کو لاتے تھے لوگ جا کر
پر حیف میں نہ دیکھا بالیں سے سر اٹھا کر

آگے زمیں کی تہہ میں ہم سے بہت تھے تو بھی
سر پر زمیں اٹھا لی ہم بے تہوں نے آکر

یوں بھی مشکل ہے وہ بھی مشکل ہے
ایک سجودِ خلوصِ دل سے آہ کیا نہ جوانی میں

یوں سر بکھیرے عشق میں پھرتے نہیں ہیں میرؔ
کیا کہوں کیسا ہے دلبر خود غرض

آج ہمارا سر پھرتا ہے باتیں جتنی سب موقوف
وحشت تھی ہمیں بھی وہی گھر بار سے اب تک

سبب مرگِ فرہاد کا ہو گیا تھا
رعنا جوان شہر کے رہتے ہیں گل بسر

عشق کی بجلی آ کے گری سو داغ ہوا ہے سر تا سر
کیسی کیسی خرابی کھینچی دشت و در میں سر مارا

خاک بے اصل طینت آدم چاہیے اس کو عجز کرے
ضعف دماغ سے کیا پوچھو ہو اب تو ہم میں حال نہیں

بلا شور ہے سر میں ہم کب تلک
محبوب کا وصال نہ ہم کو ہوا نصیب

سر کوئی پھوڑے محبت میں تو بارے اس طرح
شام و سحر ہم سر زدہ دامن سر بگریباں رہتے ہیں

خرابِ عشق تو سر گشتہ ہوں ہی میں تم بھی
قد جو خم پیری سے ہو تو سر کا دھننا ہیچ ہے

یک رنگ آشنا ہیں خرابات ہی کے لوگ
سر تو بہت بکھیرا پر فائدہ گیا نہ

کیا کیا فتنے سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
ہے راست میرؔ صاحب کس کس کا حیف کریے

کیا پگڑی کو پھیر کے رکھتے سر نیچے نہ ہونا تھا
سر کا جانا ہی ہر قدم ہے میرؔ

سر جانے کی اور اپنے زنہار نگاہ نہ ہم نے کی
اب ترک کر لباس توکل ہی کر رہے

جو اٹھتا ہے یاں سے بگولہ ہوا ہے آوارہ کوئی

سر جھکائے گزر کریں کیونکر
سر مارے ہیں محرابوں میں یونہی وقت کو اب کھو کر

اظہار بھی کرے ہیں تو اظہار کی روش
خود نما خود رائے و خود سر و خود غرض

حرف و سخن جو با یکدیگر رہتے تھے سو اب موقوف
سر مارے ہیں اپنے در و دیوار سے اب تک

نگوں ہے سرِ شیشہ خجلت سے اب تک
سر پر ہمارے داغ جنوں کے ہیں جائے گل

کیا روئے جوں ابر کوئی اس مزرع کا حاصل ہے دل
خانہ خراب کہاں تک پھریے ایسا ہو گھر جاویں ہم

بات کی تہہ کو کچھ پاتے تو آتنا سر نہ اٹھاتے تم
آتا ہے کہ طپش سے دل کی سر پردہ وصال نہیں

قیامت کا ہنگامہ برپا کریں
دل سے ہزار خواہشیں سر کو پٹک گئیں

مر گیا ہے عشق میں فرہاد جس قدرت سے یاں
ہم کو خیال ادھر ہی کا ہے ان کو ادھر کا دھیان نہیں

پھرا پھرا کے مجھے گلیوں میں خراب کرو
ہو چکا ہونا تھا جو کچھ اب عبث پچھتاؤ ہو

سرئے کشتوں کے پھوٹتے دیکھے سبو کے ساتھ
الجھاؤ تھا جو اس کی زلفوں سے سو گیا نہ

جس بیدل بیتاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے
سر ہے فگندنی ہے قد ہے خمیدنی ہے

لطف نہیں اب کیا کہیے کچھ آ گئے ہم بھی کیا کیا تھے
کیا کوئی اس کی راہ پر گزرے

اُٹھ کے اندھا دھند آئے چلے ہی اس ظالم کے قدم دیکھے
جب سے کلاہ سر پہ رکھی در بدر رہے

اس وادی میں میرؔ مگر سرگشتہ کسو کی تربت تھی

تھا صبر و سکوں جب تک رہتا تھا مجھے غش سا
جب سے عشق کیا ہے میں نے سر پہ میرے قیامت ہے

جب سے ستارہ صبح کا نکلا تب سے آنسو چمکا ہے
خوار پھرایا گلیوں گلیوں سر مارے دیواروں سے

کوہکن و مجنوں یہ دونوں دشت و کوہ میں سر مارہیں
حاصل کڑے ہونے کا ابرو کی کماں اس کی

بیتابئ دل سر پہ اک اور بلا لائی
ساعت دل لگنے کی شاید نحس ترین ساعت تھی

دل تڑپا جو اس مہ رو بن سر کو ہمارے دھمکا ہے
کیا کیا ان نے سلوک کیے ہیں شہر کے عزت داروں سے

شوق نہیں ہے ملنے کا ہم کو میر ایسے آواروں سے
دیکھیں گے چڑھی جس دم ہم سر کو نوادیں گے

دیـوانِ پنجم

کوشش میں سر مارا لیکن در پہ کسی کے جا نہ سکا
ہائے جوانی کیا کیا کہئے شور سروں میں رکھتے تھے

بلائیں زیرِ سر ہوں کاش افتادہ رہوں یونہی
ابھی ہوں منتظر جاتی ہے چشم شوق ہر جانب

خاک سے آدم کو دکھلایا یہ منت کیا تھوڑی ہے
کاٹ کے سر عاجز کا ان نے اور بھی پگڑی پھیر رکھی

سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا
دیواروں سے سر مارا تب رات سحر کی ہے

سرزنگی بدی مری نوشتنی ہے میر
عالم ہستی کیا عالم تھا غم دنیا و دیں کا نہ تھا

چھاتی کوٹی منہ نوچا سر دے دے مارا پتھر پر
پاؤں پہ سر رکھنے کی مجھ کو رخصت دی ہے میر اُن نے

پڑا نہ سایہ اس کی تیغِ خون آلودہ کا سر پر
رہا تھا زیرِ دیوار ان کے میں برسات میں جاکر

سر اپنا عشق میں ہم نے بھی یوں تو پھوڑا تھا
سر اس آستان پہ رگڑتے گئے ہیں

مسلم و کافر کے جھگڑے میں جنگ و جدل سے رہائی نہیں
سخت مصیبت عشق میں ہے یہ جانیں چلی جاتی ہیں لیک

سر نیچے کر لیتا تھا تلوار چلاتے ہم پر وے

تن پہ زبان شکر ہے ہر مُو اپنی شکستہ پائی کا
اب کیا ہے وہ عہد گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

اٹھا سر خاک سے تو میر ہنگامے اٹھاؤں گا
بلند اس تیغ کو ہونے تو دو سر بھی جھکاؤں گا

اب سر خاک بھی ہو جاوے تو سر سے کیا احسان گیا
فخر کی کون سی جاگہ تھی یاں ایسا کیا رستم ملا

اس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا
اے صاحب سنگیں دل اب میری خبر کرنا

قاصد جو دے کے نامہ گیا سو بھلا گیا
ہوش آیا ہے جب سے سر میں عشق رہا اس عالم کا

دل کے خوں ہوتے ہیں ہمارے یہی طریق ہے ماتم کا
کیا پوچھو ہو سر پہ میرے منت سی منت ہے لب

کیسے ہیں یوں تو قسمت ان نے کیا کیا وار یا قسمت
گری اس مینہ میں سر پر وہی دیوار یا قسمت

پر اس کا کیا کریں اوروں کا اعتبار ہے آج
ہوئے خون یاروں کے اس خاک در پر

لوتھوں پہ لوتھیں گرتی رہیں گی کشتے رہیں گے سر کے سر
ہاتھ سروں پر ماریں گے تو بند رہیں گے گھر کے گھر

پر بجھ گئے خوں ریزی میں اپنی اس کے پھر شرمانے پر

تھوڑے سے پانی میں بھی چل نکلے ہے اپھرتا
پانی کے دھوکے کیا کیا پیاسے عزیز مارے
کیا کہیے میاں اب کے جنوں میں سینہ اپنا یکسر داغ
ماتا ہے قبلہ کعبہ خدا فرطِ شوق سے
آوارہ ہی ہوتے ہم سر مار مار یعنی
اے وائے بے نصیبی سر سے بھی گزرے لیکن
دیکھا کبھو نہ ہم نے سُنا ہے فگندہ میر
عشق ہمارے درپئے جاں ہے آئے گھر سے نکل کر ہم
میر اپنی سب عمر گئی ہے سب کی بُرائی ہی کہتے
سرِ بالیں سے اُٹھادیں کاش کہ بیمارِ عشق
شکیبائی کہاں جواب رہے جاتی ہوئی عزت
طینت میں ہے نیاز جنھوں کے مسجود ان کی سب ہے زمین
مستی خرابی سر پہ لائی کعبے سے اٹھ دیر گیا
گو دستِ لطف سر سے اٹھائے کوئی شفیق
یہ یہ بلائیں سر پہ ہیں تو آج موئے کل دوسرا دن
حسرتیں اس کی سر پٹکتی ہیں
سر دینا ٹھہرا کر ہم نے پاؤں کو باہر رکھا تھا
ہستی موہوم و یک سرو گردن
بے طاقتی سے کیونکر سر ماتے رہیں نہ
سخت جانی ہے نہ تنک ہو جو خبر گھر میں اسے
عشق میں بلا انگیز مفتن یہ تو کوئی قیامت ہے
چھوڑو اس اوباش کا ملنا ورنہ سر کٹواؤ گے

بے تہ ہے سر نہ کھینچ اک دم حباب کیونکر
سر پر نہ خاک ڈالے اپنے سراب کیونکر
ہاتھ گلوں سے گلدستے ہیں شمع نمط ہے سر پر داغ
جلتے ہیں سر رگڑتے ہوئے یار کی طرف
نو پر نکل گئے ہیں اپنے سب آشیاں تک
پیشانی تک نہ پہنچی اس خاکِ آستاں تک
داغِ جنوں ہے سر پہ ہمیشہ بہارِ گل
سر پہ دیکھا یہی فلک سے ہے جاویں کیدھر چل کر ہم
سر پر آیا جانے کا موسم اب تو بھلا کر جاویں ہم
ہوگا ایک ہنگامہ برپا فتنہ زیرِ سر ہیں ہم
کدھر وہ ناز جس سے سر فرو ہرگز نہ لاتے تم
خاک جو یہ پامال ہے اس سے سر کو رگڑتے جاتے ہیں
جس کو خدا نے خراب کیا ہو پھر وہ کیونکر خراب نہ ہو
دل کا لگاؤ اپنا ہے دستِ دُعا کے ساتھ
یاری ہوئی بیماری ہوئی درویشی ہوئی تنہائی ہوئی
مرگِ فرہاد کیا کیا تو نے
ہر سو ہو دشوار ہے پھرنا میر ادھر اب تو آئے
سیکڑوں کیونکہ حق ادا کریئے
صبر و قرار دونوں یکبارگی سدھارے
صبح تک ہم، رات دیواروں سے سر مارے گئے
جس سے پیار رکھے ہے پھر اس کے سر پر شامت ہے
چاہ رہو گے بہتیروں کو سر جو میر سلامت ہے

دیوانِ ششم

کیا اور لکھئے کیسی خجالت ہوئی مجھے
سر جو دے دے مارتے گھر میں پھرے
ہوش کچھ جن کے سروں میں تھا شتابی بیچئے
آیا ہے شیب سر پر گیا ہے شباب اب
سر صدقے تیرے ہونے کی خاطر بہت ہے گرم
وہ بے وفا نہ آیا بالیں پہ وقتِ رفتن
زانو پہ سر ہے اکثر مت فکر اِس قدر کر.
کہاں تک اسے سر سے مارا کروں
دیواروں سے بھی مارا پتھروں سے پھوڑ ڈالا
ہاتھ سے وہ گئی جو سیمیں ساق
بہار آئی گل پھول سر جوڑ نکلے
دیکھو کب تیغ اس کی آ بیٹھے
عشق کیا ہے اس گل کا یا آفت سر پہ لائے ہیں
سر سے ایسی لگی ہے اب کہ چلے جاتے ہیں
دم بخود رہتا ہوں اکثر سر رکھے زانو پہ میرؔ
سر دے دے مارتے ہیں ہجراں میں میرؔ صاحب
ہے سر کے ساتھ مال و منال آدمی کا سب
قامت سے اس کی سر نگوں رہتے ہیں سرو و گل
ہوں دربدر خاک بہ سر چاک گریباں
پامال لوگ کیا کیا آگے ہوئے ہیں تم سے
کل فتنے زیرِ سر تھے جو لوگ کٹ گئے سب
غنچہ ہے سر پہ داغ سودا کا
سر بیچے سو عشق میں رکھے پا

سر کو جھکائے آیا جو قاصد چلا ہوا
رنگ دیگر ہے در و دیوار کا
حیف صد حیف کہ مَیں دیر خبردار ہوا
کرنا جو کچھ ہو تم کو کرلو شتاب اب
مارا کرے ہے شام و سحر چکر آفتاب
سو بار ہم نے دیکھا سر کو اٹھا اٹھا کر
دل لے گیا ہے کوئی تو میرؔ ٹک جگر کر
نہ پہنچا مرا ہاتھ اس کی کمر تک
پہنچا نہ سر ہمارا حیف اس کے آستاں تک
ہم رہے سر بزانو و مغموم
رہیں باغ میں کاش اس رنگ ہم تم
دیر سے سر اٹھا رہا ہوں مَیں
جھانکتے اس کو ساتھ صبا کے صبح پھرے ہیں گھر گھر ہم
متصل شمع سے روتے ہیں گلے جاتے ہیں
حال کہہ کر کیا کروں آزردہ اور احباب کو
یارب چھڑا تو ان کو ہجراں کے دردِ سر سے
جاتا رہے جو سر ہی تو سامان کیا رہے
خوبی سے اس کی لالۂ صد برگ داغ ہے
اس طور سے کیونکر مجھے رسوا نہ کہیں گے
اس پہ بھی تم جو آئے یاں تم نے سر اٹھائے
پھر بھی زمین سر پہ یاروں نے آج اٹھالی
دیکھیں کب تک یہ گل بہار کرے
واقف نہیں دل تو یاں کی نَے سے

آنکھ

دیوانِ اوّل

کیا مَیں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا
سے نے خون ہو آنکھوں سے بہا ٹک نہ ہوا داغ
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
مری اب آنکھیں نہیں کھلتیں ضعف سے ہمدم
اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھا
داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب
ٹک دیکھ آنکھیں کھول کر اس دم کی حسرتیں
کن سے یہ بحرِ خوبی کی پریشاں زلف ہے
تو وہ متاع ہے کہ پڑی جس کی تجھ پہ آنکھ
جل گیا دل سفید ہیں آنکھیں
اشکِ تر قطرۂ خوں لختِ جگر پارۂ دل
آنکھیں کھلک سے اس کی لگا کر خاک برابر ہم بھی ہوئے
آنکھوں سے تری ہم کو ہے چشم کہ اب آوے
لے گیا صبح کے نزدیک مجھے خواب اے وائے
دل سے آنکھوں میں لہو آتا ہے شاید رات کو
وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
کبھو نہ آنکھوں میں آیا وہ شوخ خواب کی طرح
آنکھوں نے راز داری محبت کی خوب کی
غمزے نے اس کے چوری میں دل کی ہنر کیا
کیونکر تو میری آنکھ سے ہو دل تلک گیا
ہزار حیف کی یاں لگ گئیں چھت سے آنکھیں
بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں

آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غمدیدہ کہیں تھا
اپنا تو یہ دل میرؔ کسو کام نہ آیا
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
نہ کہہ کہ نیند میں ہے تو یہ کیا خیال کیا
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا
ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا
جس دم یہ سمجھے گی کہ یہ عالم بھی خواب تھا
آتی ہے آنکھوں میں میرے موجِ دریا آشنا
وہ جی کو بیچ کر بھی خریدار ہو گیا
یہ تو کچھ انتظار میں دیکھا
ایک سے ایک عدہ آنکھ سے بہہ کر نکلا
مہندی کے رنگ ان پاؤں نے تو بہتوں کو پامال کیا
جو فتنہ کہ دنیا میں برپا نہ ہوا ہو گا
آنکھ اس وقت کھلی قافلہ جب دُور گیا
کشمکش میں بے قراری کے یہ پھوڑا چھل گیا
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبا
تمام عمر ہمیں اس کا انتظار رہا
آنسو جو آتے آتے رہے تو لہو بہا
اس خانماں خراب نے آنکھوں میں گھر کیا
یہ بحرِ موج خیز تو عسر العبور تھا
نوائے مہ کس شب لبِ بام ہو گا
کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہے گا

یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول
مستی میں شکل ساری نقاش سے کھنچی پر
دیکھے ہیں راہ کس کی یارب کہ اختروں کی
اب وہ نہیں کہ آنکھیں تھیں پُرآب روز و شب
پی ہوئے تو لہو پیا ہو میں
نیرنگِ حسن دوست سے کر آنکھیں آشنا
موند آنکھیں سفرِ عدم کا کر
حسرت ہے اس کے دیکھنے کی دل میں بے قیاس
غیروں سے وے اشارے ہم سے چھپا چھپا کر
دیکھوں میں اپنی آنکھوں سے آوے مجھے قرار
کبھو جو آنکھ سے چلتے ہیں آنسو
یہ آنکھیں گئیں ایسی ہو کر درخشاں
کوئی جو دم رہا ہے سو ہے آنکھوں میں بے طرب
ہم اپنی آنکھوں کب تک یہ رنگِ عشق دیکھیں
کل رات مند گئیں تھیں بہتوں کی آنکھیں غش سے
چشم وا دیکھ کے اس باغ میں کبھو نرگس
رگِ جاں کب آتی ہے آنکھوں میں میرؔ
آنکھیں جو روتے روتے جاتی رہیں بجا ہے
کچھ اپنی آنکھ میں یاں کا نہ آیا
یہ دل وہ جا ہے جس میں دیکھا تھا تجھ کو بستے
گہہ لوہو ٹپکتا ہے گہہ لختِ دل آنکھوں سے
جی انتظار کش ہے آنکھوں میں رہگزر پر
آنکھیں تو تُو نے دی ہیں اے جرم بخشِ عالم
دیکھوں ہوں آنکھ اٹھا کر جس کو تو یہ کہے ہے
تلوار غرقِ خوں ہے آنکھیں گلابیاں ہیں
بنی نہ اپنی تو اس جنگجُو سے ہرگز میرؔ
اب آنکھوں میں خوں دم بدم دیکھتے ہیں

گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا
آنکھوں کو دیکھ اس کی آخر خمار کھینچا
رہتی ہیں باز آنکھیں چندیں ہزار ہر شب
ٹپکا کرے ہے آنکھوں سے خونِ ناب روز و شب
محتسب آنکھوں پہ ہے کچھ آشوب
ممکن نہیں وگرنہ ہو دیدار ایک طرح
بس ہے، دیکھا نہ عالمِ ایجاد
اغلب کہ میری آنکھ رہے باز میرے بعد
پھر دیکھنا ادھر کو آنکھیں ملا ملا کر
اے انتظار تجھ کو کسو کا ہو انتظار
تو بھر جاتا ہے پانی سب زمیں پر
کہ دیکھے سے آیا ترا ابرِ گہر بار
کر شو ٹک ایک وعدۂ دیدار دیکھ کر
آنے لگا ہے لوہو رخسار پر تو بہہ کر
دیکھا کیا نہ کر تُو سرمستِ خواب ہو کر
آنکھوں سے جاتی رہے گی یہ بہار آخر کار
گئے ہیں مزاج اس کمر کی طرف
انصاف کر کہ کوئی دیکھے ستم کہاں تک
خذف سے سے کے دیکھا در تر تک
کن آنکھوں سے اب اجڑا اس گھر کو آہ دیکھوں
یا ٹکڑے جگر ہی کے ہر آن نکلتے ہیں
آ جا نظر کہ کب تک میں تیری راہ دیکھوں
کیا تیری رحمت آگے اپنے گناہ دیکھوں
ہوتا ہے قتل کیونکر یہ بے گناہ دیکھوں
دیکھیں تو تیری کب تک یہ بد شرابیاں ہیں
لڑائیاں، جیسے ہم آنکھیں لڑائیاں، دیکھیں
نہ پوچھو جو کچھ رنگ ہم دیکھتے ہیں

اگر جان آنکھوں میں اس بن ہے تو ہم
کہاں تک بھلا روؤ گے میرؔ صاحب

نظر اے ابر اب مت آ مبادا
آنکھوں نے میرؔ صاحب وقبلہ ورم کیا

شرح ہتی ہیں مری آنکھیں لہو رونے سے شیخ
لہو آنکھوں سے بہتے وقت رکھ لیتا ہوں ہاتھوں کو

رونا آنکھوں کا روئیے کب تک
سو جگہ اس کی آنکھیں پڑتی ہیں

دیکھ اُسے بے دید ہو آنکھوں سے کیا دیکھا بھلا
دل میں جو کبھو جوشِ غم اٹھتا ہے تو تا دیر

سُرمہ جو نور بخشے ہے آنکھوں کو خلق کی
اب کچھ ہمارے حال پہ تم کو نظر نہیں

ایک بھی چشمک نہ اس مہ کی سی کی
مرے غمزے سے جور وظلم کے آنکھیں غزالوں کی

تری آنکھوں کو آؤں دیکھنے میں تو عجب مت کر
غرورِ ناز سے آنکھیں نہ کھولیں اس جفا جُو نے

کیا ہے حباب سایاں آ دیکھ اپنی آنکھوں
گر بہشت آوے تو آنکھوں کو مری بھیکی لگے

عالم ہے شوق کشتہ خلقت ہے تیری رفتہ
کم میری اُور آنا کم آنکھ کا ملانا

ہمیں نے آئینہ صفت در نہ کیا بند غرض
تلوار کے تلے بھی ہیں آنکھیں تری ادھر

حق بر طرف ہے منکرِ دیدارِ یار کے
تیور میں جب سے دیکھے ہیں ساقی خمار کے

یوں چشمِ بسمل نہ نظر آوے گی نظر
بکھر رہی ہیں منہ پر زلفیں آنکھ نہیں کھل سکتی ہے

عاشقِ غیور جی دے اور اس طرف نہ دیکھے

ابھی اور بھی کوئی دم دیکھتے ہیں
اب آنکھوں سے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

کہیں میری بھی آنکھیں ڈبڈبا دیں
حضرت مُبکا کیا نہ کرو رات سے تئیں

مے اگر ثابت ہو مجھ پر واجب التعزیر ہوں
جراحت ہیں اگر وے دونوں تو مرہم ہیں یہ دونوں

پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں
جیسے مستِ شراب ہیں دونوں

دل بھی بدکرتا ہے مجھ سے تو بھلا کرتا نہیں
آنکھوں سے چلی جاتی ہیں دریا کی سی دھاریں

شاید کہ راہِ یار ہی کی خاک دھول ہو
یعنی تمہاری ہم سے وے آنکھیں نہیں رہیں

آنکھیں تاروں نے بہت جھمکائیں
بیاباں میں دکھا مجنوں کو پاؤں کے تلے ملیاں

کہ بہتر ہے عیادت اور انہیں بیمار کہتے ہیں
ملا پاؤں تلے جب تک نہ چشمِ صد غزالاں کو

گر پیرہن میں میرے میرا تمہیں گماں ہو
جن نے دیکھا ہو تجھے محوِ تماشا کیا ہو

جانوں کی آرزو تو آنکھوں کا مدعا تو
کرنے سے یہ ادائیں ہیں مدعا کہ جا تو

اس کو مشکل ہے جو آنکھوں میں حیا رکھتا ہو
تو اس ستم کا میرؔ سزا وار کیوں نہ ہو

جو شخص ہووے آنکھوں سے معذور کیوں نہ ہو
پیتا ہوں رکھ کے آنکھوں پہ جام شراب کو

جو آنکھ میرے خونی کے چہرے پہ باز ہو
کیونکہ چھپے میخوارئ شب جب ایسے رات کے ماتے ہو

وہ آنکھ جو چھپاوے تو تو بھی ٹک کھنچا رہ

جگر لوہو کو ترسے ہے میں سچ کہتا ہوں دل خستہ
مت فریبِ سادگی کھا ان سیہ چشموں کا میرؔ
ترے بن دیکھے میں مکدّر ہوں
دن رات میری آنکھوں سے آنسو چلے گئے
ہستی میں ہم نے آکر آسودگی نہ دیکھی
آنکھیں لڑا لڑا کے کب تک لگا رکھیں گے
اے شمعِ بزمِ عاشق روشن ہے یہ کہ تجھ بن
کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں
رات گزری ہے مجھے نزع میں روتے روتے
کھول کر آنکھ اڑا دید جہاں کا غافل
دیکھا کرو تجھی کو منظور ہے تو یہ ہے
انجام کار بلبل دیکھا ہم اپنی آنکھوں
مند گئی آنکھ ہے اندھیرا پاک
ٹک آنکھ بھی کھولی نہ زخود رفتہ نے اس کے
جاگتا ہے کہیں وہ بھی شب مرتکب مئے ہو
ہوئی سامنے یوں تو ایک ایک کے
گیسو سے اس کے میں نے کیوں آنکھ جا لگائی
آئی پری سی پردۂ مینا سے جام تک
زندگی ہوتی ہے اپنی غم کے مارے دیکھئے
کس طور کوئی ہم کو فریبندہ لبھا لے
میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں
بے خوابی تری آنکھوں میں دیکھوں ہوں گہ بات
اچھا لگا ہے شاید آنکھوں میں یار اپنے
وہ کالا چور ہے خالِ رخِ یار
آنکھوں میں دلبروں کی مطلق نہیں مروت
میں لعینہٖ ویسے جل پردہ گرے ہے عنکبوت
ابھی اک عمر رونا ہے نہ کھو دو اشک آنکھو تم

دلیل اس کی نمایاں ہے مری آنکھیں ہیں خوں بستہ
ان کی آنکھوں سے ٹپکتی ہے بڑی عیارگی
آنکھوں پر اب غبار رہتا ہے
برسات اب کے شہر میں سارے برس رہی
کھلتیں نہ کاش آنکھیں خوابِ خُوش عدم سے
اس پردے ہی میں خوباں ہم کو سُلا رکھیں گے
آنکھوں میں میری عالم تاریک ہو گیا ہے
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا یک بارگی
آنکھیں پھر جائیں گی اب صبح کے ہوتے ہوتے
خواب ہو جائے گا پھر جاگنا سوتے سوتے
آنکھیں نہ کھولوں تجھ بن مقدور ہے تو یہ ہے
آوارہ تھے چمن میں دو چار ٹوٹے پر سے
روشنی ہے سویاں مرے دم سے
ہر چند کیا شور قیامت نے سرہانے
یہ بات سمجھاتی ہے ان آنکھوں کی بیخوابی
ہمیں سے وہ کچھ آنکھ شرما گئی
جو اپنے اپچھے جی کو ایسی بلا لگائی
آنکھوں میں تیری دخترِ رز کیا حیا نہ تھی
موند لیں آنکھیں ادھر سے تم نے پیارے دیکھئے
آخر ہیں تری آنکھوں کے ہم دیکھنے والے
ساری مستی شراب کی سی ہے
افسانہ مرے حال کا مذکور ہوا ہے
آئینہ دیکھ کر کچھ حیران ہو رہا ہے
کہ سو آنکھوں میں دل ہو تو چُرا لے
یہ پاسِ آشنائی منظور کیا رکھیں گے
روتے روتے بسکہ میری آنکھوں میں جالے پڑے
کرو کچھ سوجھتا اپنا تو بہتر ہے کہ دنیا ہے

بھاگنے پر بیٹھے تھے گویا غـزال
نہیں آتے کسو کی آنکھوں میں
پھرتے پھرتے عاقبت آنکھیں ہماری مند گئیں
کب تلک یہ دل صد پارہ نظر میں رکھئے
گردِ رہ اس کی یارب کس اُوسے اُٹھے گی
وہ آنکھیں پھیرے ہی لیتا ہے دیکھتے کیا ہو
مر گیا کوہکن اسی غم میں
باطل السحر دیکھ باطل ہے
کیا سوجھے اسے جس کے ہو یوسف ہی نظر میں
رو و خال وزلف سے ہے سنبل و سبزہ و گل
مر گئے لیکن نہ تُو نے دیکھا اودھر آنکھ اٹھا
سُن کان کھول کر کہ تنک جلد آنکھ کھول
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے

تیری آنکھیں دیکھتے ہی رم چلے
ہو کے عاشق بہت حقیر ہوئے
سو گئے بے ہوش تھے ہم راہ کے مارے ہوئے
اس پر آنکھیں ہی سئے رہتے ہیں دلبر کتنے
سو سو غزال ہر سُو آنکھیں لگا رہا ہے
معاملت ہے ہمیں دل کی بے مروّت سے
آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے
تیری آنکھوں کا سحر آفت ہے
یعقوب بجا آنکھوں سے معذور ہوا ہے
آنکھیں ہوں تو یہ چمن آئینۂ نیرنگ ہے
آہ کیا کیا لوگ ظالم تیرے بیماروں میں تھے
غافل یہ زندگانی فسانہ ہے خواب ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

دیـوانِ دوم

آیا ہے ابر جب کا قبلہ سے تیرا تیرا
مجروح ہے سب سینہ تس پر ہے نمک پاشی
اٹھتا ہے میرے دل سے کبھو جوش سا تو پھر
لڑ گئی آنکھیں اٹھائی دل نے چوٹ
ڈھب دیکھنے کا ایدھر ایسا ہی تھا تمہارا
ملانا آنکھ کا ہر دم فریب تھا دیکھا
آنکھ اس کی نہیں آئینہ کے سامنے ہوتی
آنکھ کے لڑتے تیری آشوب سا برپا ہوا
اس موج خیز دہر میں ہے تو حباب سا
جی کھنچے جاتے ہیں فرطِ شوق سے آنکھوں کی اور
دیکھ بہتی آنکھ میری ہنس کے بولا کل وہ شوخ
در ہی کے تئیں تکتے پتھرا گئیں آنکھیں تو

مستی کے ذوق میں ہیں آنکھیں بہت ہی خیرا
آنکھوں کے لڑانے کا ہم خوب مزا دیکھا
جاتا ہے دونوں آنکھوں سے دریا بہا ہوا
یہ تماشائی عبث گھائل ہوا
جلتے تو ہو پر ہم سے ٹک آنکھ ملا جانا
پھر ایک دم میں وہ بے دید آشنا نہ رہا
حیرت زدہ ہوں یار کی نیں شرو حیا کا
زلف کے درہم ہوئے اک جمع برہم ہو گیا
آنکھیں کھلیں تری تو یہ عالم ہے خواب کا
جن نے دیکھا ایک دم اس کو سو بے دم ہو گیا
یہ نہیں اب تک ہوا منہ کا تہ ہے ناسور کیا
وہ ظالم سنگیں دل کب میرؔ کے گھر آیا

یک بار بھی آنکھ اپنی اس پہ نہ پڑی مرتے
آنکھیں گئیں پھر تجھ بن کیا کیا نہ عزیزوں کی
جن مردماں کو آنکھیں دیا ہے خدا نے وے
آنکھیں جو ہو ویں تیری تو تُو عین کر رکھے
دیکھ اسے کیونکر ملک بھپک نہ ہوں
بلا ہیں قادر انداز اس کی آنکھیں
بلا سے آنکھ جو پڑتی ہے اس کی دس جاگہ
تیغچہ ہاتھ میں مستی سے لہو سی آنکھیں
اس قدر آنکھیں چھپاتا ہے تو اے مغرور کیا
نہ لکھے خط کی نمط ہو گئیں سفید آنکھیں
میرؔ ہم کس ذیل میں دیکھ اس کی آنکھ
مگر آنکھ تیری بھی چپکی کہیں
یاں اپنی آنکھیں پھر گئیں پہ وہ نہ آ پھرا
آنکھ کچھ اپنی ہی اس کے سامنے ہوتی نہیں
وقتِ اخیر کیا یہ ادا تھی کہ غش سے میں
کہتی تھی بے دماغی اِک شورِ ما و من میں
جوں ابر نہ تھم سکتا آنکھوں کا مری جھمکا
تلاطم آنکھ کے صد رنگ رہتے تھے تجھ بن
چمن ہو وے جو انجمن تجھ سے واں
کب کھُبا جاتا تھا یوں آنکھوں میں جیسے صبح تھا
آنکھیں کھلیں تو دیکھا جو کچھ نہ دیکھنا تھا
پھول اس چمن کے دیکھتے کیا کیا گرے ہیں ہائے
اس آفتابِ حسن کے جلووں کی کس کو تاب
کچھ قدر ہیں نہ جانی غفلت سے رفتگاں کی
دیکھیں تو کیا دکھائے یہ افراطِ اشتیاق
کم مجھی سے بولنا کم آنکھ مجھ سے کھولنا
چشمکِ انجم میں اتنی دلکشی آگے نہ تھی

سو مرتبہ بالیں سے ہم سر کو اٹھا دیکھا
پر تو نے مروت سے ٹک ان کو نہ جا دیکھا
سرمہ کرے ہیں راہ میں تری خاک وصول کا
عالم تمام گر وہ نہیں تو یہ سب ہے کیا
آنکھ کے آگے یہ بکتا نور کا
کیا یکہ جنازہ جس کو تاکا
ہمارا حال تو مدنظر نہیں رکھتا
سچ تو نے دیکھ کے اے شوخ حذر ہم سے کیا
ٹک نظر ایدھر نہیں کہ اس سے ہے منظور کیا
تجھے بھی عشق ہے قاصد بھلا شتاب پھرا
ہوش اہلِ قدس کا زائل ہوا
ٹپکتا ہے چتون سے کچھ پیار سا
دیکھا نہ بدگمان ہمارا بھلا پھرا
جن نے وہ خونخوار صبح دیکھی دہل کر رہ گیا
جب آنکھ کھولی بالوں میں منہ کو چھپا لیا
آنکھوں کے مند گئے پر آرام سا تو پایا
جوں برق اگر وہ بھی جھمکی سی دکھا جاتا
کبھو کبھو جو یہ دریائے خوں چڑھا کرتا
لگے آنکھ میں سب کی گل خار سا
پھول خوش رنگ اور اس کے فرش پہ پچھ کر رہا
خوابِ عدم سے ہم کو کلہے کے تئیں جگایا
سیلِ بہار آنکھوں سے میری رواں ہے اب
آنکھیں ادھر کیے سے بھر آتا ہے وہ ہیں آب
آنکھیں سی کھل گئیں اب جب صحبتیں ہوئیں خواب
لگتی ہیں تیری آنکھیں ہمیں پیاریاں بہت
اب عنایت یار کی رہتی ہے کچھ ادھر بہت
سیکھ لی تاروں نے اس کی آنکھ جھمکانے کی طرح

دورِ گردوں سے ہوئی کچھ اور میخانے کی طرح
رہیئے بغیر تیرے اے رشکِ ماہ تاچند
لگی بہت رہیں چاکِ قفس سے آنکھیں لیک
گو دل وصک ہی جاوے آنکھیں ابل ہی آویں
رفتہ رفتہ ہوگئیں آنکھیں مری دو لغش سفید
مت آنکھ ہمیں دیکھ کے یوں مار دیا کر
کیوں آنکھوں میں سُرمے کا تو دنبالہ رکھے ہے
آنکھ اس کی اس طرح سے نہیں پڑتی تک ادھر
آنکھیں لگی رہیں گی برسوں وہیں سبھوں کی
کیا بات تیری اے ہمہ عیاری و فریب
کن آنکھوں دیکھیں رنگِ خزاں کے کہ باغ سے
عاشق کے اس کو گریہ خونیں کا درد کیا
یہ جو دو آنکھ مند گئیں میری
آنکھیں جنھوں کی زلف و رخِ یار سے لگیں
آنکھوں تلے سے سرکی وہ چشمِ مست ٹک تو
ہر چند میں نے سر پہ اس رہ کی خاک ڈالی
جاتی ہیں خط کے پیچھے جوں مہر میری آنکھیں
مجھے نیند کیسی کہ مانندِ انجم
فردوس کو بھی آنکھ اٹھا دیکھتے نہیں
ان آنکھوں کے بیمار ہیں میرؔ ہم
نقشِ پا سے رہی ہیں کھل آنکھیں
رات گزری ہے سب تڑپتے میرؔ
رکھا جس کو آنکھوں میں اک عمر اب
بھری آنکھیں لوہو سے رہنے لگیں
گل پھول سے کب اس بن لگتی ہیں اپنی آنکھیں
گرچہ عالم جلوہ گاہِ یار یوں بھی تھا ولے
وہ گہر آنکھ سے جاوے تو تھمے آنسو میرؔ

بھر نہ آویں کیونکہ آنکھیں میری پیمانے کی طرح
آنکھوں میں یوں ہمارے عالم سیاہ تاچند
پڑا نہ اب کی کوئی پھول گل نظر صیاد
سب اونچ نیچ کی ہے ہموار تیری خاطر
بسکہ نامے کا کیا یاروں کے میں نے انتظار
غمزے ہیں بلا ان کو نہ سنکار دیا کر
مت ہاتھ میں ان مستوں کے تلوار دیا کر
اب خوب دیکھتے ہیں تو چتون کا ڈھب ہے اور
ہوگا قدم کا تیرے جس جا نشاں زمیں پر
آنکھیں کہیں ہیں اور سخن زیرِ لب ہے اور
گل سب چلے ہیں رختِ سفر اپنا بار کر
آنسو نہیں ہے آنکھ سے جس کی گرا ہنوز
اس پہ وا ہوتیں ایک بار اے کاش
وہ دیکھتے نہیں سحر و شام کی طرف
جاتا دکھائی دیوے رنج و خمارِ عاشق
لیکن نہ پہنچیں آنکھیں اس پاؤں کے نشاں تک
اب کارِ شوق میرا پہنچا ہے میرؔ یاں تک
کھلی رہتی ہیں میری آنکھیں سحر تک
کس درجہ سیر چشم ہیں کوئے مبتل کے لوگ
بجا دیکھنے ہم کو آتے ہیں لوگ
کس کی یوں راہ تک رہے ہیں ہم
آنکھ لگ جائے ٹک تو سو لو تم
اسے دیکھ رہتے ہیں حسرت سے ہم
یہ رنگ اپنا دیکھا مروت سے ہم
لائی بہار ہم کو نور آوری چمن میں
آنکھیں جو موندیں عجب عالم نظر آیا ہمیں
اتنا رویا ہوں کہ ہوں تا بہ کمر پانی میں

ہیئت آنکھوں کی نہیں وہ رہی رہتے روتے
اہلِ نظر کسو کو ہوتی ہے مرمیت
گریۂ شب سے بہت آنکھ ڈرے ہے میری
لگ گئے یہ آنکھیں گلے کا ہار ہی رہتی تھیں روز
ان دلبروں کی آنکھ نہیں جائے اعتماد
ان نے تو آنکھیں موند لیاں ہیں ادھر سے واں
عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
دوستی کس سے ہوئی آنکھ کہاں جا کے لڑی
ہے عاشقی کے بیچ ستم دیکھنا ہی لطف
رہی ہیں دیکھ جو تصویر سی ترے منہ کو
لگے تر رہیں گاہ خوں بستہ تھیں
شب آنکھوں سے دریا سا بہتا رہا
یادِ قد میں ترے آنکھوں سے بہے ہیں جوئیں
ہو شرم آنکھ میں تو بھاری جہاز سے ہے
فرش ہیں آنکھیں ہی تیری راہ میں
دم بھر نہ ٹھہرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک پل
یاں آنکھ مندتے دیر نہیں لگتی میری جاں
اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں
مستی ان آنکھوں سے نکلے ہے اگر دیکھو خوب
آنکھوں سے ہوئی خانہ خرابیٔ دل اے کاش
کچھ نہ دیکھا تھا ہم نے پر تو بھی
منتظر اس کی گردِ راہ کے تھے
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
آنکھیں غبار لائیں مری انتظار میں
دیکھ آنکھیں مری نیچی اک مارنا پتھر بھی
کھولتے ہی آنکھیں پھر یاں موندنی ہم کو پڑیں
بتوں سے آنکھ کیوں میں نے لڑائی

اب تو گرداب سے آتے ہیں نظر پانی میں
آنکھوں کے اندھے ہم تو مت رہے حرم میں
پاؤں رکھتے ہی نہیں بارِ دگر پانی میں
اب جگر میں خوں نہیں وے سہرے سے اشک کہاں
جب یہ رہیں تو چاہیئے پیشِ نظر رہیں
ایک آدھ دن میں دیکھئے یاں کیا ہے کیا نہیں
اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں
دشمنی کئے جسے دیکھتے ہی یاروں میں
مر جانا آنکھ موند کے یہ کچھ ہنر نہیں
ہماری آنکھ سے ظاہر ہے یہ کہ حیراں ہیں
ان آنکھوں نے کیا کیا دکھایا ہمیں
انھی نے کنارے لگایا ہمیں
گر کشو باغ میں ہم سرو تلے جاتے ہیں
مت کر کے شوخ چشمی آشوب سا اٹھاؤ
آہ ٹک تو دیکھ چل کر راہ تو
اتنے سے قد پہ تم بھی قیامت شریر ہو
میں کان کھوئے رکھتا ہوں تیرے شتاب ہو
مشکل بنی ہے آن کے صاحب نظروں کو
خلق بدنام عبث کرتی ہے جام مل کو
کر لینے تبھی بند ہم ان دونوں دروں کو
آنکھ میں آئی یہ نہ دنیا کچھ
آنکھوں میں سو غبار سا ہے کچھ
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی
دیکھوں تو گرد کب لے اٹھے اس رہگزار کی
ظاہر میں ستانا بھی پردے میں جتانا بھی
دید کیا کوئی کرے وہ کس قدر مہلت ہوئی
طرف ہے مجھ سے اب ساری خدائی

کہا تھا مَیں نہ دیکھو غیر کی اُور
جھپکی ہے مری آنکھ لبِ لعلِ بُتاں سے
ٹھہری ایک بھی چشمک بسانِ برق آنکھوں میں
جب لب تیرے یاد آتے ہیں آنکھوں سے ہماری
نادیدنی دکھاوے کیونکر نہ عشق ہم کو
لالہ و گل کیوں نہ چھپکے اپنی آنکھوں میں لگیں
عشق آنکھوں کے نیچے کیے کیا میرؔ چھپے ہے
جاناں کی راہ سے آنکھیں جس تس کی لگ رہی ہیں
آنکھ ہر ایک کی دوڑے ہے کھٹک پر تیرے
یہ نہیں مَیں جانتا نسبت ہے کیا آپس میں لیک
ہیں پاؤں اس کے نازک گلِ برگ سے بجا ہے
یہ دونوں چشمے خون سے بھر دوں تو خوب ہے
برسوں گزرے خاک ملتے منہ پر آئینہ کے طور
گرمی سے ابر کا اگر ہنگامہ سرد ہے
مستی میں جا و بیجا مدِ نظر کہاں ہے
تھیں پیش از آشنائی کیا آشنا نگاہیں
گرد جب اٹھتی ہے اک حسرت سے رہ جاتے ہیں دیکھ
مجھے منظور کیا ہے خط و زلف و خالِ خوباں سے
ہے چشمکِ انجم طرف اس ماہ کے اشارہ
وے دن گئے جو پہروں لگی رہتی تھیں آنکھیں
چھپائی ہیں آنکھیں ہی ان نے تو کہیئے
گل ہی کی اور ہم بھی آنکھیں لگا رکھیں گے
برسوں لگی رہے ہیں جب مہر و ماہ کی آنکھیں
پس جائیں یار آنکھ تری سرمہ پر پڑے
دل چاک ہے جاں داغ جگر خوں ہے ہمارا
لختِ دل قطرۂ خوں ٹکڑے جگر ہو ہو کر

سو تم نے آنکھ مجھ سے ہی چھپائی
اس بات کے تئیں جانتی ہے ساری خدائی
کلیجہ جل گیا اے عمر تیری تو شتابی سے
تب ٹکڑے نکلتے ہیں عقیقِ جگری کے
کس فتنۂ زماں سے آنکھ اپنی جا لڑی ہے
دیکھنے والے ہیں ہم تو رنگِ احمر کے ترے
پیدا ہے محبت تری آنکھوں کی تری سے
رفتہ ہیں لوگ سارے ان پاؤں کے نشل کے
پاؤں سے لگ کے تیرے مہندی کو کچھ بھاگ لگے
آنکھیں ہو جاتی ہیں ٹھنڈی اس کے تلوؤں سے ملے
عاشق جو رہگزر ہیں آنکھوں کے تئیں بچھاوے
سیلاب میری آنکھوں سے کب تک رواں رہے
کیا غضب ہے آنکھ اٹھا کر ٹک تو اِدھر دیکھئے
آنکھیں اگر یہی ہیں تو دریا بھی گرد ہے
بے خود ہیں اس کی آنکھیں اس کو خبر کہاں ہے
اب آشنا ہوئے پہ آنکھ آشنا نہیں ہے
وحشیانِ دشت کی آنکھ اس شکار افگن پہ ہے
خدا نے دیکھنے کی لت سی آنکھوں کو لگا دی ہے
دیکھو تو مری آنکھ کہاں جا کے لڑی ہے
اب یاں ہمیں مہلت کوئی دم کوئی گھڑی ہے
وہ ہر بات کا ہم سے پردہ کرے ہے
ایک آدھ دن جو موسم اب کی وفا کرے ہے
تب کوئی ہم سا صاحب! صاحبِ نظر بنے ہے
دل خوں ہو تیرے پاؤں پھر کر حنا لگے
ان آنکھوں سے انواعِ ستم دیکھتے ہیں ہائے
کیا کہوں مَیں کہ مری آنکھوں سے کیا نکلے ہے

دیوانِ سوم

عشق بھی ہم میں ہائے تصرف کیسے کیسے کرتا ہے
آنکھ پڑتی تھی تمہارے منہ پر جب تک چین تھا
آنکھیں دوڑیں خلق جا اودھر گری
میری تیری چاہ منہ دیکھے کی ہے جوں آرسی
جب گل کہے ہے اپنے تئیں یار کے رُوسا
خون ہی آئے گا تو آنکھوں سے
رونے کا جوش ویسے آنکھوں کو ہے بعینہٖ
کل رات رو کے صبح تلک میں رہا گرا
اب کیا کریں کہ آیا آنکھوں میں جی ہمارا
بجلی سی اِک تجلّی آئی تھی آسماں سے
دل میں تو لگی دوں سی بھری چشمے سی آنکھیں
حلقے آنکھوں میں پڑ گئے منہ زرد
یاد آگیا تو بہنے لگیں آنکھیں جُو کی طرح
پڑتی ہے آنکھ ہر دم جا کر صفائے تن پر
دامن صحرا میں کیا وسعت ہے جو دل میں نہیں
مَیں اس کے گردِ رہ کا رہا منتظر بہت
پتھرا گئی ہیں آنکھیں مری نقش پا کے طور
آنکھیں ہماری مند چلی ہیں جس بغیر یاں
پاؤں پڑتا ہے کہیں آنکھیں کہیں
کِس کی آنکھیں پھرے ہیں آنکھوں میں
حیرت زدہ کس کی یہ آنکھ سی لگے ہے
زندگی دو بھر ہوئی ہے میرؔ آخر تا کجا
آنکھیں ملا کے اس سے ٹک دیکھ حالِ دل کا
کہے تو ہمنشیں رنگ تصرف کچھ دکھاؤں میں
سنائے رشکِ بہار آنکھیں اٹھا کے پشتِ پا سے تو

دل کو چاک جگر کو زخمی آنکھوں کو خونبار رکھا
کیا کیا تم نے کہ مجھ بے تاب سے پردہ کیا
اٹھ گیا پردہ کہاں اودھم ہوا
آنکھ پھیری جس گھڑی پھر کا ہے کا ناتہ رہا
تب آنکھوں تلے میری اتر تلے ہے لہو سا
ایک سیلِ بہار نکلے گا
جیسے ہو رود کوئی برسات میں ابلتا
خونبار میری آنکھوں سے کیا جانوں کیا گرا
افسوس پہلے ہم نے ٹک سوچ کر نہ دیکھا
آنکھیں لگا رہے ہیں اہلِ نظر اودھر سب
کیا اپنے تئیں روؤں ادھر آگ اُدھر آب
ہو گئی میرؔ تیری کیا صورت
کچھ آ گئی تھی سروِ چمن میں کسو کی طرح
سو جی گئے تھے صدقے اس شوخ کے بدن پر
موند کر آنکھیں گریباں میں بھی ٹک سر ڈال کر
سو آنکھیں دونوں لائیں مری اک غبار اور
پڑتی نہیں ہے یار کی راہ اس طرف ہنوز
وہ دیکھتا بھی ٹک نہیں آہ اس طرف ہنوز
اس کی مستی دیکھ کر جاتا ہے ہوش
دم بدم ہے مری نظر در پیش
مت بیٹھو آرسی کے ہر لحظہ رو برو تم
دل جگر جلتے رہیں آنکھیں ہماری تر رہیں
دے انگڑیاں جیسی کو اپنے تو ملتیں ہیں
الگ بٹھا جتنا بندوں کو آنکھیں بیعلتی ہیں
ہتھیلی پر اگر سرسوں تمہارے آگے جماؤں میں

ان پاؤں کو آنکھوں سے ہم ملتے رہے جیسا
چلتا ہے ٹک تو دیکھ کے چل پاؤں سے نفس
گہہ مہرباں ہو دور سے گہہ آنکھیں پھیر لیں
نہ روؤں حال پر کیونکر بلا نا آشنا ہے وہ
سُرخ آنکھیں خشم سے کیں ان نے مجھ پر صبح کو
کچھ سوجھ نہیں پڑتی تمہیں بے خبری سے
شب آنکھ مری لگنے نہیں دیتی ہے بلبل
سب میرؔ کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں میں اپنی
میری آنکھوں پہ رکھو پاؤں تو آؤ لیکن
کیا آنکھیں بند کر کے مراقب ہوئے ہو تم
آنکھوں کے آگے رونے سے میرے محیط ہے
آ عاشقوں کی آنکھوں میں ٹک اے بدل رقیب
چاکِ قفس سے آنکھیں لگی کب تلک رہیں
رونے سے تو پھوٹیں آنکھیں دل کو غموں نے خراب کیا
آنکھیں [illegible] بہ ہو چلی ہیں راہ دیکھتے
یاں اعتبار کیجئے جو کچھ وہی ہے ظاہر
کیا مرے طولِ پریشانی کی حیرت ہم نفس
آنکھیں جو ہوں تو عین ہے مقصود ہر جگہ
آنکھوں کا جھڑ برسنے سے ہتھیا کے کم نہیں
ہر لحظہ پھیر لینا آنکھوں کا ہم سے کیا ہے
آبِ حسرت آنکھوں میں اس کی نومیدانہ پھرتا تھا
خاطر اپنی اتنی پریشاں آنکھیں پھرے ہیں اس بن حیراں
یوں ہے کب تک کب سے لعل لب اس کے ہر گھڑی
تسکین دردمندوں کو یارب شتاب دے
کسو سے آنکھ کے ملتے ہی اپنی جاں دے بیٹھے
دل زدہ کو اس کے دیکھا نزع میں
آنکھوں کی کچھ حیا تھی سو موند لیں ادھر سے

افسوس ہے ہاتھوں کو اب ویسا ہی ملتے ہیں
آنکھیں ہی بچھ گئی ہیں تری راہگزار میں
معشوق آفتاب ہیں عشاق ماہ ہیں
کہیں آنکھ اس کو ملتی ہے جو آنکھیں ٹک ہلاؤں میں
دیکھی یہ تاثیرِ شب کی خونچکاں فریاد میں
ٹک ہوش کی آنکھیں کرو باز تو دیکھو
اس مرغ کی بے تابیٔ آواز تو دیکھو
اس خاکِ رہِ عشق کا اعزاز تو دیکھو
رکھتے ہو ایسی جگہ تم تو قدم کاہے کو
جاتے ہیں کعبے کیسے سے چشم وا کرو
ابروں سے جا کہے کوئی پانی پیو تو آؤ
ان منظروں سے بھی ہے بہت دور تک دکھاؤ
اک برگِ گل نسیم ہماری طرف بھی لاؤ
دیکھنے قابل اس کے ہوئے ہیں اب تو یہ ویرانے دو
یارب انھوں کا ہو گا ادھر بھی گزر کبھو
یہ کائنات اپنی آنکھوں میں سب نہیں کچھ
آنکھیں تو دی ہیں خدا نے اس کے لپٹے بال دیکھ
بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ
پل مارتے ہی پیش نظر ہاتھی کا ڈباؤ
منظور رکھئے ٹک تو بارے نباہ کو بھی
میرؔ نے شاید خواہشِ دل کی آج کوئی پھر رخصت کی
تم نے کہا دل چاہیے تو بیٹھو دل کیا جانے کیدھر ہے
چشمہ چشمہ خونِ دل آنکھوں سے جاری کیجیے
دل کو ہمارے چین دے آنکھوں کو خواب دے
نئی یہ رسم ہم جانتے ہیں چھوڑے دل لگانے کی
تھا نمودار آنکھ سے مشتاق ہے
پردہ جو رہ گیا تھا وہ بھی اٹھا دیا ہے

وجہ یہ تھی کہ ترے ساتھ لڑی آنکھ ان کی
تمہارے پاؤں گھر جانے کو عاشق کے نہیں اٹھتے
دیکھنا ہے تو ہے بہم پردہ
اس ماہ بغیر عالم آنکھوں میں سب سیاہ ہے
شب سن کے حال میرا لیتا ہے موند آنکھیں
پڑتی ہیں ایدھر ادھر وہ شوخ آنکھیں ایسی
اس کی آنکھوں کی مستی سے عاشق
گل ہے بہار ہی جو آنکھوں میں ہو نشہ
ہمیں پیتے ہو آنکھیں موند کر لو کہ یہ جنس اپنی
لڑا کر آنکھیں اس اوباش سے پل بھر میں مر گزرا

ہم جو صورت سے تھے آئینہ کی بیزار رہے
تم آؤ تو تمہیں آنکھوں پہ سر پہ اپنے جا دیوے
ہم سے آنکھوں کو کب ملاتا ہے
دیکھیں تو عشق کیا کیا ہم کو سے دکھلاوے
مچلے سے میں کہاں کیا سوتا ہو تو جگاوے
دو ترک مست جیسے ہوں راہ میں بھٹکتے
چاہیے یوں کہ ہوشیار رہے
جاتی ہے فصلِ گل، کہیں ساقی شراب دے
وفا و مہر ہے سو وہ تمہیں بابت دکھلانے کی
حکایت بوالعجب ہے میرؔ جی کے مارے جانے کی

دلیوان چہارم

بات کہے تلوار نکلے آنکھ لڑائے جی مارے
آنکھیں لگی رہتی ہیں اکثر چاکِ قفس سے اسیروں کی
خاک ملامت خاک آنکھوں میں چاک گریباں تا دامن
بکائے شب و روز اب چھوڑ میرؔ
کیا روا دادہ کہیں ہم اپنی گریہ و زارِ محبت کی
زار کیا بیزار کیا اس دل نے کیا آزار کیا
گل رنگ رنگ شاخ پہ نکلا بہار میں
خلافِ وعدہ بہت ہوئے ہو کوئی تو وعدہ وفا کرو اب
جب سے آنکھیں لگی ہیں ہماری نیند نہیں آتی ہے رات
بعدِ مرگ آنکھیں کھلی رہنے سے یہ جانا گیا
آنکھیں جاتی ہیں مندی ضعفِ دلی سے دم بدم
سامنے ہے وہ آئینہ پر آنکھ نہیں کھل سکتی ہے
منتظر تو رہتے رہتے پھر گئیں آنکھیں ندان
کل سے دل کی کل بگڑی ہے جی مارا ہے کل ہو کر
کیا جانیے کہ دل پر گزرے ہے میرؔ کیا کیا

کیونکہ جتاوے اس سے کوئی ربطِ محبت پیماں کا
جھونکا بادِ بہاری کا گلبرگ کوئی یاں لاوے گا
صورت حال اب اپنی اس کے خاطر خواہ بناؤں گا
نواح آنکھوں کا تو درم کر گیا
روتا سا کوئی روئے ہیں ہم آنکھوں سے اک دریا بہا
داغ سے تن گلزار کیا سب آنکھوں کو خونبار کیا
آنکھیں سی کھل گئی ہیں جو مرجھا کے جھڑ گیا
ملا کے آنکھیں دروغ کہنا کہاں تلک کچھ حیا کرو اب
تکتے راہ رہے ہیں دن کو آنکھوں میں جاتی ہے رات
دیکھنے کی اس کو میرے جی میں تھی حسرت بہت
ان دنوں ان کو بھی ایدھر ہی سے ہے غفلت بہت
دل تنگی سے تنگ ہے دم کیا کہیے کیا صورت ہے آج
وہ نہ آیا دیکھنے ہم کو تو بیماری کے بیچ
آج لہو آنکھوں میں آیا درد و غم سے رو رو کر
کرتا ہے بات کوئی آنکھیں لڑا کر کر کر

سخن زن ہوں ہر چند وے مست آنکھیں
دل ہی بِلا جاتا ہے اپنا میرؔ سماں یہ دیکھے سے
راز پوشیٔ عشق ہے منظور
سر سے گیا ہے سایۂ لطف اس کا دیر سے
جب سے لگی ہیں آنکھیں کھلی راہ تکتے ہیں
آنکھیں بدحال سے ٹھہرتیں نہیں
آنکھوں کی دیکھا دیکھی ہرگز دل کو اس سے نہ لگنا تھا
راہ تکتے تکتے اپنی آنکھیں بھی پتھرا چلیں
کیا کیا عجز کیے ہیں لیکن پیش نہیں کچھ جاتا میرؔ
صحبت تھا ایک سمے میں جا سے اپنی نہ جاتے ہم
ایسی متاعِ قلیل کے اوپر چشم نہ کھولیں اہلِ نظر
چاک ہوا دل ٹکڑے جگر ہے لوہو روئیے آنکھوں سے
موقوفِ ظہورِ نور کا جمکا تھا نہیں
کیونکہ اس راہ میں پا رکھیے کہ صاحب نظراں
ملتے ہی آنکھ ملی اس کی تو برہم سب ہے تہہ
وہ نہیں اب کہ فریبوں سے لگا لیتے ہیں
پھرا ہیں صورتِ احوال ہر اک کو دکھاتا یاں
گردِ راہ اس کی دیکھتے اپنے اٹھی نہ حیف
جہاں میں دیر نہیں لگتی آنکھ مندتے میرؔ
پیچ ہم سے کر لیتے ہو جب آتے ہو مجلس میں
کہنے میں بات آتی نہیں ہو سیر خدا کی قدرت کی
رنج دمن نے عشق کے مجھ کو راحت سے مایوس کیا
خواہش دل سے جی کی تاب گئی
راہ اس کی برسوں دیکھی آنکھیں غبار لائیں
دُو ماس سے تو اپنے بجھائیں آگ لگی ہے گلستاں میں
آنکھیں بھر آئیں جی رندھا کہتے سو کیا چپکے سے تھے
آنکھیں مل کر کھولیں ان نے عالم میں آشوب اٹھا

نہیں اعتماد ان کے قول و قسم پر
آنکھیں ملتے ہیں اٹھتے بستر سے دلبر جب سو کر
آنکھیں رو رو کے تر کریں کیونکر
آنکھوں ہی میں پھرے ہے مرے وہ پری ہنوز
سوئے نہیں ساتھ اس کے کبھو پیار سے اب تک
شوقِ دیدارِ یار ہے تا حال
جیسی سزا پہنچاوے کوئی اب اس کے قابل ہے دل
یہ نہ جانا تھا کہ سختی اس قدر دیکھیں گے ہم
سر رگڑے ہیں آنکھیں ملے ہیں اس کے حنائی پا سے ہم
کس کس ناز سے وے آتے پر آنکھ نہ ان سے ملاتے ہم
آنکھ میں جو کچھ ہو وے ظاہر دنیا اتنی مال نہیں
عشق نے کیا کیا ظلم دکھائے دس دن کے اس جینے میں
چمکا جہاں تو برق سی آنکھیں جھپک گئیں
یاں سے بے داں تئیں آنکھیں ہی بچھا دیتے ہیں
خاک میں آپ کو فی الفور ملا دیتے ہیں
ہم جو دیکھے ہیں تو وہ آنکھ چھپا لیتے ہیں
مروت قحط ہے آنکھیں نہیں کوئی ملاتا یاں
اب منتظر ہو آنکھیں مندیں یعنی تھک گئیں
تمہیں تو چاہیے ہر کام میں شتاب کرو
آنکھیں سب سے ملاتے ہو کچھ ہم سے ہی شرماتے ہو
مونڈ کر آنکھیں میرؔ اگر تو دل کی طرف ٹک دھیان کرے
دل کے تئیں بے تابی ہے مری آنکھوں کو بیخوابی ہے
آنکھیں اس سے لگیں سو خواب گئی
نکلا نہ کام اپنا اس انتظار سے بھی
آنکھیں نہیں پڑتی ہیں گل پر سنکتی ہیں انگاروں سے
جی چاہتا مطلق نہ تھا ناچار ہم رخصت ہوئے
بال کھلے دکھلائی دیا سو ہر کوئی سودائی ہے

گرچہ نظر ہے پشتِ پا پر لیکن قہر قیامت ہے
آنکھوں کی خونابہ فشانی دیکھیں میر کہاں تک یہ
شورِ جرس شبگیر کا غافل تیاری کا تکیہ ہے
آگے ایسا ایسا بکھرا کا ہے کو مَیں پھرتا تھا
فرصت ہے یاں کم ہنسنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی
جُوئے خون آنکھوں سے بہے شاید
غنچہ ہو شرم سے ان آنکھوں کے

گڑ جاتی ہے دل میں ہمارے آنکھ اس کی شرمائی ہوئی
زرد ہمارے رخساروں پر ہر دم خون بہا جاوے
یعنی آنکھ نہ لگنے پاوے قافلہ صبح کو چلتا ہے
جب سے آنکھ لگی اس مہہ سے رنگ مرا مہتابی ہے
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانہ ہے
حُسن سے میرے بھی وے در گزرے
گل۔ نرگس اگر نظر گزرے

دیوانِ پنجم

نزع میں میرے حاضر تھا پر آنکھ نہ اید ھر اس کی پڑی
میرؔ اس کی آنکھیں دیکھیں ہم نے سفر کو جاتے
حالت ہے یاں نزع کی آخر کو جاتے ہیں ہم
آنکھیں موندے یہ دلبر جو سوتے رہیں تو بہتر ہے
پھرتے پھرتے اس کیلئے مَیں آخر دشت نورد ہوا
پاؤں حنائی اس کیلئے آنکھوں پر اپنے ہم نہ رکھے
ایک نہ خواہش بر آئی تا جی کا غبار نکل جاتا
عالم کے لوگوں کا ہے تصویر کا سا عالم
آگ ہوا کے تے ہی میرے لال آنکھیں کر گھور رہا
برسوں ہوئے اب ہم لوگوں سے آنکھ انھوں کی نہیں ملتی
سو غیروں میں ہو عاشق تو ایک اسی سے شرما دیں
آنکھیں اس کی لال ہوئی ہیں اور چلے جلتے ہیں سر
خوب جو آنکھیں کھول کے دیکھا شاخِ گل پہ نظر آیا
راہ چلو تم اپنی اپنی میرے طریق سے کیا تم کو
نادیدہ ہیں نامِ خدا کے ایسے ایسے قحط زدہ
کیا دیکھتا ہے ہر گھڑی اپنی ہی سج کو شوخ
تڑپے ہے غمزدہ دل لاوے کا تاب کیونکر
آنکھ لگے اک مدت گزری پائے عشق جو بیچ میں ہے

داغ چلا ہم اس میں جہاں سے یار کی بے پروائی کا
عینِ بلا ہوا ہے سو اب وطن ہمارا
آنکھوں میں منتظر ہے دم واپسیں ہمارا
چشمک کرنا ایک انھوں کا سو سو فتنے اٹھاوے گا
دیکھ آنکھیں وہ سُرمہ آگیں پھر دنبالہ گرد ہوا
یہ نہ دیکھا رنگِ کفک پر ہنگامہ برپا ہو گا
کاش کے آہو چشم اپنے آنکھوں کو پاؤں سے مل جاتا
ظاہر کھلی ہیں آنکھیں لیکن ہیں بے خبر سب
کیا جانوں سرگوشی میں کیا غیر نے اس کو لگائی بات
برسوں تک آپس میں رہا ہے اپنے جنھوں کے پیار بہت
اس مستی میں آنکھیں اس کی رہتی ہیں ہشیار بہت
رات کو دارو پی سویا تھا اس کا صبح خمار ہے آج
ان رنگوں پھولوں میں طاکچہ محوِ جلوۂ یار ہے آج
آنکھوں سے سجدہ میں نے کیا ہے ان پاؤں کے نشانوں پر
دوڑتی ہیں کیا آنکھیں اپنی سبحہ کے دانے دانے پر
آنکھوں میں جان آئی ہے ادھر نگاہ کر
خوں بستہ ہیں گی آنکھیں آوے گا خواب کیونکر
ملتے ہیں معشوق اگر تو ملتے ہیں شرمائے ہنوز

مدت سے لگ رہی ہیں مری آنکھیں اس کی اور
کب سے آئے کہتے ہیں تشریف نہیں لاتے ہیں ہنوز
میر کی آنکھیں مندنے پر وہ دیکھنے آیا تھا ظالم
آنکھ کھلتے گئی بہار افسوس
راہ تکتے تو پھٹ گئی آنکھیں
تب کھلی میر آنکھ اپنی جب
وہ محبوب تو راہ گیا ہے اپنی لیکن دیر تلک
کیا نیچی آنکھوں دیکھو ہو تلوار کی طرف
صحرا کو جیسا کشادہ دامن ہم تم سنتے آئے ہیں
بے پردہ اس کی آنکھیں شوخی جو کرتیاں ہیں
فاش نہ کیجئے رازِ محبت جاتیں اس میں جاتی ہیں
سو تو سنی نہ تم نے ہماری آنکھیں لگو تھیں لگ پٹیاں
شاید شبِ مستی میں تمہاری گرم ہوئی تھیں آنکھیں کہیں
ہوا ہی کو دیکھے ہیں اے میر اسیراں
دیکھی تھیں ایک روز تیری مست انکھڑیاں
ساری رات آنکھوں کے آگے ہی مرے رہتا ہے
یہ بھی سماں خوش ترکیبوں کا میر نہ اپنے جی سے گیا
عشق نے ہم کو مار رکھا ہے جی میں اپنے تاب نہیں
آنکھیں سفید دل بھی جلا انتظار میں
دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی کہیے تو جی مارے ہیں
آنکھیں کھولیں حال کے کہتے دیر ہوئی ہے بس یعنی
صوفیاں خم وا ہوئے ہیں ہائے آنکھیں وا کرد
وہ لحظہ نہیں جاتا جی سے آنکھ لڑی تھی جب اس سے
آنکھیں ملا کبھو تو کب تک کیا کروں میں
جل سیر کرتے تو بھی تا صبح آنکھیں کھولیں
تھا عکس اس کے قامتِ دلکش کا باغ میں
آنکھوں کو تیری عین کیا سب نے دیدنی

وہ دیکھتا نہیں ہے غلط کر ادھر ہنوز
آنکھیں مندیں اب جا چکے ہم وے دیکھو تو آتے ہیں ہنوز
اور بھی یہ بیمارِ محبت تک نہ جیا افسوس افسوس
گل کو دیکھا بھی نہ ہزار افسوس
اس کا کرتے نہ انتظار اے کاش
جا چکا کارواں دریغ دریغ
آنکھیں اہلِ نظر کی رہیں گی اس کے قدم کے نشاں کی طرف
دیکھو کن انکھیوں ہی سے گنہگار کی طرف
بند کر آنکھیں ٹک دیکھو تو ویسا ہی صحرا ہے دل
کرتا ہے یہ بھی ترکِ شرم و حجاب اب دل
دردِ دل آنکھوں سے ہر اک کے تا مقدور چھپاؤ تم
رو رو کر سر دھنتے ہو اب بیٹھے رنج اٹھاؤ تم
پیش از صبح جو آئے ہو تو آئے رات نے ملتے تم
لگا دیں ہیں عمر آنکھیں چاکِ قفس میں
انگڑائیں ہی لیتے ہیں اب تک خمار میں
گو کر دے چاند سے ٹکڑے کو چھپا بیٹھے ہیں
سوتے سے اٹھ کر آنکھیں ملے ہیں لے انگڑائی جاہیں ہیں
دل کو خیال صبر نہیں آنکھوں کو میل خواب نہیں
کیا کچھ نہ ہم بھی دیکھ چکے ہجرِ یار میں
رک کر پھوٹ نہیں جو آنکھیں وہ کی سی دودھاریں ہیں
ساری رات کہانی کہی ہے میر اب چل کے سوتے ہیں
ابر آیا زور، غیرت تم بھی ٹک پیدا کرو
چاہ نکلتی تھی باتوں سے چتون بھی تھی پیار کے ساتھ
دنبالہ گردی تیری اے آہوئے رمیدہ
منہ پر ترے چمن میں گل ہائے نو دمیدہ
آنکھیں چلی گئی ہیں لگی آبجو کے ساتھ
تو سب سے ٹک تو پھیرے آنکھوں کو یار دیکھ

آنکھیں ادھر سے موندلی ہیں اب تو شرط ہے
آنکھوں میں آشنا تھا مگر دیکھا تھا کہیں
وحش اور طیر آنکھیں ہر سُو لگا رہے ہیں
دامن بہت وسیع ہے آنکھوں کا اے سحاب
ہم تو عشق میں ناکس ٹھہرے کوئی نہ ایدھر دیکھے گا

پھر دیکھیو نہ میری طرف ایک بار دیکھ
لوگل کل ایک دیکھا ہے میں نے حیا کے ساتھ
گردِ رہ اس کی دیکھیں اٹھ چلتی ہے کدھر سے
لازم ہے تجھ کو ان ہی کا پانی بھرا کرے
آنکھ اٹھا کر وہ دیکھے تو یہ بھی اس کی مروت ہے

بقیہ دیوانِ چہارم

اشکِ تو میدانہ پھرتے ہیں مری آنکھوں کے بیچ
خشکی لب کی سُرخ کی زردی نماکی دو آنکھوں کی
اس غصیلے کی سرخ آنکھیں دیکھ
دلِ چشم شور چسرخ سے گل پھول اک طرف
کشتہ ہوں اس حیا کا کٹوائے بہتوں کے سر
آنکھیں جو کھولیں سحتے سے تو حال کے کہتے مجھ کو کہا
مدت ہوئی کہ دیکھا تھا سیرِ چمن میں میرؔ
دیر دریا کنارا کرتا رہا
شوخ چشمی تری پردے میں ہے جب تک تب تک
اس کے گردِ سمند کا مشتاق
کم نہیں ہے سحر سے یہ بھی تصرّف عشق کا
آنکھیں غصّے سے ہو گئی ہیں لال
اوّل تو آتے ہی نہیں ہو اور کبھو جو آتے ہو
ٹھنڈے ہوتے نہ دیکھے ہرگز ویسے ہی جلتے رہتے ہیں
وے دن جی کو سلتے ہیں جو آکر سوتے پانے کبھو
آنکھوں میں ہم کسُو کی نہ آئے جہان میں
آنکھ مستی میں کسُو پر نہیں پڑتی اس کی
راہ تکتے ہی بیٹھے ہیں آنکھیں
ہم سے یہ انداز ادبا شانہ کرنا کیا منزد

میرؔ یہ ڈُرے ہے دکھائی جان کی رخصت ہے اب
جو دیکھے ہے کہے ہے ان نے کھینچے ہیں آزار بہت
اُٹھے آشوب خانقاہ کے بیچ
آنکھ اس دَنی کی دو دڑے ہے اک برگِ کاہ پر
پر آنکھیں اس کی دُو ہیں تھیں پشتِ پا کے اُوپر
ساری رات کہانی کہی ہے تو بھی اٹھ کے سوئے ٹک
پھر تلے ہے اب تلک مری آنکھوں میں روئے گل
عشق میں آنکھیں اپنی زور بہیں
ہم نظر باز بھی آنکھوں کی حیا کرتے ہیں
آنکھیں ہر سُو لگا رہا ہوں میں
پانی کر آنکھوں میں لایا دل کے خونِ ناب کو
سر کو چھاتی پہ رکھ کے خواب کرد
نیچی آنکھیں کیے پھرتے ہو مجلس میں شرمائے سے
تلوے خالی ہم تے اس کے آنکھوں سے سہلائے بھی
آنکھوں سے ہم سہلا سہلا تلوے اس کو جگاتے تھے
از بسکہ میرؔ عشق سے خشک و حقیر تھے
یہ بھی اس سادہ دُپرکار کی ہشیاری ہے
اس کا جب انتظار ہوتا ہے
آنکھ ٹیڑھی ، خم ہے ابرو ، طور کچھ بگڑا ہے

دیوانِ ششم

وہ دیکھنے ہمیں ٹک بیماری میں نہ آیا
آنکھیں مری لگو ہیں بے جا نہیں لگی ہیں
گردِ راہ اس کی اب اٹھو نہ اٹھو
رہیں جو منتظر آنکھیں غبار لائیں وے
چلا تو تھا وہ بخواہشِ دل مزا بھی پاتے ملے سے لیکن
سوکھی پڑی ہیں آنکھیں مری دیر سے جواَب
جھپکی ہیں آنکھیں اور جھپکی آتی ہیں بہت
ملتی نہیں ہے آنکھ اس آئینہ رو کی میر
کہتے تھے ہم کو اس کو دیکھا کرو نہ اتنا
آنکھ لگی ہے جب سے اس سے آنکھ لگے زنہار
وہ سنگدل نہ آیا بہت دیکھی اس کی راہ
کھووے ہے آنکھ اس کی گل رو پہ ہر سحر
ٹوٹتیں پھوٹتیں نہ کاشش آنکھیں
پڑتی ہیں اس کی آنکھیں چاروں طرف نشے میں
آنکھ کھلتے ہی وے تو گھر کو گئے
کچھ طریقت نہ تھی ان آنکھوں میں
تکھوں ہوں ایک سائیں گردِ راہ کو اس کی
اس نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے
چلا ہے وہ تو دیکھ کے لیتا ہے آنکھیں موند
یہ وہم ہے کہ آنکھیں مری لگ گئیں کہیں
کیا گھورتے ہو ہر دم ڈرتے نہیں ہیں کچھ ہم
ضعف سے آنکھیں مندیں کھل نہ گئیں پھر شتاب
آنکھیں تو پتھرا گئیں تکتے ہوئے اس کی راہ
جس آنکھ سے دیا تھا ان نے فریب دل کو
ٹک دل میں آؤ آنکھوں سے ہے دید کی جگہ

سو بار آنکھیں کھولیں بالیں سے سر اٹھایا
دیکھا ہے جن نے ان کو ان نے مجھے سراہا
میری آنکھوں ہی پر غبار آیا
وہ انتظار کشوں کو نہ ٹک نظر آیا
پھریں جو مستی میں اس کی آنکھیں سو ہوش ہم کو رہا نہ اپنا
سیلاب ان ہی رخنوں سے مدت رواں رہا
نزدیک شاید آیا ہے ہنگامِ خواب اب
وہ دل جو لے کے جاوے مگر تو ہے کیا عجب
دل خوں کیا نہ اپنا آنکھیں لڑا لڑا کر
نیند آتی ہے دل جمعی میں سو تو دل کو قرار نہیں
پتھرا چلی ہیں آنکھیں میری انتظار میں
غالب کہ میرے آئینے کی اب صفا نہ ہو
انہی رخنوں سے کرتے نظارہ
جوں راہ میں بہکتے ہوں دو ترکِ مست بادہ
ہم ستم دیدہ خانماں سے گئے
دیکھ کر کیا یہ آشنائی کی
نہ کیونکہ وہ لخں مری آنکھوں میں غبار رہے
گلگشت کو جو آئیے آنکھوں پہ آئیے
سوتا پڑا ہو کوئی تو اس کو جگائیے
تم مار ڈالیو نہ مجھے اس گمان سے
جن آنکھوں کے ہیں عاشق ان آنکھوں کے دکھائے
غش یہ ہمیں اب کی بار دیکھئے کب تک رہے
شام و سحر انتظار دیکھئے کب تک رہے
اس آنکھ کو جو دیکھو اب آشنا نہیں ہے
بہتر نہیں مکان کوئی اس مکان سے

ملا اب تو وہ نہ ملتا تھا اس کا
اے مایۂ زندگی ستم ہے یہ اگر
روشنی آنکھوں کی بنے منظور ساری خلق کو
دلکش قد اس کا آنکھوں تلے ہی پھرا کیا
آنکھ ملاتا نہیں ان دنوں وہ شوخ ٹک
گیسو و رخسارِ یار آنکھوں ہی میں پھرتے ہیں

نہ ہم سے دیر آنکھ اس کی ملا کی
بھر آنکھ تجھے نہ دیکھیں مرتے مرتے
قوتِ دل کا جدھر دیکھو تمھر مذکور ہے
صورت گئی نہ اس کی ہمارے دھیان سے
بے مزہ ہے ہم سے یار دیکھئے کب تک رہے
میرؔ یہ لیل و نہار دیکھئے کب تک رہے

چشم

دلیوانِ اوّل

چشم و دل سے جو نکلا ہجراں میں
نکلے ہے چشمہ جو کوئی جوش زناں پانی کا
فیض اے ابرِ چشمِ تر سے اٹھا
یک چشم منتظر ہے کہ دیکھے ہے کب سے راہ
باندھ مت رونے کا تار اے تاقیامت تھم چشم
چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
گھر چشم کا ڈبو مت دل کے گئے پہ رو رو
اس کا خیال چشم سے شب خواب لے گیا
اے ہم سفر نہ کیلے کو پہنچے چشمِ تر
ہونا نہ چار چشم دل اس ظلم پیشہ سے
چاک دل پر ہیں چشمِ صد خوباں
کچھ بھی معاش ہے یہ کی ان نے ایک چشمک
کی چشم تو نے باز کہ کھولا درِ ستم
ہم نے جو کچھ اس سے دیکھا سو خلافِ چشم داشت
پھوڑا تھا سر تو ہم نے بھی پر اس کو کیا کریں
خاک پر بھی دوڑتی ہے چشمِ مہر و ماہِ چرخ

نہ کبھو بحر و کان سے نکلا
یاد وہ ہے وہ کسو چشم کی گریانی کا
آج دامن وسیع ہے اس کا
جوں زخم تیری دوری میں ناسور ہوگیا
اس سے پایا جائے ہے سر رشتہ جی کی چاہ کا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور ہوگیا
کیا میرؔ ہاتھ سے تو یہ بھی مکان دے گا
قصے کہ عشق جی سے مرے تاب لے گیا
لاگ ہے میرے پاؤں میں آ خار دیکھنا
ہُشیار زینہار خبردار دیکھنا
کیا کروں اک انار و صد بیمار
جب مدتوں ہمارا جی دیکھنے کو ترسا
کس مدعئ خلق نے تجھ کو جگا دیا
اپنا عزرائیل وہ جانِ مجسم ہوگیا
جو چشمِ روزگار میں فرہاد آگیا
کس کج الطبع کے گھر جا کے میں مہماں ہوا

پھول نرگس کا لیے بیچک کھڑا تھا راہ میں
بالقوہ کچھ دکھائیے چشمِ پُرآب کا

ایک دو ہوں تو سحرِ چشم کہوں
جو خار دشت میں ہے وہ چشمِ آبلہ ہے

کیا میرؔ ہے یہی جو ترے دَر پہ تھا کھڑا
موند رکھنا چشم کا ہستی میں عینِ دید ہے

آہو کو اس کی چشمِ سخن گو سے مت ملا
ہونا ہی بھلا تھا سامنے اس چشمِ گریاں کے

دیکھیں جدھر وہ رشکِ پری پیشِ چشم ہے
دیکھو نہ چشمِ کم سے معمورۂ جہاں کو

یک قطرۂ آب مَیں نے اس دَور میں پیا ہے
اے ابرِ خوش مغز سمندر کا منہ نہ دیکھ

یاں جہاں میں کہ شہرِ کوراں ہے
سال میں ابرِ بہاری تجھ سے اَک باری ہے فیض

نہ سمجھ گیا ابر کیا دیکھ کر
ڈوبیں دریا و کوہ و دشت و شہر

مقدور تک شراب سے رکھ انکھڑیوں میں رنگ
کیا کہوں کیا رکھتے تھے تجھ سے ترے بیمارِ چشم

جرم کیا غیروں کا طالع چشم پوشی کرتے ہیں
روز و شب واں ہنے سے پیدا ہے میرؔ آثارِ شوق

خورشید صبح نکلے ہے اس نور سے کہ تُو
تھی چشم داشت مجھ کو اے دلبراں یہ تم سے

قیامت ہی یاں چشم و دل سے رہی
نہ دیکھے جہاں کوئی آنکھوں کی اُور

تیکھے بھی تم نے ٹھہرتے کہیں دیکھے ہیں تنک
قصہ مرا سُنو گے تو جاتی رہے گی نیند

سُرمہ آلودہ مت رکھا کر چشم
کس کی چشمِ پُر فسوں نے میرؔ کو جادو کیا

دامن پکڑ کسے رو ئیے یک دم سحاب کا
کارخانہ ہے واں تو جادُو کا

دیکھا ہوا ہے تیرے محنت کشیدگاں کا
نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے حباب
شہری سے کر سکے ہے کہیں بھی گنوار بات

نظارے ابرِ تر آپھی نہ آوے گا برس بہتر
حیران رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھ کر

بنتا ہے ایک گھڑیاں سو صورتیں بگڑ کر
نکلا ہے چشمِ تر سے وہ خونِ ناب ہو کر

سیراب تیرے ہونے کو کافی ہے چشمِ تر
سات پَردے ہیں چشمِ بینا پر

چشمِ نمدیدہ سے عاشق کو سدا جاری ہے فیض
ہوا تھا مری چشمِ تر کی طرف

تجھ سے سب کچھ ہے چشمِ تر نزدیک
یہ چشمکِ پیالہ ہے ساقی ہوائے گل

تجھ کو بالیں پر نہ دیکھا کھول سو سو بار چشم
دیکھ کر احوال میرؔ موندلے ہے یار چشم

یہ کشو نظارگی کا رخنۂ دیوار چشم
شبنم گرہ میں رکھتی ہے یہ چشمِ تر کہ ہم

دل کو مرے اٹھا کر آنکھوں میں گھر کرو تم
ق چلے بس تو واں جاکے کریے قیام

نہ لیوے کوئی جس جگہ دل کا نام
چشم دغا رکھو نہ خسانِ جہاں سے تم

آرام چشم مت رکھو اس داستاں سے تم
دیکھ اس وضع سے خفا ہیں ہم

چشم و دل و جگر یہ سارے ہوئے پریشاں
نہیں تجھ کو چشمِ عبرت یہ نمود میں ہیں ورنہ
سو بار ہم نے گُل کے کہے پر چمن کے بیچ
کھلی آنکھیں نیں جو دیکھا سو غم اور چشمِ گریاں
غمزۂ چشمِ خوش قدانِ زمین
جوں نقش کی اس کی چاہ کا پردہ کیا ہے مَیں
چشم تو ہے اِک دید کی جا پر کیے تکلیف کے لائق ہے
مجھے گر چشمِ عبرت ہے تو آندھی اور بگولے سے
نہ سی چشمِ طمع خوانِ فلک پر خام دستی سے
یک جا نہ دیکھی آنکھوں سے ایسی تمام راہ
میری ہی چشمِ تر کی کرامات ہے یہ سب
شوق کا کام کھنچا دور کہ اب مہر مثال
اب کی برسات ہی کے ذمے تھا عالم کا وبال
طاعت کا وقت گذرا مستی میں آبِ زر کی
اگر چشم ہے تو وہی عینِ حق ہے
چشمِ دل کھول اس بھی عالم پر
میرؔ مَیں جیتوں میں آؤں گا اسی دن جس دن
سوزش گئی نہ دل کی رونے سے روز و شب کے
لختِ دل کب تک الٰہی چشم سے ٹپکا کریں
کٹے ہے دیکھئے یوں عمر کب تلک اپنی
کام اس کا ہے خوں افشانی ہر دم تیری فرقت میں
نہ دیکھا کہ لوہو تھما ہو کبھو
چشم بد دُور چشمِ تر اے میرؔ
باغ نظر ہے چشم کی منظر کا سب یہاں
ٹپکا کرے ہے آنکھ سے لوہو ہی روز و شب
کوئی ہوا نہ روکش ٹک میرؔ چشمِ تر سے
مت ابر چشم کم سے مری چشمِ تر کو دیکھ

کس کس کی تیرے غم میں حالت تباہ دیکھوں
کہ گئے ہیں خاک میں مِل کئی تجھ سے تاجدار
بھر دی ہیں آبِ چشم سے پالتوں کو کیاریاں
کسے کہتے ہیں نہ جانا دلِ شاد و روئے خنداں
فتنۂ آسماں ہوتے ہیں
اے چشم گریہ ناک نہ افشائے راز ہو
دل جو ہے دلچسپ مکاں تم اس میں کب کب آتے ہو
تماشا کر غبار افشانیٔ چشمِ عزیزاں کو
کہ جامِ خوں دے ہے ہر سحر یہ اپنے مہماں کو
جس میں بجائے نقشِ قدم چشمِ تر نہ ہو
پھرتا تھا ورنہ ابر تو محتاج آب کو
چشمِ مشتاق لگی جائے ہے طومار کے ساتھ
مَیں تو کھائی تھی قسم چشم کے تر کرنے کی
اب چشم داشت اس کے یاں ہے فقط کرم سے
تعجب تجھے ہے عجب ماسوا سے
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
دل نہ تڑپے گا مرا چشم نہ بھر آوے گی
جیتا ہوں اور دریا بہتے ہیں چشمِ نم سے
خاک میں تا چند لیسے لعل پارے دیکھئے
کہ سُنیے نام تھا اور چشم تر کر لیجے
چشم کو میری اگر دیکھ اب لوہو کا فوارہ ہے
مگر چشم خونبار ناسور ہے
آنکھ طوفان کر دکھاتی ہے
ٹک ٹھہر دیاں تو جانو کہ کیسا دکھاؤ ہے
چہرے پہ میرے چشم ہے یا کوئی گھاؤ ہے
کیا کیا نہ ابر آ کر یاں روز روز برسے
چشمہ یہ ہے وہ جس سے کہ دریا ابل سکے

گوشۂ چشمِ بتاں یا کنجِ لب اس وقت میں
جا کہیں ہو تو دل اپنے کا ٹھکانا کیجئے

ہنگامِ جلوہ اس کے مشکل ہے ٹھہرے رہنا
چتون ہے دل کی آفت چشمک بلائے جاں ہے

سی چاکِ دل کہ چشم سے ناصح لہو تھمے
ہوتا ہے کیا ہمارے گریباں سئے ہوئے

بقیہ دیوان اوّل

گرمی اس آتش کے پرکالے سے رکھے چشم تب
جب کوئی میری طرح سے دلوے سب تن من جلا

کرسے ہیں دعوائے خوش چشمی آہوانِ دشت
ٹک ایک دیکھئے چل ملک ان گنواروں کا

خانہ خراب کس کا کیا تیری چشم نے
تھا کون یوں جسے تو نصیب ایک دم ہوا

افسوس کی بھی چشم تھی ان سے خلافِ عقل
بارِ علاقہ تو عبث پشتِ خم ہوا

کیا جانئے بزمِ عیش کو ساقی کی چشم دیکھ
میں صحبتِ شراب سے آگے سفر کیا

شاید کہ مند گئی ہے قمری کی چشمِ گریاں
کچھ ٹوٹ سا چلا ہے پانی چمن کے جو کا

رات اس کی چشمِ میگوں خواب میں دیکھی تھی میں
صبح سوتے سے اٹھا تو سامنے پیمانہ تھا

بے چشمِ نم رسیدہ پانی چوانے کوئی
وقتِ اخیر اس کے بیمار تک نہ پہنچا

ایک چشمک دو صد سنانِ مژہ
اس بنکیلے کا بانکپن دیکھا

شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب
کسی عنوان میں ہم چشمِ عزیزاں نہ ہوا

کیا کہئے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا
ان چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا

چشمک نہیں ہے تارے یہ شیوے اسی کے ہیں
جھمکے سے دکھاوے کر عالم کو لگا رکھا

کس کی مسجد کیسے بتخانے کہاں کے شیخ و شاب
ایک گردش میں تری چشمِ سیاہ کے سب خراب

کرنے لگا پشت چشم نازک
سوتے سے اٹھا جو چونک کر رات

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

طالع نے چشم پوشی کی یاں تک کہ ہمنشیں
چھپتا ہے مجھ کو [illegible] اب یار دیکھ کر

بلبل کی اُور چشمِ مروت سے دیکھ ٹک
بے درد یوں چمن میں گُل پھول کو نہ توڑ

یہ ترک ہو کے خشن کج اگر کلاہ کریں
تو بوالہوس نہ کبھو چشم کو سیاہ کریں

بختِ سیہ تو دیکھو ہم خاک میں ملے
سرمے کی جا ہوتے تری چشمِ سیاہ میں

ایک بھی چشمک نہ اس مہ کی سی کی
آنکھیں تاروں نے بہت جھمکائیں

نگاہ چشمِ پُرخشم بتاں پر مت نظر رکھنا
ملا ہے زہر اے دل اس شرابِ پرتگالی میں

حیلے نہیں پشتِ پا پر وہ چشم
مرا حال مدِنظر کچھ نہیں!

غرورِ ناز سے آنکھیں نہ کھولیں اس جفا جُو نے
بہت روئے جو یہ آستیں رکھ منہ پہ اسے بکلی
جس چشم سیلی زمندی آوے گی نظر
ٹک چشم میں بھی سُرمہ کا دنبالہ کھینچیے
جھک گیا دیکھ کے مَیں میرؔ اسے مجلس میں
آہ مت پوچھ ستم گار کہ تجھ سے تھی ہمیں
گل و آئینہ ماہ و خور کن نے
لڑتی ہے اس کی چشم شوخ جہل
ٹک اے مدعی چشمِ انصاف وا کر
دیکھئے ابر کی طرح اب کے
مرگئے پر بھی ہے صولت فقر کی
رہنمائی شیخ سے مت چشم رکھ
کیفیتِ چشماں اب معلوم ہوئی اس کی
دُور مَیں چشمِ مست کے تیرے
وہ آشنائے لطف حقیقت کے بحر کا

ملا پاؤں تلے جب تک نہ چشمِ صد غزالاں کو
نہ چشمِ کم سے دیکھ اس یادگارِ چشمِ گریاں کو
جو آنکھ میرے خونی کے چہرے پہ باز ہو
اس مست کے بھی ہاتھ میں تلوار ایک دو
چشمِ بد دور طرحدار جواں ہے شیشہ
چشمِ لطف و کرم و مہر و وفا کیا کیا کچھ
چشم اس چہرہ پہ سیاہ نہ کی
ایک آشوب واں سے اٹھتا ہے
کہ بیٹھے ہیں یہ قلعے کس ادا سے
میری چشمِ پُر آب کی سی ہے
چشمِ شیر اپنا چراغِ گور ہے
وائے وہ جس کا عصاکش کور ہے
یہ مست ہیں دو خوتی ہشیار رہا کیجئے
فتنہ بھی ہوشیار رہتا ہے
ہے رشکِ زلف و چشم جو موج حباب ہے

دیوانِ دوم

دل کی آبادی کو پہنچا اپنے گویا چشمِ زخم
عشق نے کیا کیا تصرف یاں کیے ہیں آجکل
دامن وسیع تھا تو کاہے کو چشم ترسا
اب آب چشم ہی ہے ہمارا محیطِ خلق
چشم بہنے سے کبھو رہتی نہیں
مروت چشم رکھنا سادگی ہے
غلط ہے دعوۂ عشق اس فضول کا بے ریب
رہیں بند میری آنکھیں شب و روز ضعف ہی میں
تھی چشم دمِ آخر وہ دیکھنے آوے گا
آئینے کو بھی دیکھو پر ٹک ادھر بھی دیکھو

دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر سب ویراں ہوا
چشم کو پانی کیا سب دل کو سب لوہو کیا
رحمت خدا کی تجھ کو اے ابر زور برسا
دریا کو ہم نے کب کا کنارے رکھا لگا
کچھ علاج اے میرؔ اس ناسور کا
نہیں شیوہ یہ اپنے آشنا کا
جو کوئی خشک لب و چشم تر نہیں رکھتا
نہ ہوا مجھے میسّر کبھو چشم باز کرنا
سو آنکھوں میں جی آیا پر وہ نہ نظر آیا
حیرانِ چشمِ عاشق دیکھے ہے جیسے ہیرا

زلف سیاہ اس کی جاتی نہیں نظر سے
کیا ئیں، ہی محوِ چشمکِ انجم ہوں خلق کو
جب سے مَیں شروع قصہ کیا آنکھیں کھول دیں
ہم چشم تجھ سے رکھتے تھے دلداریاں بہت
چشمے آب شور کے نکلا کریں گے واں جہاں
حلقۂ گیسوئے خوباں پہ نہ کر چشم کو وا
خط سے جو ہے گرفتہ وہ مہ نہیں نکلتا
چشمے کہیں ہیں جوشاں جوئیں کہیں ہیں جاری
یہ چشم شوق طرفہ جگہ ہے دکھاؤ کی
فرصت سے اس چمن کی کل رو کے میں جو پوچھا
خط سے ہے بے وفائی حسن اس کے آئینہ
دل و چشمِ مروّت کیوں نہ خوں ہو
نے کچھ گنہ ہے دل کا نہ جرم چشم اس میں
دعوئی عشق یوں نہیں صادق
کب تلک ان بتوں سے چشم رہے
جوں چشمِ یار بزم میں ابلا پڑے ہے آج
بے گداز دل نہیں امکان رونا اس قدر
سوجھتا اپنا کرے کچھ ابر تو ہے مصلحت
دل سے آگے ٹک قدم رکھو تو پھر بھی دلبر د
آج کل سے کچھ نہ طوفاں زا ہے چشمِ گریہ ناک
یوں نہ روؤ تو نہ روؤ ورنہ روؤ پیار سے
سبز ہے رونے سے میرے گوشہ گوشہ دشت کا
وے حنا شُما مری آنکھوں ہی میں پھرتی ہے میرؔ
کیا گرسنہ ہیں چشم دل اب کے یہ دلبراں
ان سیہ چشم دلبروں سے ہمیں
کیا آج ڈبڈبائی دیکھو ہو تم یہ آنکھیں
اس کام جاں میں ہم میں ہوا ہے حجاب چشم

اس چشمِ زُو سیہ نے روزِ سیہ دِکھایا
اس مہ نے ایک جھمکی دکھا کر لگا رکھا
یعنی تھی مجھ کو چشم نمائی تمام شب
سو التفات کم ہے دل آزایاں بہت
رکھیں گے مجھ تلخ کامِ غم کو چشم تر سمیت
میرؔ امرت نہیں ہوتا دہنِ مار کے بیچ
مانندِ چشمِ اختر ہم دیکھیں راہ تاچند
جوں ابر ہم نہ روئے اس بن کہاں زمیں پر
ٹھہرو بقدر ایک مژہ تم اس مکان پر
چشمک کی ایک گل نے میری طرف کو ہنس کر
ہم سادگی سے رکھتے ہیں چشم وفا ہنوز
تجھے ہم جب نہ تب دیکھیں عدو پاس
رکھتی ہے ہم کو اتنا بے اختیار خواہش
زردیٔ رنگ و چشمِ تر ہے شرط
ہو رہے گا بس اب خدا سے نفع
ٹک دیکھ شیخ مے کے بھرے جام کی طرف
تہ کو پہنچو خوب تو پردہ ہے چشمِ گریہ ناک
جوشِ غم سے جیسے نابینا ہے چشمِ گریہ ناک
سیر قابلِ دیدنی اِک جا ہے چشمِ گریہ ناک
موجزن ہر سُو سے ہے دریا ہے چشمِ گریہ ناک
ہر قدم اس دشت میں پیدا ہے چشمِ گریہ ناک
باعثِ آبادیٔ صحرا ہے چشمِ گریہ ناک
یعنی ہر دم اس کی زیرِ پا ہے چشمِ گریہ ناک
تسکین ان کی ہو نہ جو بیویں ہزار دل
تھی وفا چشم سو وفا معلوم
جوں چشمہ یونہی ہر سُو ہم چشم تر رہے ہیں
یوں رہیے آہ کب تئیں دیوار درمیاں

یہ جوشِ غم ہوتے بھی ہیں لیں ابرِ تر بھتے بھی ہیں
چشمِ تر کی خیر جاری ہے سدا

روئے سخن جو ہے مرا تو چشمِ دل کی اور
برسوں تک چھایا رہا ہے چشمِ تر پہ ابر سا

شکوہ سیر چشمی کا سُن ہم سے یہ کہا
کب میرؔ ویسا برسائے ابر کر اندھیری

دل نہیں جمع چشمِ تر سے اب
سفری وہ جو مینہ ہوا تا دیر

کیا جانوں چشمِ تر سے اِدھر دل پہ کیا ہوا
ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ دل پر ہے

کاغذِ ابری پہ دردِ دل اُسے لکھ بھیجئے
چشم ہوتے ہوتے تر کچھ سب بھری رہنے لگی

یک مژہ اے دمِ آخر مجھے فرصت دیجے
دیکھنے ہی کے ہے قابل یار کی ترکیب میرؔ

چشمے کہیں ہیں جوشاں جوئیں کہیں ہیں جاری
دیر و کعبہ سے بھی ٹک جھپکی نہ چشمِ شوخِ یار

چشمِ انصاف سے برقع کو اٹھا دیکھو لے
پانی ہو بہہ گئے سب اجزا بدن کے لیکن

جب سے ہم نے دیکھا اس کو جی ڈھہا جاتا ہے میرؔ
گردش میں ہیں جو میرؔ مہ و مہر ستارے

کبو چشمِ خونبار کو چشم تم

چشمِ جہاں آشوب سے دریا بہایا ایک مَیں
سیل اس دروازے کا سائل ہے میاں

تم سے خدا نخواستہ مجھ کو گلہ نہیں
پاٹ دامن کا نچوڑوں کبھی تو دریا ہو میاں

سُرمہ نہیں لگانے کا میں تم خفا نہ ہو
جیسا کہ روتے ہم نے دیکھا ہے چشمِ تر کو

پھیلتا سا چلا یہ دریا کچھ
چشم اپنی تھی گردِ راہ کے ساتھ

کس کو خبر ہے میرؔ سمندر کے پار کی
خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

وہ بھی تو جانے کہ یاں آشوبِ چشم اُس سے ہے
اب ہوئی خطرے کی جاگہ کشتی طوفانی ہوئی

چشمِ بیمار کے دیکھ آنے کی مہلت دیجے
واہ واری چشم وابرو قد و قامت ہائے ہائے

آثار اب تلک ہیں یاروں کے چشمِ تر کے
شوق کے افراط سے تا چند گھر گھر دیکھئے

گل کے منہ سے تو کھٹی پردہ وہ رُو نازک ہے
یوں بھی کہا نہ ان نے وہ چشمِ تر کہاں ہے

اس خرابی کی یہ چشمِ رو سیہ بانی ہوئی
دن رات ہمیں رہتی ہے یہ چشم نمائی

خدا جانے کب کا یہ ناسور ہے

دیوانِ سوم

میرؔ کا صحبت میں اس کی حرف سر کر رہ گیا
عرصۂ وحشت قیامت باغ ہو جائے گا سب

حیرت ہے کھو ہیں چشمِ تماشا کہاں کہاں
اس کو منظور نہ تھی ہم سے محبت کرنی

پیش جاتی کچھ نہ دیکھی چشمِ تر کر رہ گیا
اس طرح سے جو یہ چشمِ خونفشاں ہیں بے گیا

حسن و جمال ویسا ہی اس کا خرام کیا
ایک چشمک بھی نہ کی ایک اشارہ نہ کیا

خیالِ چشم و روئے یار کا بھی طرفہ عالم ہے
نظر آیا ہے واں اک عالمِ دیگر جہاں میں تھا

دل پر تو چوٹ تھی ہی زخمی ہوا جگر سب
ہر دم بھری رہے ہے لوہو سے چشمِ تر سب

چاک دل ہے انار کے سے رنگ
چشمِ پُرخوں فگار کے سے رنگ

عشق وہ خانماں خراب ہے میاں
جس سے دل آگ چشم آب ہے میاں

وہ عیّار یوں چشمِ تر سے گیا
کہ ہرگز نہ اس کا ہوا تر قدم

اب سیل سیل آنسو آتے ہیں چشمِ تر سے
دیوار و در سے کہہ دو بے اختیار ہیں ہم

اگ برسی تیرہ عالم ہو گیا جادو سے پر
اس کی چشمِ پُرفسوں کے سامنے افسوں کہاں

جو دیکھو تو نہیں یہ حال اپنا حسن سے خالی
دمک الماس کی سی ہے ہماری چشمِ حیراں میں

جب دور گیا قافلہ تب چشم ہوئی باز
کیا پوچھتے ہو دیر خبر دار ہوا میں

چشم پوشی نہ کر فقیر ہے میرؔ
مہر کی اس کو اک نظر ہے بس

لادیں کہاں سے خونِ دل اتنا کہ میرؔ ہم
جس وقت بات کرنے لگیں چشم تر کریں

بے تصرف عشق کے ہوتا ہے ایسا حال کب
دل ہمارا خون ہو سب چشم یکسر آب ہو

غمِ ہجراں نے شاید آگ دی اس ماہ بن دل کو
شرارے تب تو نکلے ہیں ہماری چشمِ گریاں سے

لوہو پانی ایک کر دیتا ہے عشق
پانی کر دے چشم دل لوہو کیے

عشق کی صنعت مت پوچھو جن نیچے بھوؤں کے چشم کیں
دیکھیں جہاں محرابیں ان نے طرح کیے پیمانے دو

مارا تڑپتے چھوڑا فتراک سے نہ باندھا
بے چشم و رو کسی کے شاہد شکار ہیں ہم

عشق میں غم نہ چشمِ تر ہے بس
نہ یہی خونِ دل و جگر ہے بس

نہ چشمِ کم سے مجھ درویش کی آوارگی دیکھو
تبرک کرتے تھیں کانٹے میرے پاؤں کے چھالوں کو

چشم و دل کا اُن سے لگ جانا تو تھا جس تس طرح
جی بھی ان باتوں میں الجھا اور یہ جنجال دیکھ

پرسشِ حال کبھو کرتے ہیں نازِ چشم و اشارت سے
ان کو عنایت حال پہ میرے کیا پوچھو ہو غضب ہی ہے

آشوبِ چشم چشمہ زا اب کوہ و صحرا پر بھی ہے
طوفاں سا شہروں میں ہے اک شور دریا پر بھی ہے

وسعت بیاں کروں کیا دامانِ چشمِ تر کی
رونے سے میرے کیا کیا ابرِ سیہ تر آئے

جیب و کنار سے تو بڑھا پانی دیکھئے
چشمہ ہماری چشم کا رہتا ہے جوش پر

دیوان چہارم

جگر خوں کیا چشم تر کر گیا
گیا دل سو ہم پر ستم کر گیا

کیا ہوا پہلو سے دل کو جانے کیا جانوں ہوں میں
ایک قطرۂ خوں جھلکتا صبح چشمِ نم میں تھا

کیا فقر میں گزر ہو چشم طمع سے بن
ہے راہ تنگ ایسے جیسے سوئی کا ناکا

عاشق کی چشم تر میں گو دبتے آویں لیکن
پاؤں کا دلبروں کے چھپتا نہیں چھپاکا

چشم وفا اخوان زماں سے سادہ ہو سو رکھے میر
قصہ ہے مشہور زمانہ پہلے دوتیں بھائی کا

چشم رہنے لگی پُر آب بہت
شاید آوے گا خون ناب بہت

صورت پھرے نہ یار کی کیوں چشم تر کے بیچ
تاثیر ہے گی اہل وفا کے ہنر کے بیچ

دوش آغوش و گریباں دامن گلچیں ہوئے
گل فشانی کر رہی ہے چشم خونباری کے بیچ

تجھ کو ہے سوگند خدا کی میری اور نگاہ نہ کر
چشم سیاہ بلا کریو نہی مجھ کو خاک سیاہ نہ کر

ایک دن وا ہوئی تھی اس منہ پہ
آرسی کی ہے چشم باز ہنوز

منہ پہ ناخن کے خراشوں سے لگا خون بہنے
چشمے نکلے ہیں نئے چشم جگر بار کے پاس

عشق کے دو گواہ لا یعنی
زردیٔ رنگ و چشم تر ہے شرط

حلقے پڑے ہیں چشم نم میں سوکھے ایسے نم نہ رہے
رونا کڑھنا غم میں اس کے میر کرو گے کب موقوف

بڑی دھوم سے ابر آئے گئے
نہ کوئی ہوا چشم تر کی طرف

غم سے حال آنکہ خونِ دل سو کھا
چشم تر اشکبار ہے تا حال

خوش رنگ ہے کس مرتبہ انہار کا پانی
خون ناب مری چشم کا ہے آب رواں میں

یہ بخت دیکھ گاہے آتا ہے آنکھوں میں بھی
پر نقش اس کے پا کا بیٹھا نہ چشم تر میں

اس چشم سُرخ پر ہے وہ ابروئے کشیدہ
جوں ترکِ مست رکھ لے سر کے تلے کماں کو

خدا کریم ہے اس کے کرم پہ رکھ کر چشم
دراز کھینچو کسو میکدے میں خواب کرو

ان گیسوؤں کے حلقے ہیں چشم شوقِ عاشق
وے آنکھیں دیکھتی ہیں حسرت سے اس کے رو کو

گردش چشم سیہ کا سے جمع نہ رکھو خاطر تم
بھو کا پیاسا مار رکھا ہے تم سے ان نے ہزاروں کو

کیا دیکھو ہو آگا پیچھا عشق اگر فی الواقع ہے
ایکدم اس بے چشم و رو کی تیغ تلے بھی جا بیٹھو

ہے عینہ ابلتا سیلاب رود کا سا
اے میر چشم تر ہے یا کوئی رود خانہ

دیوان پنجم

چشم تماشا وا ہووے تو دیکھا بھالی غنیمت ہے
مت موندے آنکھوں کو غافل دیر تلک پھر سووے گا

داغ سر و سینے کے میرے حسرت آگیں چشم ہوئے
دیکھیں کیا کیا عشق ستم کش ہم لوگوں کو دکھاوے اب

نقش نہیں پانی میں ابھرتا یہ تو کوئی اچنبھا ہے
صورتِ خوب اس کی ہے پھرتی اکثر چشم تر میں اب

چشم رہتی ہے اب پُر آب بہت
دل کو میرے ہے اضطراب بہت

منہ کی زردی تن کی نزاری چشمِ تر پر چھائی ہے
پشتِ پا پہ ہے چشم شوخ اس کی
چشم مشتاق اس لب و رخ سے لحہ لحہ اٹھتی نہیں
چشم چھپائی دور سے وا کر مجھ کو لگا یہ کہتے گیا
یونہی نظر چھڑ رہتی نہیں کچھ حسرت میں تو چشم سفید
چشمِ شوخ سے اس کے یاد و نسبت کیا ہے غزالوں کو
قابل ہوئے ہیں سیر کے چشمانِ خوں فشاں
کب سے گرمیٔ عشق نے میرے چشمۂ چشم کو خشک کیا
چشمے بحیرے اب تک ہیں یادگار اس کے
چشمِ محیط سے جو ہووے نہ چشمِ تر کے
خاشاک و خار و خس کو کر ایک جا جلایا
پھول گُل کچھ نہ تھے کھلی جب چشم
زنہار پشت پا سے نہیں اٹھتی اس کی آنکھ
دل دل لوگ کہا کرتے ہیں تم نے جانا کیا ہے دل
شاید عاشق کے دل دونوں پاس ہی حاضر ہیں یعنی
آنکھ چلی ہے ہماری اس کی اُفد نظر کے ساتھ
اتنے لوگوں میں چشم کسو کی قہر قیامت آفت ہے
لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہرِ گوش کے بالے تک
بے چشم و رُو ہو بیٹھے ہو وجہ نہیں ہے ظاہر کچھ
چشم و دل جان مائلِ خوباں
زار زوتا چشم کا کب دیکھتے
رُو نہیں چشمِ تر سے اب رکھیے
طبع درہم وضع برہم زخم غائر چشم تر
جھڑ باندھ دے ہے بہنے جو لگتا ہے صبح کو

عشق میں اس کے یعنی ہم نے کھینچے ہیں آزار بہت
ہائے رے ہم سے ہے حجاب بہت
کیا ہی لگے ہے اچھا اس کا مکھڑا پیارا پیارا آج
صید کریں گے کل ہم آکر ڈال چلے ہیں چارا آج
دیکھی ہے ہیرے کی دمک بیں اس چشمِ حیران کے بیچ
دیکھتے ہیں ہم بڑا تفاوت شہری اور گنوار کے بیچ
دیکھیں ہیں آنکھیں لوہو کا فوارہ درمند
کپڑے لگے سب تن کے لیکن وے ہیں اب تک تر کے تر
وہ سوکھ سب گئی ہے چشمِ پُر آب کیونکر
تو سیر ہو ہوا پر پھیلے سحاب کیونکر
کیا چشم شورِ برقِ خاطف تھی آشیاں پر
اور بھی رہتی اب بہار اے کاش
اس چشمِ سرگیں کو بہت ہے حیا سے ربط
چشمِ بصیرت وا ہووے تو عجائب دید کی جا ہے دل
پھر دل پھر دل خشک لبی رہتی ہے چشمِ تر کے ساتھ
یعنی چشم شوق لگی رہتی ہے شگافِ در کے ساتھ
تم نے دیکھی نہیں ہے صاحب آنکھ کوئی شرمائی ہوئی
اس کو فلک چشمِ مہ و خور کی آنکھ کا تارا جانے ہے
کام کی صورت بگڑی ہماری منہ کیوں تم نے بنایا ہے
بدی یاروں کی کیا کیا کرتیے
دیکھتے ہیں لیکن تدا جو کچھ دکھلائے
سیل اسی ور کا کب سے سائل ہے
حالِ بد میں ہے کسوں کے کچھ بھی تم کو غور ہے
ہے چشمِ تر کہ غیرتِ ابرِ مطیر ہے

دیوانِ ششم

جاتی ہے چشمِ شوق کسو کی ہزار جا
چشمکِ گل کا لطف بھی نہ اٹھا
نقشہ اس کا مردم دیدہ میں میرے نقش ہے
کیا حالِ رازِ عاشق کہئیے بیاں نہ پوچھو
برسات اب کی گزری خوف و خطر میں ساری
تھے چشمِ خونفشاں پر شاید کہ دست و دامن
نازک بدن ہے کتنا وہ شوخ چشم دلبر
عشق میں اس بے چشم دُکھ کے طرفہ روایت پیدا کی
کھلی رہتی ہے چشم آئینہ ساں
وہ سخن گر فریبی چشمِ یار
میرؔ جی رازِ عشق ہو گا فاش
لکھے ہے کچھ تو کج کر چشم و ابرو
حال اس کا خراب ہی دیکھا
سُن عشق جو ابتدا کرتے ہیں چشم پوشی
جب دیکھو آئینے کو تب رُو برو ہے اس کے
آخر گرسنہ چشمِ نظارہ ہو گئے ہم

آدے ادھر بھی اس کی نظر تو ہے کیا عجب
کم رہا موسمِ شباب بہت
یعنی صورت اس ہی کی پھرتی ہے چشم تر کے بیچ
کرتا ہے بات کوئی دل کی تو چشم تر کو
چشمک زناں رہی ہے برق آشیاں کے اوپر
ہیں میرؔ داغ خوں کے پیراہنِ آستیں پر
جان اس کے تن کے آگے آتی نہیں نظر میں
کس دن اُدھر سے اب ہم پر گالی جھڑکی مار نہیں
کہاں خواب مشتاقِ دیدار کو
ہم سے گویا تھی آشنا نہ کبھو
چشم ہر لحظہ مست پُرآب کرو
براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو
جس کے یہ چشم و دل مشیر ہوئے
جانکاہ اس مرض کی شاید دوا نہیں ہے
بے چشم و رو ہے اس کو شرم و حیا نہیں ہے
کچھ دیکھنے کو اس کے برسوں ہمیں تھے

متعلّقاتِ چشم

(ل) مژہ/مژگاں (اَبرُو)

دیوانِ اوّل تا دیوانِ ششم

پایا نہ دل بہایا ہوا سیلِ اشک کا
دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشمِ گریہ ناک
بس اے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو

باغ کر دکھلائیں گے دامانِ دشتِ حشر کو
ہو چکا خونِ جگر رونا نہیں کچھ کم ہنوز

مژگاں بھی بہہ گئیں مرے رونے سے چشم کی
رویا نا نزع میں میں اسے یاد کر بہت

خوں بستہ اپنی کھول مژہ پوچھتا بھی گر
خوں ٹپکے ہے پڑا نوک کی ہر اک سے ہنوز

دامان و جیب و دیدہ و مژگاں و آستیں
دل تفتگی نے مارا مجھ کو کہاں مژہ دے

تری ہو چکی خشک مژگاں کی سب
یہ کیا جالفس ہوا سینے میں کیا اس دل کو اے ناصح

عاشق ہوئے تو گو غم بسیار کیوں نہ ہو
مرے کوچے میں یکسر عاشقوں کے خارِ مژگاں ہیں

خوں بستہ بارے رہنے لگی اب تو یہ مژہ
جی بھرا رہتا ہے اب آٹھوں پہر مانندِ ابر

یہ تمہاری ان دنوں دوستاں مژہ جس کے غم میں ہے خونچکاں
اپنے کوچے میں نکلیو تو سنبھالے دامن

مَیں پنجۂ مژہ سے سمندر بلو چکا
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

ہم بھی واں آئے اگر مژگانِ خوں افشاں سمیت
ہیں مژہ دستورِ سابق ہی یہ میرے نم ہنوز

سیلاب موج مارے تو ٹھہرے ہے کوئی خس
اب یک مری ہر ایک مژہ نم ہے زیرِ خاک

رکھ ٹک تو اپنے حال کو مدِ نظر کہیں
کس ستم دیدہ کی مژگاں ہیں تہِ خارِ چمن

اب کون سا رہا ہے کہ ان میں سے تر نہیں
اک قطرہ آب تا ہیں اس آگ کو بجھاؤں

لہو اب جگر میں مگر کچھ نہیں
سحر خوں بستہ تو دیکھا تھا میں نے اپنی مژگاں کو

ناسورِ چشم ہو مژہ خونبار کیوں نہ ہو
جو تو گھر سے کبھو نکلے تو رکھیو پاؤں آہستہ

آنسو کی بوند جس سے ٹپکتی تھی گاہ گاہ
سیکڑوں طوفاں بغل میں ہے یہ مژگاں ماتی

وہی آفتِ دلِ عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا
یادگارِ مژۂ میرؔ ہیں واں خار کئی

شکوہ ہے رونے کا یہ بے گانگی سے تیری
کل اک مژہ نچوڑے طوفانِ نوح آیا
اب کی ہوائے گل میں سیرابی ہے نہایت
مژگاں بھی پھر گئیں تری بیمار چشم دیکھ
آخرِ کارِ محبت میں نہ نکلا کچھ کام
کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر
توجہ ہے تیری حیرت میری آنکھوں پہ کیا کم ہے
صبر و حواس و دانش سب عشق کے زبوں ہیں
عشق آنکھوں کے نیچے کیے کیا میر چھپے ہے
اگرچہ اب کی ہم اے ابرِ خشک مژگاں ہیں
سبزہ و گل خوش نشینی اس چمن کی جن کو تھی
روتے بھی ان نے دیکھ کے ہم کو کیا نہ رحم
مژگانِ تر کو یار کے چہرے پہ کھول میر
تھے لبِ جُو پر جو گرمِ دیدِ یار
جب تک ہو خون دل میں جگر میں مژہ ہو نم
کیا عشق سو پھر مجھے غم رہا
زردیِ چہرہ حسن کی نزاری بیماری پھر چاہت ہے
کیسی شکلیں سامنے آویں مژگاں وا ادھر نہ کروں
زود جو آئی رونے کی مژگاں نہ ٹھہری ایک پل

مژگانِ تر و گرنہ آنکھوں میں آشنا ہے
فکرِ فشار میں ہس میر آج ہر پلک کے
جوئے چمن پہ سبزہ مژگانِ چشم تر ہے
دکھ درد میں سوائے خدا یار کون ہے
سینہ چاک و دل پژمردہ مژۂ نم سے بھی
تھا دستِ نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا
جو میں ہر مژہ کو دیکھوں کہ یہ تر ہے کہ یہ نم ہے
میں کاوشِ مژہ سے عالم کو چھان مارا
پیدا ہے محبت تیری مژگاں کی تری سے
یہ جوشش دل میں کبھو آ گیا تو طوفاں ہیں
سو بھی تو دیکھا گریباں چاک و مژگاں نم گئے
اک چشم داشت رکھتے تھے مژگانِ نم سے ہم
اس آب خستہ سبزے کو تک آفتاب دے
سبزے کے سے رنگ مژگاں تر گئے
تہ کچھ بھی جو نہ ہووے تو کیا چشم تر رہے
مژہ نم رہی حال برہم رہا
دل میں غم ہے مژگاں نم ہیں حال بہت درہم ہے اب
حور پری پر آنکھ نہیں پڑتی ہے کسو کی لگائی ہوئی
راہ میں اس زود کے گویا خس و خاشاک تھا

(ب) دیدہ/نگاہ (نگہ)

دیوانِ اوّل

نگاہِ یاس بھی اس صید افگن پر غنیمت ہے
اک نگاہِ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں
نہ دیکھا آخر اس آئینہ رو کو
آنکھیں جو کھل رہی ہیں مرنے کے بعد میری

نہایت تنگ ہے اے صیدِ بسمل وقت فرصت کا
وا ہوئیں مژگاں کہ سبزہ سبزۂ بیگانہ تھا
نظر سے بھی نگاہ واپسیں پر
حسرت یہ تھی کہ اس کو میں اک نگاہ دیکھوں

ہوں مَیں نگاہِ بسمل گو اک نگاہ تھی فرصت
شکر کر داغ دل کا اے غافل
سمجھے تھے میرؔ ہم کہ یہ ناسور کم ہوا
پل میں جہاں کو دیکھتے میرے ڈبو چکا
لوہو میں شور بور ہے دامان و جیب میرؔ
بہہ گئے عمر ہوئی ابرِ بہاری کو وے
دیدۂ تر پہ شب رکھا تھا میرؔ
گلزار ہو رہا ہے مرے دم سے کوئے یار
دل اور دیدۂ باعثِ ایذا و نورِ عین
کیا تنگ حوصلہ تھے دیدہ و دل اپنے آہ
لب پہ شیون مژہ پُرخون و نگہ میں اک یاس
چاہتا ہے جی کہ ہم تو ایک جا تنہا ملیں
گرے بحرِ بلا مژگانِ تر سے
کنو چشمہ پہ و دریا کے دیا اوپر نظر کیجیے
آگے دریا تھے دیدۂ تر میرؔ
برسا تو میرے دیدۂ خونبار کے حضور
ہنستا ہی بس پھرو جو مرا کچھ ہو اختیار
وے دن گئے جب ضبط کی طاقت تھی ہمیں بھی
یہاں کا دید بجز ماتم نظارہ نہیں
ہوا مذکور نام اس کا کہ آنسو بہہ چلے منہ پر
آستینیں رکھتے رکھتے دیدۂ خونبار پر
سب نے جانا کہیں یہ عاشق ہے
ابرِ تر کے حضور پھوٹ بہا
دل نذر و دیدہ پیشکش اے باعثِ حیات
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ
اگرچہ سہل ہیں پر دیدنی ہیں ہم بھی میرؔ
دیدہ و دل شتاب گم ہوں میرؔ

تا میرؔ سوئے قاتل تا قتل گاہ دیکھوں
کس کو دیتے ہیں دیدۂ بیدار
پھر ان دنوں میں دیدۂ خونبار نم ہوا
اک وقت میں یہ دیدہ بھی طوفاں رو چکا
پھرا ہے آج دیدۂ خونبار بے طرح
لوہو برسا رہے ہیں دیدۂ خونبار ہنوز
لکۂ ابر ہے مرا رُومال
اک رنگ پر ہے دیدۂ خونبار آجکل
کس کے تئیں بُرا کہوں کس کو بھلا کہوں
ایک دم راز محبت کا چھپایا نہ گیا
دن کیا ہجر کا جس ڈھنگ سے شب مت پوچھو
باز بیجا بھی نہ ہووے کم نگاہی بھی نہ ہو
نگاہیں اُٹھ گئیں طوفان پر سے
ہمارے دیدۂ نم دیدہ کیا کچھ کم ہیں ریدوں سے
اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں
پر اب تک انفعال ہے ابرِ بہار کو
پر کیا کروں میں دیدۂ بے اختیار کو
اب دیدۂ خونبار نہیں جاتے سنبھالے
کہ دیدنی ہی نہیں جس پہ یاں نظر کیجیے
ہمارے کام سارے دیدۂ تر ہی ڈبوتا ہے
حلقِ بسمل پر طرح لوہو کے فوارے ہوئے
بہہ گئے اشک دیدۂ نم سے
دیدۂ تر کو میرے رحمت ہے
سچ کہہ کہ جی لگے ہے ترا کس مکان میں
سو تم ہم سے رُخ ہی چھپا کر چلے
ادھر کو یار قاتل سے گر نگاہ کریں
دل پہ آفت ہمیشہ لاتے ہیں

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

ربطِ اخلاص اے دیدہ و دل بھی دنیا میں ایک ہی ہوتا ہے
لگ پڑتے ہو جس سے تس سے تم بھی کوئی ملامت ہو

کس کو مردم ہے لہو رونے کا ہجراں میں وداع
دل کو اک ربط سا ہے دیدۂ خونبار کے ساتھ

جگر سوئے مژگاں کھنچا جائے ہے کچھ
مگر دیدۂ تر ہیں لوہو کے پیاسے

ایک خوں ہو بہہ گیا دو روتے ہی روتے گئے
دیدہ و دل ہو گئے ہیں سب کنارے دیکھئے

جوشِ دل آئے بہم دیدۂ گریاں ہوئے
کتنے اک اشک ہوئے جمع کہ طوفان ہوئے

ایک سے ہے خرمنِ غم دانۂ اشک ایک ہے
دیدہ و دل دونوں کا الغرض حاصل ایک ہے

شب فروغِ بزم کا باعث ہوا تھا حسنِ دوست
شمع کا جلوہ غبارِ دیدۂ پروانہ تھا

کیوں نہ ابرِ سیہ سفید ہوا
جب تلک عہدِ دیدۂ تر تھا

آنکھیں چرائیو نہ کچھ ابرِ بہار سے
میری طرف بھی دیدۂ خونبار دیکھنا

بکھ مست ہیں ہم دیدۂ پُر خون جگر سے
آیا ہے یہی ساغرِ سرشارِ محبت

چشم بددُور کہ کچھ رنگ ہے اب گریہ پر
خون جھمکے ہے پڑا دیدۂ گریاں کے بیچ

لیکن عبث نگاہ جہاں کریئے اس طرف
امکان کیا جو خون مرے تا کمر نہ ہو

رُوئے گل پر روز و شب کس شوق سے رہتا ہے باز
رخنۂ دیوار ہے یا دیدۂ نظارگی

ہر چند بیش ازیش ہے دعویٰ تو رونے کا مجھے
پر دیدۂ غمناک بھی اے ابرِ تر طوفان ہے

دلیوانِ دوم

پس از عمر ادھر گئی تھی نگاہ
سو آنکھیں وہ مجھ کو دکھانے لگا

خستے کو اس نگہ کے طبیبوں سے کام کیا
ہمدم مجھے دکھا کسی صاحبِ نظر کے تئیں

چشمِ گل باغ میں مندی جا ہے
جو بنے اک نگاہ کر لیجے

نوح کا طوفاں ہماری کب نظر چڑھتا ہے میرؔ
جوش ہم دیکھے ہیں کیا کیا دیدۂ تر کے ترے

برسوں سے تو یوں ہے کہ ہوا جب امنڈ آئی
تب دیدۂ تر سے بھی ہوا ایک جھڑا کا

برسوں تری گلی میں چمن ساز جو رہا
سو دیدہ اب گداختہ ہو کر شفق ہوا

منظر خراب ہونے کو ہے چشمِ تر کا میرؔ
پھر دید کی جگہ نہیں جو یہ مکاں گرا

مردم دیدۂ تر مردمِ آبی ہیں مگر
رہتے ہیں روز و شب و شام و سحر پانی میں

جوں اشک جہاں جلتے رہیں گے تم گئے پھر
دیکھا کرو ٹک آن کے ہم دیدہ تروں کو

پھرتی ہیں اس کی آنکھیں آنکھوں تلے ہمیشہ
رہتا ہے آب دیدہ ماں تک گلے ہمیشہ

کھولتے ہی آنکھیں پھر یاں موندنی ہم کو پڑیں
یک عمر دیدہ ہائے ستم دیدہ تر رہے
مدعی ہو چشمِ شوخ یار کا
اشک پے در پے چلے آتے تھے چشمِ زار سے
مَیں جو ہر شو نگوں ہوں دیکھنے ہو کے مضطر
چل باغ میں سحر سے اٹھ کر کبھو کہ گل
تمام روز جو کل مَیں پیئے شراب پھرا
اگرچہ خاک اڑائی دیدۂ تر نے بیاباں کی
گھر میں آئینہ کے کب تک تجھے نازاں دیکھوں
اشک پر سُرخی ابھی سے ہے تو آگے ہمنشیں
ہر دم جراحت آسا کب رہتے تھے ٹپکتے
ہنستے رہتے تھے جو اس گلزار میں شام و سحر
سُنتا ہے دیدہ خونیں پہ یہ نہیں دیکھا
برسوں رکھا ہے دیدہ تر پر
جوں کفِ دریا کو دریا سے ہے نسبت دُور کی
وہ زلف نہیں منعکس دیدۂ تر میرؔ
تک رہے ہیں اس کے سو ہم تک رہے ہیں ایک سے

دید کیا کوئی کرے وہ کس قدر مہلت ہوئی
آخر کو پھوٹ بہے قہر کر رہے
کیا نگا ہوں میں ہوا بادام سہل
ہر نگاہ کا تار مانا رشتۂ گوہر سے ہے
آنسو ہر میری نگاہ ساتھ گتھا نکلے ہے
تک تک کے راہ دیدۂ بے خواب ساہوا
بسانِ جام لیے دیدۂ پُر آب پھرا
دلے نکلا نہ خاطر خواہ رونے سے غبار اپنا
کبھو تو آؤ مرے دیدۂ حیران کے بیچ
رنگ لاوے کیسے کیسے دیدۂ تر دیکھئے
یہ دیدۂ نمیں کیا خونبار ایسے ہی تھے
دیدۂ تر ساتھ لے وہ لوگ جوں شبنم گئے
لہو کا ہر گھڑی آنکھوں کے آگے نالا ہے
پاٹ دامن کا اپنے دریا ہے
ابر بھی دُوں اور کچھ ہے دیدۂ نم اور ہے
اس بحر میں اشعار سے زنجیر پڑی ہے
دیدۂ حیراں ہمارا دیدۂ بسمل ہے کیا

دیوانِ سوم

کیا کیا نہ گیا اس بن صبر اور دماغ و دل
معروفِ یار چاہیے سُرخ چمن سا ہو
ہمارے دیدہ و گل ہی سے ہم کو کام ہے تنگ
کیا کیا ہوائیں دیدۂ تر سے نظر پڑیں
وہ تو نہیں اک چھینٹا رونے کا ہوا گاہے
رہتا ہے پیشِ دیدۂ تر آہ کا سبھاؤ
بہت روئے ۔ ہمارے تر اب نہیں کھلتے
وہ دیدۂ تر اپنے جو یار کو ہیں تکتے !

رونق گئی بشرے سے پھر نور بھی دیدوں کا
دل نذر و دیدہ پیشکش و جاں فدائے گل
کہ رونے کڑھنے سے اک لحظہ فرصت ان کو نہیں
جب رونے بیٹھ جاتے تھے تب برشگال تھا
اب دیدۂ تر اکثر دریا سے ابلتے ہیں
جیسے مصاحب ابر کی ہوتی ہے کوئی باؤ
متاعِ آب دیدہ کوئی تو اس کو ہوا دیوے
ایک ایک کو نہیں پھر غیرت سے دیکھ سکتے

پہنچے نہ باس گل کی ہمارے مشام میں
تارِ نگہ کا شوت نہیں بند ھتا ضعف سے
ترے بیمار کے بالیں پہ جاکر ہم بہت روئے
شکوہ و گلہ سے عشق کے لبریز ہے جہاں
آنکھ اس منہ پہ کس طرح کھولوں
ابر سے آشوب ایسا کب اٹھا
ایک نہ آیا دید میں اپنے دلکش دلچسپ اس کے رنگ

یاں کمل رہے ہیں دیدۂ خونبار گھاؤ سے
پہچاں رہے ہے یہ رشتہ دلا اس کو تاب دے
بلا حسرت کے ساتھ اس کی نگاہ واپسیں دیکھی
کر دیجے جہاں نگاہ یہی قیل و قال ہے
جس پلک جل رہی ہے میری نگاہ
خوب روئے دیدۂ تر پھوٹ کر
ان آنکھوں سے اس گلشن میں یوں تو ہزار کو دیکھا ہے

دیوانِ چہارم

آج ہمیں بیتابی سی ہے صبر کی دل سے رخصت تھی
دیدہ و دل بھی اس کی جانب میل کلی رکھتے ہیں
موسم گل ہی میں نہ چھوٹے حیف
جوش رونے کا مجھے آیا ہے اب
پر سال کی سی بارش برسوں میں پھر ہوئی تھی
جب سے آنکھیں کھلی ہیں اپنی درد و رنج و غم دیکھے
دونوں طرف سے دیدہ درائی نہیں ہے خوب
تحریک چلنے کی ہے جو دیکھو نگاہ کر
کب سے نگاہ گاڑے ہے یاں روز آفتاب
نظر کیا کروں اس کے گھر کی طرف
وحشت سے بھر رہی تھیں نگاہ تیر جان کے
چشمک چتون نیچی نگاہیں چاہ کے تیری شعر ہیں
نگاہ غور سے کر میرؔ سارے عالم میں

چاروں اور نگاہ کرنے میں عالم حسرت ہے
عشق میں ہم بے کس ہیں واقع یار نہیں ہے یاور آج
گشت تھا دیدہ تھا نظارہ تھا
دیدۂ تر ابر سا چھایا ہے اب
ابر اور دیدۂ تر روتے ہیں زار دونوں
ان ہی دیدہ تمدیدوں سے کیا کیا ہم نے ستم دیکھے
اس چاہ کا ہے لطف جو آپس میں ڈر رہے
ہیئت کو اپنی موجوں میں آب رواں کیے بیچ
ہم دیکھے ہیں جہاں کے تئیں سرسری ہنوز
نگاہیں ہیں میری نظر کی طرف
جائیں بسانِ طائرِ بسمل پھڑک گئیں
میرؔ عبث بگڑے ہے ہم سے آنکھ کہیں تو لگائی ہے
کہ ہو وے عین حقیقت وہی تو ساری ہے

دیوانِ پنجم

دیدۂ تر کو سمجھ کر اپنا ہم نے کیا کیا حفاظت کی
رنگ یہ ہے دیدۂ گریاں سے آج
لوہو میں ڈوبے دیکھو دامان و جیب میرؔ

آہ نہ جانا روتے روتے یہ چشمہ دریا ہوگا
لوہو ٹپکتا ہے گریباں سے آج
بھرا ہے آج دیدۂ خونبار بے طرح

نادیدہ ہیں نام خدا کے ایسے جیسے قحط زدہ
سال میں ابرِ بہاری کہیں آ کر برسا
گو خاک سی اڑتی ہے میرے منہ پہ جنوں میں
بہت روئے پردے میں جیب دیدۂ تر
تہہ داری کچھ دیدۂ تر کی میرؔ نہیں کم دریا سے
دیدۂ تر سے چشمۂ جوشاں ہے جو قریب اپنے واقع
اس کا بحرِ حسن سراسر اوج و موج و تلاطم ہے
لطفِ بدن کو اس کے ہرگز پہنچ سکے نہ
شوق سے ہم نگاہ نہیں کچھ ہائے زیانِ جان کی طرف
صورت اس کی دیدۂ تر میں پھرتی ہے ہر سو روز و شب
دامنِ دیدۂ تر کی وسعت دیکھے ہی بن آوے گی

دوڑتی ہیں کیا آنکھیں اپنی سبحہ کے دانے دانے پر
لوہو برسا رہے ہیں دیدۂ خونبار ہنوز
ٹپکے ہے لہو دیدۂ نمناک سے اب تک
ہوئی اچھی برسات تب اس برس میں
جوشاں شورکناں آجا دے یہ شعلہ سیلاب نہ ہو
تو ہی رو دے چلے جاتے ہیں لگ کر جیب و کنار کے ساتھ
شوق کی اپنے نگاہ جہاں تک جاوے بوس و کنار ہے آج
جا پڑتی تھی ہمیشہ اپنی نگاہ جاں پر
ورنہ یہی دیکھا کیے تھے ہیں اپنے سود و زیاں کی طرف
ہے نہ اچنبھا یہ بھی کہیں پانی میں نقش ابھرتا ہے
ابرِ سیاہ و سفید جو ہو تو پانی ان کا بھرتا ہے

دیوانِ ششم

کہتے تو تھے نہ دیکھو اس سے لگے نہ جاؤ
ٹک آنکھوں میں ہے یہ دید کی جگہ
اک گدائے در ہے سیلابِ بہار
تھا یہی سرمایۂ بحرِ بلا پچھلے دنوں
چلے جاتے ہیں رات دن آنسو
پھولوں سے اٹھ نگاہیں کرتے پر اس کے ٹھہریں
نیچی آنکھیں ہم اس کو دیکھا کیے
میں اک نگاہ گاہے خوش رو کوئی نہ دیکھا

سمجھے نہ دید و دل اب کیا کروں الٰہا
بہتر نہیں مکان کوئی اس مکان سے
غم کشوں کے دیدۂ خونبار کا
چشمِ کم سے دیکھو مت اس دیدۂ پُر آب کو
دیدۂ تر کی خیر جاری ہے
وہ گل فروش کا جو آیا دکان کے اُوپر
کبھو اُونچی نگاہ کرتے تھے
الفت رہی ہے جس سے اس ہی کا ڈر رہا ہے

(ج) پلک (پلکیں)

دیوانِ اوّل تا دیوانِ ششم

ضعفِ دماغ سے میں بھر کر نظر نہ دیکھا
میں آگے نہ تھا دیدۂ پُر آب سے واقف

کیا دیر میں پلک سے میری اٹھا گیا ہے
پلکیں نہ ہوئی تھیں مری خوں ناب سے واقف

ڈرتا ہی میں رہا کہ پلک کوئی گڑ نہ جائے
دل خوں ہوا تھا کیسر پانی ہوا جگر سب
میری تو ہے پلک سے چھوٹی نگاہ
چتون بے ڈھب آنکھیں بھری ہیں پلکوں سے بھی نظر چھوٹی
پلک اٹھے آثار اچھے نہ دیکھے
رہا ہی کیے آنسو پلکوں پہ شب
پلکوں سے رفو ان نے کیا چاکِ دلِ میرؔ
خاطر نہ جمع رکھو ان پلکوں کی خلش سے
رشتہ کیا ٹھہرے گا یہ جیسے کہ مُو نازک ہے
اس رنگ سے چمکے ہے پلک پر کہ کہے تُو
دامن میں آج دیکھا پھر لختِ میں نے آیا
پلکوں پہ تھے پارۂ جگر رات
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک
لٹھتے پلکوں کے گرے پڑتے ہیں لاکھوں آنسو
ہو لگتا ہے ٹپکنے جو پلک ماروں ہوں
لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں
آزار دیکھے کیا کیا ان پلکوں سے اٹک کر
ٹپکتا ہے پلکوں سے خوں متصل
یاد آوے ہے جب شب کو وہ چہرۂ مہتابی
ہو ہمیں کس ستم دیدہ کے پاس یکجا
پلک کے مارتے ہم تو نظر نہیں آتے
شیشہ بازی تو تنک دیکھنے آ آنکھوں کی
حال یہ پہنچا ہے کہ اب ضعف سے
کل اک مژہ نچوڑے طوفانِ نوح آیا
آبشار آنے لگے آنسو کے پلکوں سے تو میرؔ
کس دن سرشکِ خونیں منہ پر نہ بہہ کر آئے
چھاتی میں بھری آگ ہے کیا جس سے شب و روز

آنکھوں سے اس کے رات جو تلوے ملا کیا
خوں بستہ رہتیاں تھیں پلکیں سو اب ہیں تر سب
اور وہ اس پہ منہ چھپاتا ہے
عشق ابھی کیا جلنے ہے ہم کو کیا کیا میرؔ سکھاوے گا
پڑی آنکھ ہرگز نہ رُوئے اثر پر
کہاں تک ستارہ شماری رہے
کس زخم کو کس نازکی کے ساتھ سیا ہے
سر دل سے کاڑھتے ہیں یاں خار رفتہ رفتہ
چاک دل پلکوں سے سی مت کہ رفو نازک ہے
ٹکتا ہے پڑا اشک عقیقِ جگری کا
ٹکڑا کوئی جگر کا پلکوں میں رہ گیا تھا
ہم آنکھوں میں لے گئے بسر رات
پلک پر گیا تو تلاطم کیا
ڈھل ڈالا ہے مری آنکھوں نے اب طوفاں کا
اب تو یہ ڈھنگ ہے اس دیدۂ اشک افشاں کا
آنکھیں اگر یہی ہیں تو بھر نیند سو چکا
جی لے گئے یہ کانٹے دل میں کھٹک کھٹک کر
نہیں دیکھتے ہم جگر کی طرف
آنسو مرے پلکوں سے تارے سے چمکتے ہیں
نگاہیں شرر ریز پلکیں جگر بار
سخن کرو ہو عبث تم ہماری فرصت سے
ہر پلک پر مرے اشکوں سے رواں ہے شیشہ
اٹھتے پلک ایک پہر چاہیے
نکر فشار میں تن میرؔ آج ہر پلک کے
کب تلک یہ آبِ چادر منہ پہ تانا کیجے
کس شب پلک کے اوپر لختِ جگر نہ دیکھا
چنگاریاں گرتی ہیں مری پلکوں کی صف سے

ساون ہرے نہ بھادوں ہم سوکھے اہلِ درد
ہوئیں رونے کی مانع میری پلکیں
ممکن نہیں آرام دے بے تابی جگر کی
نخل بستہ نہ کیوں پلکیں ہر لحظہ رہیں میری
نخل بستہ جب تلک تھیں دریا اُٹھے ہوئے تھے
نام اس کا سن کے آنسو گر ہی پڑے پلک سے
ٹپکتی پلکوں سے رعال جس گھڑی سرکا
دیکھا پلک اٹھا کے تو پایا نہ کچھ اثر
تارے سے میری پلکوں پہ قطرے سرشک کے
تھی چشم یہ رُکے گا پلکوں سے گریہ لیکن
فراق آنکھ لگنے کی جا ہی نہیں
خشک سالِ وفا میں اک مدت
ہو سکتی ہیں سدِ راہ پلکیں کہیں رونے کی
چنگاریاں گرے ہیں جب پلکیں ملتیاں ہیں
ٹپکا کرے ہیں پلکوں سے بے فاصلہ سرشک
دریا سی آنکھیں بہتی ہی رہتی تھیں سو کہاں
پلکیں اس طرح روتے روتے گئیں

سبزہ ہماری پلکوں کا سیراب تھا سو تھا
بندھا خاشاک سے سیلاب پر بند
جب تک کہ پلک پر کوئی ٹکڑا نہ نظر آوے
جاتے نہیں آنکھوں سے لب یار کے عنّابی
آنسو گرے کروڑوں پلکوں کے ٹک ہلائے
دل کا لگاؤ یارو چھپتا نہیں چھپایا
طرف ہوا نہ کبھو ابر دیدۂ تر کا
اے عمرِ برق جلوہ گئی تو شتاب کیا
دیتے رہے ہیں میر دکھائی تمام شب
ہوتی ہے بند کوئی تنکوں سے راہِ سیلاب
پلک سے پلک آشنا ہی نہیں
پلکیں لوہو میں تر رہیں پیارے
تنکوں سے رُکے ہے کیا دریا جو بہا چاہے
رونے سے تب تو میرے کچھ آنکھیں جلتیاں ہیں
برسات کی ہوا ہے سدا چشم تر ہے یاں
ہوتی ہے کوئی کوئی پلک اب تو تر کہیں
سبزہ ہوتا ہے جس طرح لبِ چاہ

نظر (د)

دیوانِ اوّل

پوچھو تو میرے سے کیا کوئی نظر پڑا ہے
جاتی ہے نظر جس پہ گہہ چشم پریشان
کھلتی ہے جب آنکھ شب کو تجھ بن
سب طرمیں اس کی اپنی نظر میں تھیں کیا کہیں
خدا جانے کہ کیا خواہش ہے جی کی
نظر بھر دیکھنے پاتا نہیں میں نزع میں بھی

چہرہ اتر رہا ہے کچھ آج اس جواں کا
یاں ہم نے پرِ کاہ بھی بے کار نہ پایا
کٹتی نہیں آتی پھر نظر رات
پر ہم بھی ہو گئے ہیں گرفتار ایک طرح
نظر اپنی نہیں ہے مہر دکیں پر
منھ کے تئیں پھیرے ہی لیتا ہے وہ بیباک ہنوز

نظر اٹھتی نہیں کہ جب خوباں
کہوں کب تک دم آنکھوں میں ہے میرے
منظور ہے کب سے سرِ شوریدہ کا دینا
دیا دکھائی مجھے تو اسی کا جلوہ میرؔ
کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے
کس رات نظر کی ہے سوئے چشمکِ انجم
یہ چشم آئینہ دارِ رُو تھی کسو کی
سر جائے گا ولیکن آنکھیں ادھر ہی ہوں گی
لاتے نہیں نظر میں غلطانیٔ گہر کو
در سے کبھو جو آتے دیکھا ہے میں نے اس کو
ہر قطعۂ چمن پہ ٹک گاڑ کر نظر کر
گریہ کو مرے دیکھ ٹک اک شہر کے باہر
نہیں کھلتیں آنکھیں تمہاری ٹک کہ مال پر بھی نظر کرو
نہ دیکھا آخر اس آئینہ رُو کو
سمجھا ہوں تیری آنکھ چھپاتے سے خوش نگاہ
گلگشت کا بھی لطف دل خوش سے ہے نسیم
کیا موافق ہو دوا عشق کے بیمار کے ساتھ
زیرِ فلک جہاں ٹک آسودہ میرؔ ہوتے
فکر ہے ماہ کے جو شہر بدر کرنے کی
جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لیا لب ہے
شہر میں جو نظر پڑا، اس کا
خواب میں تو نظر جمال پڑا
کس کا رُوئے سخن نہیں ہے ادھر
گہہ گل ہے گاہ رنگ گہے باغ کی ہے بُو
کہو کوئی دیکھے اسے سیر ہو کر
ڈاڑھی سفید شیخ کی تو مت نظر میں کر
کسو کے کہنے سے مت بدگماں ہو میرؔ سے تو

سوتے سے اٹھ کے آنکھ ملتے ہیں
نظر آوے ہی گا اب کوئی دم میں
چڑھ جائے نظر کوئی تو یہ بوجھ اتاریں
پڑی جہان میں جا کر نظر جہاں میری
پردہ اٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے
آنکھوں کے تلے اپنے تو وہ ماہ جبیں تھا
نظر اس طرف بھی کبھو تھی کسو کی
کیا تیری تیغ سے ہم قطع نظر کریں گے
ہم معتقد ہیں اپنے آنسو ہی کی ڈھلک کے
تب سے ادھر ہی اکثر میری نظر رہے ہے
بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بناتے
اک سطح ہے پانی کا جہاں تک کہ نظر جائے
یہ جو وہم کی سی نمود ہے اسے خوب دیکھو تو خواب ہے
نظر سے بھی نگاہِ واپسیں پر
مدِ نظر یہ ہے کہ کسو کی نظر نہ ہو
پیشِ نظر وگرنہ چمن زار کیوں نہ ہو
جی ہی جاتے نظر آئے ہیں اس آزار کے ساتھ
ایسا نظر نہ آیا اک قطعۂ زمیں بھی
ہے سزا تجھ پہ یہ گستاخ نظر کرنے کی
نظر پیدا کر اوّل پھر تماشا دیکھ قدرت کا
کشتۂ ناز یا تغافل تھا
پر مرے جی ہی کے خیال پڑا
ہے نظر میں ہمارے سب کی بات
آتا نہیں نظر وہ طرحدار ایک طرح
کہ ہے اس تنِ نازک اوپر نظر بار
بگلا شکار ہووے تو لگتے ہیں ہاتھ پر
وہ اور اس کو کسو پر نظر دروغ دروغ

روتے پھرے ہیں تو ہو اک عمر اس گلی میں
اس کے کوچے سے جو اٹھ اہلِ وفا جاتے ہیں
صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وے معنی
جس کی نظر پڑی ہے ان نے مجھے بھی دیکھا
سراپا میں اس کے نظر کر کے تم
اس اسیری کے نہ کوئی اے صبا پالے پڑے
بیمار رہے ہیں اس کی آنکھیں
کیا سوجھے اسے جس کے ہو یوسف ہی نظر میں
پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
آجائیں ہم نظر جو کوئی دم بہت ہے یاں
عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے
جوں چشم بسملی نہ مندی آوے گی نظر
کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
گل بار کرے ہے گا اسبابِ سفر شاید

باغ و بہار ہی ہے جاوے نظر جہاں تک
تا نظر کام کرے رُو بقفا جاتے ہیں
اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں
جب سے وہ شوخ آنکھیں میں نے سراہیاں ہیں
جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے
اک نظر گل دیکھنے کے بھی ہمیں لالے پڑے
دیکھو کسو کی نظر نہ ہووے
یعقوب بجا آنکھوں سے معذور رہا ہے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے
مہلت ہمیں بسانِ شرر کم بہت ہے یاں
آہ تم بھی تو اِک نظر دیکھو
جو آنکھ میرے نخچی کے چہرے پہ باز ہو
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
غنچہ کی طرح بلبل دلگیر نظر آئی

دیوانِ دوم

ہووے یارب ان سیہ رُو آنکھوں کا خانہ خراب
نظر میں طور رکھ اس کم نما کا
زلفِ سیاہ اس کی جاتی نہیں نظر سے
جو کچھ نظر پڑے ہے حقیقت میں کچھ نہیں
نظر میرؔ نے کیسی حسرت سے کی
سایہ سا آگیا تھا نظر اس کا ایک دن
خارا شگاف و سخن خراش ایک سے نہیں
کچھ نظر میں نے نہ کی جی کے زیاں پر اپنی ہائے
چشمِ حق بیں سے کرو ٹک تم نظر
آنکھ اس سے نہیں اٹھتی کی صاحب نظروں کی

یک نظر کرتے ہی میرے دل میں اس کا گھر ہوا
بھروسا کیا ہے عمرِ بے وفا کا
اس چشم رُو سیہ نے روزِ سیہ دکھایا
عالم کو خوب دیکھو تو عالم ہے خواب کا
بہت روئے ہم اس کی رخصت کے بعد
مبہوت سا پھروں ہوں پری وار سا ہم
لیکن نظر نہیں ہے تجھے کام کی طرف
دوست میں رکھ گیا اس دشمنِ جانی کے تئیں
دیکھتے جو کچھ ہو سب باطل ہے میں
جس خاک پہ ہو گا اثر اس کفِ پا کا

جی سے جانا بن گیا اس بن ہمیں پل مارتے
سرچشمۂ حسن کا وہ آیا نظر نہ مجھ کو
ہو گوشہ گیر شہرت مد نظر اگر ہے
اس باغ میں نہ آئی نظر خرمی مری
پست و بلندیاں کا ہے اور ہی طرف سے
تم نے دیکھا ہو گا پکپن میرؔ کا
اک گل زمیں نہ وقفے کے قابل نظر پڑی
مر مر گئے نظر کر اس کے برہنہ تن میں
آنکھیں تمام خلق کی رہتی ہیں اس کی اور
کھنچتا چلا ہے اب تو تصدیق کو تصوّر
ان دلبروں کی آنکھ نہیں جائے اعتماد
کریں انہوں یہ بھلا کس طرح نظر گستاخ
اس تن پہ نثار کرتے لیکن
اب نیک و بد پہ عشق کے مجھ کو نظر نہیں
یہ ستم تازہ کہ اپنی ناکسی پر کر نظر
زورِ طبیعت اس کا سُنیں اشتیاق تھا
یک نظر دیکھنے کی حسرت میں
نوح کا طوفاں ہماری کب نظر چڑھتا ہے میرؔ
آتش بجگر اس دُرِ نایاب سے سب ہیں
کل سروِ تاز باغ میں آیا نظر مجھے

کام تو مشکل نظر آتا تھا پر آساں ہوا
اس راہ زن نے ظالم کیا کارواں مارا
عنقا کی طرح اپنا عزلت سے نام نکلا
گر سبز بھی ہوا ہوں تو جیسے کسو کی بات
اپنی نظر نہیں ہے کچھ آسماں زمیں پر
ہم کو تو آیا نظر وہ خام سہل
دیکھا برنگِ آبِ رواں یہ چمن تمام
کپڑے اتارے ان نے جب پہنچے ہم کفن میں
مطلق کسو کو حال پہ میرے نظر نہیں
ہر لحظہ اس کے جلوے پیش نظر رہے ہیں
جب یہ رہیں تو چاہیئے پیشِ نظر ہیں
بتانِ شہر ہمارے تو دین و ایماں ہیں
اپنی بھی نظر میں ٹھہرے جاں تو
اس میں مجھے بُرا کہو کوئی بھلا کہو
جس سے بگڑا چاہیئے اس سے بنایا چاہیئے
آیا نظر جو میرؔ تو کچھ ناتواں سا ہے
آنکھیں تو پانی ہو بہیں پیارے
جوش ہم دیکھے ہیں کیا کیا دیدۂ تر کے ترے
دریا بھی نظر گئے اسی تشنک لبی سے
ہمیں نے فریبِ شوق سے جانا کہ یار ہے

دیوانِ سوم

خیالِ چشم و رُوئے یار کا بھی طرفہ عالم ہے
آ کر کھڑا ہوا تھا بعد حسنِ جلوہ ناک
کس طور سے بھر آنکھ کوئی یار کو دیکھے
ہے قہر وہ جو دیکھے نظر بھر کے جن نے میرؔ
سب اس کی چشمِ پُرفن نیرنگ کے محو

نظر آیا ہے واں اِک عالمِ دیگر جہاں میں تھا
اپنی نظر میں وہ دُرِ نایاب تھا سو تھا
اس آتشیں رخسار سے ہوتی ہے نظر آب
برہم کیا جہاں مژہ برہم زدن کے بیچ
نگہ کی ان نے عالم کی نظر بند

تن راکھ سے ملا سب آنکھیں دیے سی جلتی
ٹھہری نظر نہ جو کی میرؔ اس فتیلہ مو پر

روئے جہاں جہاں ہم جوں ابر میرؔ اس بن
اب آب ہے سراسر جاوے نظر جہاں تک

کیا نظرگاہ ہے کہ شرم سے گل
سر گریباں میں ڈال بیٹھے ہیں

رہا بس دیکھ ادھر میرؔ چلتے
عجب اک نا امیدی تھی نظر میں

اے بت گرسنہ چشم ہیں مردم نہ ان سے مل
دیکھے ہیں پھوٹتے ہم بہتر نظر سے یاں

اس بن نظر زمیں سے سی دی ہے تو کہے
کاہے کو چشم جانبِ گردوں کروں ہوں میں

تم بن چمن کے گل نہیں چڑھتے نظر کبھو
یہ کیا روش ہے آؤ چلے ٹک ادھر کبھو

کب نظر میری پڑے گی اس کے رُوئے خوب پہ
ہمنشیں ٹک تو بھی مصحف کھول کر تو فال دیکھ

کیا کریں نیچی نظر کرنے سے غصہ کھائے وہ
اور مجلس میں جو رہیئے دیکھ تو شرمائے وہ

چال زمانے کی ہے نظر میں شام و سحر ہے کس کو قیام
نو وارد ہم یاں کے نہیں پر لیل و نہار کو دیکھا ہے

اتنے نہیں نظر میں مرے ہاتھی کے سوار
کانوں میں جو فسانۂ اصحابِ فیل ہے

نظر نہ کرتے طرفِ صید کے دمِ بسمل
یہ ظلم تازہ ہوا اس کشندے سے ایجاد

وہ آئینہ مو باغ میں پھولوں کے جو دیکھا
ہم رہ گئے حیران اسی منہ پہ نظر کر

صورتوں سے خاکداں یہ عالم تصویر ہے
بولیں کیا اہل نظر خاموش ہیں حسرت سے یاں

سہمے سہمے نظر پڑیں ہیں میرؔ
اس کے اطوار سے ڈرے کچھ تو

جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اس کے
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر

کیا شب طرف اس چہرۂ تاباں کے ہوا تھا
پھر چاند نظر ہی نہ چڑھا جی سے اُتر کر

کہاں ہے کہ مجنوں بھی ہم سا ہی تھا
غلط کے شوائب نظر میں بھی ہیں

کب تک ہم انتظار میں ہر لحظہ بیقرار
گھر سے نکل نکل کے گلی میں نظر کریں

گو چشم بندی شیخ کی ہو آخرت کے واسطے
لیکن نظر اعمیٰ خط پردے میں دنیا پر بھی ہے

آنکھیں ہی لگی جاتی ہیں اس جاذبہ کو میرؔ
آتی ہے بہت دیر جو اس منہ پہ نظر جائے

دیوانِ چہارم

جاتے تو ہیں گو خواہش دل موت ہے نِری
پھر بھی ہمیں نظر نہیں جی کے زیان پر

گر نیچی نظر میرؔ کی ہو تو آنکھیں تو ٹک دیکھ
کیا دل زدگاں سادہ ہیں پرکار ہیں ہم لوگ

دل ٹوٹنے پہ مرغِ چمن کے نہ کی نظر
بے درد گل فروش سبد بھر کے لائے ہیں

دیکھا نہ ادھر ورنہ آتا نہ نظر پھر میں
جی مفت مرا جاتا اس شوخ کا کیا جاتا

نظر کنھوں نے نہ کی حال میرؔ پر افسوس
یوسف کی اس نظر سے دل کو نہ جمع رکھ
کچھ بھی نزدیک اس کے ٹھہرا ہو تو دیکھے بھر نظر
بزم میں منہ ادھر کریں کیونکر
یارب اس محبوب کو پھر اک نظر دیکھیں گے ہم
کیا دن تھے وے دیکھتے تم کو نیچی نظریں کر لیتا
ہر لحظہ بے قراری ہر لمحہ آہ و زاری

غریب شہر وفا تھا وہ خاک پا تیرا
ایسی متاع جاتی ہے بازار ہر طرح
قدر ہے عاشق کی ان آنکھوں میں کم حد سے زیاد
اور نیچی نظر کریں کیونکر
اپنی آنکھوں سے اسے یاں جلوہ گر دیکھیں گے ہم
شرما شرما لوگوں سے جب آنکھیں مجھ کو دکھاتے تم
ہر دم ہے اشکباری نومیدی ہے نظر میں

دیوانِ پنجم

اتر جو گیا دل سے رُوکش ہو اپنے
لعل پارے ہیں میرؔ لختِ جگر
نظر کیوں گئی رُو و مُو کی طرف
ابرِ کرم کی راہ تکو اب رحمتِ حق پہ رکھو نظر
ہاتھ کسو کا دیکھتے رہیے گا ہے ہم سے ہو نہ سکا
تا حدِ نظر چھا رہے ہیں لالۂ صد برگ
اے وے جن لوگوں کو پھرتے آنکھوں ہم نے دیکھ لیے
مژہ وا کرو تمہیں غش ہے کیا کسو حال پر بھی نظر کرو
بنے جو دلبر سادہ تو نہ بھلا لگے مری آنکھوں میں
کیا کہیے ویسی صورت گل ہے نظر نہ آئی
چتون کے انداز سے ظالم ترکِ مروت پیدا ہے
اس خوبصورتی سے نہ صورت نظر پڑی
سادے جتنے نظر آتے ہیں دیکھو تو عیار ہیں سب
کہیں مل ابھی ان کے ملتے ہیں جنہیں شوق ہیں ہے کمال کچھ
ہے حسن کیا متاع کہ جس کو نظر پڑی
نظر پڑی نہیں کیا اس کی شوخ چشمی میرؔ
طرف شاخ گل کی لچک کے نہ دیکھا
یار آنکھوں تلے ہی پھرتا ہے

چڑھا پھر نہ خورشید میری نظر پر
دیکھ کر خوش رو نظر ہے شرط
کھنچا جائے ہے دل کسو کی طرف
گو کہ تم اے مستانِ مجرم اس غم سے دل خستے ہو
اپنی نظر اے میرؔ رہے ہے اکثر دستِ دعا کی طرف
جنگل بھرے ہیں سب گل تر یا کہ سیلاب تک
مدِ نظر ٹک آج انھوں کی گردِ شہر مزاریں ہیں
یہی حال ہمیشہ رہا کیا تو حال پر بھی نظر کرو
تمہیں سادگی ہی میں لطف کچھ خط و خال پر بھی نظر کرو
ایسے گئے کہ ان کی پھر کچھ خبر نہ آئی
اہلِ نظر سے چھپتی نہیں ہے آنکھ کسو کی چھپائی ہوئی
صورت تلک تو میرؔ کی وہ بے نظیر ہے
نزد و نزار و زبوں جو ہم ہیں محبت کے بیمار ہیں سب
ہوئے ہو جو رفتہ خرام کے تو جمال پر بھی نظر کرو
وہ جان بیچ کر ہی خریدار ہو گیا
حضور یار کے چشم غزال کیا ہے شوخ
نظر میرؔ کی تھی کسو کی کمر پر
میری ہمت سے ہے نظر در پیش

دیکھ نہ ہر دم اے عاشق قاتل کی تیغِ جفا کی طرف
جلے کیوں نہ چھاتی کہ اپنی نظر ہے
کیا ہے عشقِ عالم کش نے کیا ستھراؤ لوگوں کا
جمہور واہ اس کی دیکھا کرے ہے اکثر
آوارگی کے محو ہیں ہم خانماں خراب

کوئی نظر کر عبرت آگیں اس کے ناز و ادا کی طرف
کسو شوخ پرکار رعنا پسر پر
نکل چل شہر سے باہر نظر کر ٹک مزاروں پر
محفوظ رکھ الٰہی اس کو نظر گزر سے
مطلق نظر نہیں ہمیں گھر بار کی طرف

دیوانِ ششم

نظر بھر دیکھتا کوئی تو تم آنکھیں چھپا لیتے
نورِ نظر کو کھو کے میں سوؤں گا دیکھیو
رہیں جو منتظر آنکھیں غبار ہیں لائیں
لبریزِ جلوہ اس کا سارا جہاں ہے یعنی
شوخ نظری تری پردے میں ہے جب تک تب تک
آئے نظر بہار میں پائیز میں گئے
خاکپا اس کی ہے شاید کسو کا سرمۂ چشم
رکھ نظر میں بھی خراب آبادیاں
باہم جو یاریاں ہیں اور آشنائیاں ہیں
لاکھوں فلک کی آنکھیں سب مندگئیں ادھر سے

سماں اب یاد ہو گا کب تمہیں وہ خرد سالی کا
دل بھر رہا ہے خوب ہی روؤں گا دیکھیو
وہ انتظار کشوں کو نہ ٹک نظر آیا
ساری ہے وہ حقیقت جاوے نظر جہاں تک
ہم نظر باز بھی آنکھوں کی حیا کرتے ہیں
ہے بے وفائی کرنے کی ہر سال خوئے گل
خاک میں اہلِ نظر اس سے رُلے جاتے ہیں
اے کہ تجھ کو کچھ غمِ تعمیر ہے
سب ہیں نظر میں اپنی ہم عالم آشنا ہیں
نکلے نہ ناامیدی کیونکر مری نظر سے

(۵) اشک/آنسو/گریہ/سرشک

دیوانِ اوّل

یہ اتصال اشکِ جگر سوز کا کہاں
دل تڑپتا ہے اشکِ خونیں میں
آتشِ دل نہیں بجھی شاید
بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کی کیا خجل
سوکھتے ہی آنسوؤں کے نور آنکھوں کا گیا
مانندِ شمعِ مجلسِ شب اشکبار پایا

روتی ہے یوں تو شمع بھی کم کم تمام شب
صیدِ درخوں طپیدہ کے مانند
قطرۂ اشک ہے شرارہ ہنوز
اے چشم جوشِ اشکِ ندامت کو کیا ہوا
بجھ ہی جاتے ہیں دیے جس وقت سب روغن جلا
القصہ میرؔ کو ہم بے اختیار پایا

اب اشکِ حنائی سے جو تر نہ کرے مژگاں
اشک آنکھوں سے کب نہیں آتا
اے ابر اس چمن میں نہ ہوگا گلِ امید
لختِ جگر تو اپنے یک لخت رو چکا تھا
طراوت تھی چمن میں سرو گویا اشکِ قمری سے
اشک بن چشم ہوتی یا نہ ہوتی یکساں ہے
میں گریۂ خونیں کو روکے ہی رہا ورنہ
ہوا رونے سے رازِ دوستی فاش
لاکھوں جتن کیے نہ ہوا ضبطِ گریہ لیک
دل جو زخمی ہوا تھا زخمی پھوڑ
بحر میں پاتا نہیں گریہ کے سررشتے کو میں
گریۂ شمع کا اے ہم نفساں میں تھا حریف
ہوا ہوں گریۂ خونیں کا جب سے دامن گیر
منعِ گریہ نہ کر تو اے ناصح
گرم جوشی سے مرے گریہ کی شب آنکھوں کی راہ
دامانِ دشت سوکھا ابروں کی بے تہی سے
عشق ہی گریۂ ندامت ہے
گریے سے داغِ سینہ تازہ ہوئے ہیں سارے
گریہ ہر وقت کا نہیں بے ہیچ
اے گریہ اس کے دل میں اثر خوب ہی کیا
صحرا میں سیلِ اشک مرا جا بجا پھرا
مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے سرشکِ آبدار
یارب سرشکِ سرخ کے داغوں سے رات کو
موسمِ حیرت ہے دل بھر کر تو رو نا ل چکا
دل کو تسکین نہیں اشکِ دما دم سے بھی
خطرِ عظیم میں ہیں مری آہ و اشک سے سب
ہم چشم ہے ہر آبلۂ پا کا مرا اشک

وہ تجھ کفِ رنگیں کا مارا ہوا نہ ہوگا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا
یاں تخمِ اشکِ یاس کوئیں پھر سے بو دیا
اشکِ فقط کا جھمکا آنکھوں سے لگ رہا تھا
اُدھر آنکھیں مندیں اس کی کہ ایدھر آبِ جو ٹوٹا
خاک میں جب وہ ملا موتی کا دانہ ہی گیا
یک دم میں زمانہ کا یاں رنگ بدل جاتا
ہمارا گریہ تھا دشمن ہمارا
سنتے ہی نام آنکھ سے آنسو گرے کروڑ
ضبطِ گریہ سے پڑ گئے ناسور
ہر سحر اٹھ باندھ دے ہے آنسوؤں کا تار چشم
گذری ہے رات کی صحبت بھی عجب مت پوچھو
نہ آستین ہوئی پاک دستاں میری
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی
گوشۂ دامن میں میر آتش کے پرکالے پڑے
جنگل میں گریہ کو اب ہم بھی چلا کریں گے
ورنہ عاشق کی چشم خفت ہے
یہ کشتِ خشک تو نے اے چشم پھر ہری کی
دل میں کوئی غمِ نہانی ہے
روتا ہوں جب میں سامنے اس کے تو دے ہے ہنس
مجنوں بھی اس کی موج میں مدت بہا پھرا
مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب
بستر پہ اپنے سوتے تھے ہم بھی بچھا کے گل
اتنے بھی آنسو بہم پہنچیں کہ مژگاں نم کریں
اس زمانے میں گئی ہے برکت غم سے بھی
کہ جہان رہ چکا پھر جو رہی ہے باد و باراں
از بسکہ تیری راہ میں آنکھوں سے چلا ہوں

موتی سے اشک ہیں غلطاں کسو طرف
نشاں اشکِ خونیں کے اڑتے چلے ہیں
عشق میں ایذائیں سب سے پائیاں
سرشکِ سُرخ کو جاتا ہوں جو پیئے ہر دم
خلش نہیں ہے کسو خواہش کی رات سے شاید
قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا
اک وقت ہم کو تھا سرِ گریہ کہ دشت میں
بے کار نہ رہ عشق میں تو رونے سے ہرگز
چشمِ بددور کہ کچھ رنگ ہے اب گریہ پر
شب کتابت کے وقت گریہ میں
زخمِ دردِل سے میرے نہ تک بے خبر رہو
جوں برق تیرے کوچے سے ہنستے نہیں گئے
جہاں میں گریہ نہ پہنچا مجھے بہم دلِ خواہ
بہت روئے جو ہم یہ آستیں رکھ منہ پہ اے بجلی
دوری کوچہ میں اے غیرتِ فردوس تری
ٹک شہر سے نکل کے مرا گریہ سیر کر
آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا
چمن پر توجہ د زاری سے کس گل کا ہے یہ ماتم
شہر کتنا جو کوئی ان میں سرشک افشاں ہو
لبریزِ اشک آنکھیں ہر بات میں سا کیں
چلے ہیں کب سے مژگاں آنسوؤں کی گرم جوشی سے
کب تک گرہ رہے گا سینہ میں دل کی مانند
چاہ کا دعوٰی سب کرتے ہیں مانیے کیونکر بے آثار
جو آنسو آویں تو پی جا کہ تا رہے پردہ
اشکِ خونیں آنکھ میں بھر لا کے پی جاتا ہوں میں
مغرور بہت تھے ہم آنسو کی سرایت پر
سیل اشکوں سے ہے ہر صرِ آنکھوں سے اڑے

یاقوت کے سے ٹکڑے ہیں لختِ جگر کہیں
خزاں ہو چلی ہے بہار گریباں
رہ گئے آنسو تو آنکھیں آئیاں
لہو کا پیاسا علی الاتصال اپنا ہوں
سرشکِ یاس کے پردے میں دل روانہ ہوا
بے چارہ گریہ ناک گریباں دریدہ تھا
جو خار خشک تھا سو وہ طوفاں رسیدہ تھا
یہ گریہ ہی ہے آبِ رخِ کارِ محبت
عمن جھمکے ہے پڑا دیدۂ گریاں کے بیچ
جو لکھا تھا سو بہہ گیا قاصد
اب ضبطِ گریہ سے ہے ادھر ہی کو سب نچوڑ
مانندِ ابر جب اٹھے تب گریہ ناک ہم
پہ نوح کے سے تو طوفاں ہزار لایا ہوں
نہ چشمِ کم سے دیکھ اس یادگارِ چشمِ گریاں کو
کام عشا ہے مرا گریۂ آدم سے بھی
گویا کہ کوہ و دشت پہ برسات ہوگئی
تم حرف سر کروگے ہم گریہ سر کریں گے
جو شبنم ہے تو گریاں ہے جو بلبل ہے تو نالاں ہے
رو کشِ گریۂ غم حوصلۂ ہامن ہے
رو رو کے کام اپنے ہم سب ڈبو چلے ہیں
اس آبِ چشم کی جوشش نے آتش دی نیستاں کو
اے اشکِ شوق اک دم رخسار پر رواں ہو
اشک کی سرخی زردی منہ کی عشق کی کچھ تو علامت ہو
بلا ہے چشمِ تر افشائے راز کرنے کو
محتسب رکھتا ہے مجھ پر تہمتِ میخوارگی
سو صبح کے ہونے کو تاثیر نظر آئی
مجھ سے کیا کیا نہ خرابی ہوتی ویرانوں کی

ٹپکتے درد ہیں آنسو کی جاگہ
پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
ہر اک مژگاں پہ میرے اشک کے قطرے جھمکتے ہیں
مجھ سے ناشائستہ کیا دیکھا کہ میر
کس طور آنسوؤں میں نہاتے ہیں غم کشاں
نکلے ہے آنکھوں سے تو گردِ کدورت جائے اشک
سب نے جانا کہیں یہ عاشق ہے
طوفاں بجائے اشک ٹپکتے تھے چشم سے
اظہارِ رازِ عشق کئے بن رہے نہ اشک
جوش بارا اشکِ خونیں نے مرے دل سے زبس
نم جگر کے آیا آخر ہو گئے
ایک تھمنے کا نہیں مژگاں تلک بوجھل ہیں سب
منضبط سر شکِ خونیں سے دل کیونکہ شاد ہو
متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل
آہ میں کب کی کہ سرمائۂ دوزخ نہ ہوئی
جو سر شک اس ماہ بن جھمکے ہے شب
اشک جھمکا ہے جیب نہ نکلا تھا
جلتے ہیں لے خرابے کو سیل آسماں تلک
آہ اور اشک ہی سدا ہے یاں
آنسو تو تیرے دامن پونچھے ہے وقتِ گریہ
افراطِ گریہ سے ہوئیں آبادیاں خراب
قابلِ آغوشِ ستم دیدگاں
لیتا ہی نکلتا ہے مرا لختِ جگر اشک
اب رحم پر اسی کے موقوف ہے کہ یاں تو
گماں کب تھا کہ پروانہ پہ اتنا شمع روئے گی
پڑھایا اس کو بہتیرا کہ رازِ دل نہ لا منہ پر

الٰہی چشم یا زخمِ کہن ہے
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
تماشا مفت خوباں ہے لبِ دریا چراغاں ہے
آتے آتے کچھ جو آنسو تھم چلے
اس آبِ گرم میں تو نہ انگلی ڈبوئیے
تا کجا تیری گلی میں خاک چھانا کیجئے
بہہ گئے اشک دیدۂ نم سے
اے ابرِ تر دماغ تھا رونے کا جیب مجھے
اس طفلِ ناسمجھ کو کہاں تک پڑھائیے
گھر میں ہمسائیوں کے شب لوہو کے پرنالے پڑے
اشک خونیں کچھ مژہ پر جم رہے
کاروانِ لختِ دل ہر اشک کے ہمراہ ہے
اب دل کی طرف لوہو کا سارا بہاؤ ہے
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں
کون سا اشک مرا منبعِ طوفاں نہ ہوا
وہ چمک کا ہے کو ہے تاروں کے بیچ
چرخ پر صبح کا ستارہ ہنوز
طوفاں ہے میرے اشکِ ندامت سے یاں تلک
روز برسات کی ہوا ہے یاں
ہم نے نہ رکھی منہ پر اے ابر آستیں بھی
سیلاب میرے اشک کے یاں تک بہک گئے
اشک سا پاکیزہ گوہر چاہیے
آنسو نہیں گویا کہ یہ ہیرے کی کنی ہے
نے اشک میں سرایت نہ آہ میں اثر ہے
کہ مجلس میں سے جس کے اشک کے بھر بھر لگن نکلے
یہ طفلِ اشک کو دیکھا تو ناقابل ہے کیا جانے

دیـوانِ دوم

وے دن گئے کہ اشک سے چھڑکاؤ سا کیا
تھا جگر میں جب تلک قطرہ ہی تھا خوں کا سرشک
آنسو گرا نہ رازِ محبت کا پاس کر
آنسو پی پی گیا جو برسوں میں
سوزش بہت ہو دل میں تو آنسو کو پی نہ جا
رہتا نہیں ہے آنکھ سے آنسو ترے لیے
کیا اور کوئی روئے کہ اب جوشِ اشک سے
کیا سطر موج اشک روانی کے ساتھ ہے
آنسو تو ڈر کے پی گئے لیکن وہ قطرہ آب
آنسو مری آنکھوں میں ہر دم جو نہ آ جاتا
خندۂ دنداں نما کرتا جو وہ کافر گیا
آنسو تھما نہ جب سے گیا وہ نگاہ سے
بندھا رات آنسو کا کچھ تار سا
نہ ہوتا میں حسرت سے محتاجِ گریہ
پوچھے ہیں وجہِ گریۂ خونیں جو مجھ سے لوگ
موجِ گریہ کی وہ شمشیر ہے جس کے ڈر سے
فرطِ گریہ سے ہوا میرؔ تباہ اپنا جہاز
گریۂ شب سے سرخ ہیں آنکھیں
بستر اخاکِ رہ اس کی تہ ہے اپنا لیکن
آغوش اس سے خالی رہی شب تو تا سحر
گریۂ زار میں بے تابیٔ دل طرفہ نہیں
اس گریۂ خونیں کا ہو ضبط تو بہتر ہے
دارد گلشن غزل خواں جب وہ دلبریاں ہوا
لو سدھ شتاب فاختۂ گریہ ناک کی
دل کے آگے ٹک قدم رکھو تو پھر بھی دلبر و

اب رونے لگ گئے ہیں تو تالاب سا ہوا
اب جو آنکھوں سے تجاوز کر چلا طوفاں ہوا
میں جیسے ابر برسوں تئیں دل بھرا پھرا
دل ڈبونے میں آب خِست رہا
کرتا ہے کام آگ کا ایسی جلن میں آب
دیکھی جو اچھی شے تو یہ لڑکا مچل پڑا
حلقہ ہماری چشم کا گرداب سا ہوا
مشتاق گریہ اب ہے چشمِ پُرآب سا
اک آگ تن بدن میں ہمارے لگا گیا
تو کام مرا اچھا پردے میں چلا جاتا
گوہرِ تر جوں سرشک آنکھوں کی سب سے گر گیا
پایانِ کار آنکھوں کو اپنی میں رو رہا
ہوا ابرِ رحمت گنہگار سا
جو کچھ آنسوؤں کو پس انداز کرتا
کیا دیکھتے نہیں ہیں سب اس بے وفا کا رنگ
جوں کشف خصم چھپا زیرِ سپر پانی میں
تختہ پارے گئے کیا جانوں کدھر پانی میں
مجھ بلا نوش کو شراب کہاں
گریۂ خونیں سے لوہو میں نہا رہتے ہیں
جیب و کنار گریۂ خونیں سے بھر رہے
مجھ کو لے جا کے ڈبو دیویں مگر پانی میں
اچھا نہیں چہرے پہ لوہو کا بہا جانا
دامنِ گل گریۂ خونیں سے سب افشاں ہو
آیا نہیں ہے دیر سے جیسے چمن میں آب
سیر قابلِ دیدنی اک جا ہے چشمِ گریہ ناک

لو ہو کہاں ہے گریۂ خونیں سے تن کے بیچ

اے ابرِ تر یہ گریہ ہمارا ہے دیدنی

سمندر کا ئیں کیوں احساں سہوں گا

ہمر میں کیا کیا سے دیکھے ہیں ان آنکھوں سے ئیں

کچھ آج اشکِ خونیں ہمیں نے نہیں چھپائے

زبانِ خامہ ہلتے ہی ہزار حس اشک گرتے ہیں

تمنت ہوئی کہ خون جگر میں نہیں رہے

جب جلی چھاتی بہت تب اشک افشاں ہو نہ میر

جوششِ اشک میں شب دل بھی گیا سینے سے

کاش پی جایا ہی کرتے اشک کو

کہتے ہیں سب کہ خون ہی ہوتا ہے اشکِ چشم

دیکھی تھی تیرے کان کے موتی کی اک جھلک

آتے ہیں متصل چلے آنسو

چشم کم سے اشکِ خونیں کو نہ دیکھو زینہار

فہم میں آیا نہ میرے پردہ در ہے طفلِ اشک

اشک کے جوش سے ہوں شام و سحر پانی میں

جوششِ اشک سے ہوں آٹھ پہر پانی میں

رکھا کر اشک افشاں چشم فرصت غیر فرصت میں

خاک اڑاتا اشک افشاں آن نکلوں میں تو پھر

دیکھے ہیں کیا کیا ڈھلکتے اشک میر

گوہرِ گوشش کسو کا نہیں جی سے جاتا

پیئے جاتے نہیں بس اب لہو کے گھونٹ مجھ سے

وے دن گئے کہ بے غم کوئی گھڑی کٹے تھی

مینھ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے

دیکھا تو مثلِ اشک نظر سے گرا دیا

کیا چھپا کچھ رہ گیا ہے مدعائے خطِ شوق

عزیزاں غم ہیں اپنے یوسفِ گم گشتہ کے ہر دم

کرتے ہیں منہ کو اپنے طمانچوں سے لال ہم

برسے ہے آج صبح سے چشم پُرآب کیا

مرے آنسو نہیں ؟ ان پر بہوں گا!

زرد رُخ پر لالہ گوں آنسو بہا کرتا تھا رات

رہ رہ گیا ہوں برسوں لوہو کو اپنے پی کر

حقیقت اپنے دل کی آہ کیا ارقام کیجئے اب

جاتا ہے آنسوؤں کا چلا تار سا ہنوز

کیا جو چھڑکا اس دہکتی آگ پر پانی کے تئیں

کچھ نہ معلوم ہوا ہائے اثر پانی میں

داغ دل پر کے تو دھوتے عشق میں

بالفعل کو گریہی ہے بکا تو جگر نہیں

جاتی نہیں ہے اشک کے رخسار کی ڈھلک

آہ کب تک یہ موتی رو لو تم

ڈھونڈتے ہیں مردم اس یاقوتِ سیلانی کے تئیں

روؤں کیا اے ہمنشیں میں اپنی نادانی کے تئیں

جیسے ماہی ہے مجھے سیر و سفر پانی میں

گرچہ ہوتے ہیں بہت خوف و خطر پانی میں

کہ بل جاتا ہے ان جو قس کا پانی بحرِ رحمت میں

دشت کو دریا کروں بستی کے تئیں صحرا کروں

بیٹھے موتی سے پروتے عشق میں

آنسو موتی سے مرے منہ پر ڈھلے جاتے ہیں

بہت پی پی گیا ڈر سے ترے میں اشکِ خونیں کو

تھمتے نہیں ہیں آنسو اب تو پہر پہر کچھ

اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی

اب میری اس کی آنکھ میں عزت نہیں رہی

رقعہ وار اب اشکِ خونیں سے تو افشانی ہوئی

چلے جاتے ہیں اشک اب کارواں در کارواں میرے

مانند شمع پلکے ہی پڑتے ہیں اب تو اشک
یکہ جلتے جلتے ہو گئے ہیں ہم گداز سے

دنبالِ ہر نگاہ ہے صد کاروانِ اشک
بہتے ہے چشم ابر بڑی دھوم دھام سے

آنسو چلے ہی آنے لگے منہ پہ متصل
کیا کیجے اب کہ رازِ محبت نہاں رہے

دامن کے پاٹ سارے تختے ہوئے چمن کے
بس اے سرشکِ خونیں درکار ایسے ہی تھے

کیا کم اس خورشید رُو کی جستجو یاروں نے کی
آنسو روتے جوں شفق پوُرب گئے پچھم گئے

ہوا خانہ خراب آنکھوں کا اشکوں سے تو بر جا ہے
رہِ سیلاب میں کوئی بھی گھر بنیاد کرتا ہے

آنکھیں ہماری دیکھیں لوگوں نے اشک افشاں
اب چاہ کا کسو کے پردہ نہیں رہا ہے

لعل سبب یہ دل تھے ہمارے سرِ جاں سے تھے اشکِ چشم
کیا کیا کچھ پاس اپنے ہم بھی عشق کی دولت رکھتے تھے

شاید اب ٹکڑوں نے دل کی قصد آنکھوں کا کیا
کچھ سبب تو ہے جو آنسو آتے آتے تھم گئے

ہماری خاک پر اک بے کسی برستی ہے
ادھر سے ابر جب آیا تب اشکبار آیا

آگے یہ آنکھیں گلے کا ہار ہی رہتی تھیں روز
اب جگر میں خوں نہیں ہے جو کہ بہے آنسو کہاں

قطرہ قطرہ اشکباری تا کجا پیشِ سحاب
ایک دن تو ٹوٹ پڑ اے دیدۂ تر ہو سو ہو

دیوانِ سوم

دل جگر تو خوں ہوئے رخصت ہوئے
حسرت آلودہ ہے کیا اشکِ وداع

دل کی دو اشک سے نہ نکلی بھڑاس
اوس سے بجھتی نہیں ہے پیاس کہیں

دل کو آگ اک دم میں دے دی اشک ہوئے چنگاری سے
کیا ہی شریر ہے شوخیٔ برق ملائی ان نے شرارت میں

دل کہے میں جوں تو کاہے کو کوئی بے تاب ہو
آنکھ کا لگنا نہ ہو تو اشک کیوں خوناب ہو

دھوتے ہیں اشکِ خونیں سے دست و دہن کو میر
طورِ نماز کیا ہے جو یہ ہے وضو کی طرح

دیکھ اشکِ سرخ بولا یہ رنگ اور لائے
ہیں میر منہ پہ آنسو یا روتے ہو لہو تم

کسی کی یادِ رُو میں اشک آنکھوں سے نہیں تھمتے
برنگِ ابرِ قبلہ آج کیں شدت سے گریاں ہیں

چھکنے لگا خوں تو جانے سرشک
ابھی دیکھیں آنکھیں ہمیں کیا دکھائیں

رہتی تھی اشکِ خونیں میں ڈوبی سب آستیں
اس چشمِ بحرِ خوں کے کبھو دیکھے ہیں چڑھاؤ

کشتیٔ چشم ڈوبی سی ہے بحرِ اشک میں
آئی نہ نظر یار ہوتی عاشقوں کی ناؤ

کیا رو دوں اشک آتے ہیں آنکھوں سے سیل سیل
پل مارنے میں پیشِ نظر ایک جھیل ہے

درد و الم ہی میں سب جاتے ہیں روز و شب یاں
دن اشک ریزیاں ہیں شب زار نالیاں ہیں

اس نرگسِ مستانہ کو کر یاد گڑھوں ہمیں
کیا گریۂ سرشار مجھے بے سبب آیا

عاشق و معشوق یاں آخر فسانے ہو گئے
جائے گریہ ہے جہاں، لیلیٰ کہاں مجنوں کہاں

گریہ پہ رنگ آیا قیدِ قفس میں شاید
خوں ہو گیا جگر میں اب داغ گلستاں کا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

دل بے قرارِ گریۂ خونیں تھا رات میرؔ
آیا نظر تو بسمل در خوں طپیدہ تھا

نکلے ہے چشمہ جو کوئی جوشِ زناں پانی کا
یاد وہ ہے وہ کشو چشم کی گریانی کا

ہے اشک سے بلبل کے بھرا غنچوں میں پانی
گل باغ سے کیا رخصتِ سفر باندھ رہے ہیں

اس حسن سے کہاں ہے غلطانی موتیوں کی
جس خوبصورتی سے میرؔ اشک ہیں ڈھلکتے

جوششِ اشک میں ٹک ٹھہرے رہو پیش نظر
اب کوئی پل میں یہ سیلاب اتر جاتا ہے

زرد رخسار پہ کیوں اشک نہ آوے گل رنگ
آگے سے آنکھوں کے وہ باغ نظر آتا ہے

وہ دل نہیں رہا ہے تعب جو اٹھائے گا
یا لوہو اشکِ خونیں سے منہ پہ بہلائے گا

اب سیل سیل آنسو گرتے ہیں چشمِ تر سے
دیوار و در سے کہہ دو بے اختیار ہیں ہم

فردِ درد آنسو پیئے کچھ ہوا
دولب جیسے پیتے ہیں پانی کے ساتھ

کل جوشِ غم میں آنسو ٹپکے نہ چشمِ تر سے
افسوس ہے کہ آکر یوں مینھ کچھ نہ برسے

دیوانِ چہارم

ہوا افسوس آنکھیں تر ہوئیں تو
کہ آنسو تھا جگر پارا ہمارا

کیا گئی جان و دل سے تاب شتاب
آنسو آتے ہیں اب شتاب شتاب

دل ہے داغ جگر ہے ٹکڑے آنسو سارے خون ہوئے
لوہو پانی ایک کرے یہ عشق لالہ زاراں ہے

اشک تو پانی سے ہیں لیکن جلتے جلتے آویں گے
دل کی لگی حیران ہے صاحب کس ڈھب اسے بجھاؤ گے

نہیں گر چوٹ دل پر گریہ و زاری کا کیا باعث
رکیں کاہے کو چشمِ تر کی خونباری کا کیا باعث

کیا روداد کہیں ہم اپنی گریہ و زارِ محبت کی
روتا سا کوئی روئے ہیں آنکھوں سے اک رود بہا

گریہ و زاری سے روز و شب کے شکوے کچھ نہیں
مجھ کو رونا ہے یہ جی کو اس سے ہے الفت بہت

ایک ہو دیں جو زبان و دل تو کچھ نکلے بھی کام
یوں اثر اے میرؔ کیا ہو گریہ و زاری کے بیچ

شوخی سے نزار گریہ کے خوں چشم میں نہیں
ویسی ہی ہے شرہ کی بعینہ تری ہنوز

گریۂ خونیں ٹک بھی رہے ہے تو خاک سی منہ پہ اڑتی ہے
شام و سحر رہتے ہیں یعنی اپنے عمل کے پیاسے ہم

گریۂ خونیں سے ہیں رخسار میرے لعلِ تر
دیدۂ خونبار یوں ہیں جیسے منہ پر گھاؤ ہو

عشق کیا ہے جب سے ہم نے دل کو کوئی ملتا ہے
اشک کی سرخی زردیِ چہرہ کیا کیا رنگ بدلتا ہے

جب سے ستارہ صبح کا نکلا تب سے آنسو جھمکتا ہے
ہر دانۂ سرشک میں تارِ نگاہ ہے
ہر لحظہ بے قراری ہر لمحہ آہ و زاری
میر نے کیا کیا ضبط کیا ہے شوق میں اشکِ خونیں کو
خوش رنگ اشکِ خونیں گرتے رہے برابر
پانی کی سی بوندیں تھیں سب اشک ہیں نہ جانا
ایک پل بھی نہ اس سے آنسو پچھے

دل تڑپا جو اس مہ بن سر کو ہمارے دھمکا ہے
اس رشتہ کی روش کہ جو ہووے گہر کے بیچ
ہر دم ہے اشکباری نومیدی ہے نظر میں
کہئے جو تقصیر ہوئی ہو اپنے لوہو پینے میں
باغ و بہار ہیں اب جیب و کنار دونوں
کپڑوں پہ گریں گے تو دے آگ جلا دیں گے
روتے مجھ کو پہر پہر گزرے

دیوانِ پنجم

دل کی تڑپ نے ہلاک کیا ہے سو کسے نے اس کے اڑائی خاک
جگر کے زخم شاید ہیں نمک بند
زردی منہ کی اشک کی سرخی دونوں اب تک تنگ ہیں
محتاجِ گل نہیں ہے گریباں غم کشاں
باغ میں شب جو روتا پھرا تھا اس بن میں سو صبح تلک
میرؔ یہ کیا روتا ہے جس سے آنکھوں پر رومال رکھا
موئے ہم تشنہ لب دیدار کے حالانکہ گریاں سے
رنگ یہ ہے دیدۂ گریاں سے آج
چیدنے بجا ہے گریہ و اندوہ و آہ کر

خشک ہوا خون اشک کے بدلے ریگ رواں سے آئی خاک
مزا کچھ آنسوؤں کا ہے سلونا
شاید میرؔ بہت رہتے ہو اس سے ہو کے جدا محظوظ
گل زار اشکِ خونیں سے جیب و کنار دیکھ
دانۂ اشک روش شبنم کے گل پر ہر کیاری میں ہے
دامن کے ہر پاٹ کو اپنے گریہ و زاری سے دریا کر
نصیب اپنے کہ سوکھی چشمِ دریا بار یا قسمت
لوہو ٹپکتا ہے گریباں سے آج
ماتم کدے کو دہر کے تو عیش گاہ کر

دیوانِ ششم

نہ کہئے گریۂ بے اختیار ہرگز میرؔ
آنسو کی بوند آنکھوں سے دونوں اب تو نکلتی ایک نہیں
لچک کمر کی جو یاد آوے اس کی بہہ جاوے
اشک نومیدانہ پھرتے ہیں مری آنکھوں کے بیچ
جدھر پھرتے تھے چنتے پھول ہنستے
قافلہ لٹ گیا جو آنسو کا
سہرے کہاں تک چڑھیں آنسوؤں کے چہرے پر

جو عشق کرنے میں دل پر کچھ اختیار رہے
دل کی طپیدن روز و شب نے خوب جگر کا لوہو پیا
کہ پانی میرؔ کے اشکوں کا تا کمر آیا
میرؔ یہ رونے سے دکھائی جان کی رخصت ہے اب
ادھر ٹپکے ہیں اب تک میرے آنسو
عشق نے میرؔ رہزنی کی ہے
گریہ گلے ہی کا ہار دیکھیے کب تک رہے

گرد و غبار وحشت وادی گریہ سے میر یکسو ہیں
قتار رونے ہنسنے میں تجھ کو اگر کریں
تمتا نہیں ہے رونا علی الاتصال کا
گریے کا میرے جوش جو دیکھا تو شرم سے
مانع ہو کیونکہ گریۂ خونیں کے عشق میں
خجلت سے آج کل کیا ان نے کیا کنارا
اب صبح و شام شاید گریہ میں رنگ آوے

رونے کے آگے ان کے تو دریا بھی ہے میر گرد ہوا
تو اختیار گریۂ بے اختیار کر
کیا اختیار گریۂ بے اختیار میں
سیلاب کو بھی دیر سرافگندگی ہوئی
ہے ربط خاص چشم کو افشائے راز سے
دریا. ہمیشہ میرے گریے سے تر رہا ہے
رہتا ہے پھر جھمکتا خوں ناب چشم تر میں

زبان

دیوانِ اوّل تا دیوانِ ششم

گو کٹے سر کہ سوزِ دل جوں شمع
اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش
آج رہتی نہیں خامے کی زباں رکھیے معاف
اب تو چپ لگ گئی ہے حیرت سے
نَیں اور قیس و کوہکن جواب زباں پہ ہیں
میر اس غزل کو خوب کہا تھا ضمیر نے
تصویر کی سی شمعیں خاموش جلتے ہیں ہم
فریادی ہجر تو تو ہو چکے مری زباں سے
ابھی اک پل میں زباں چلنے سے رہ جاتی ہے
ہم اس سے آہ سوزِ دل اپنا نہ کہہ سکے
زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں
تو اک زباں پہ چپکی نہیں رہتی عندلیب
زبانِ نوحہ گر مجلس میں قصے نے کیا ملایا تھا
مرنے میں بند زباں ہونا اشارت ہے ندیم
اتنا ہوں ناتواں کہ دمِ دل سے اب گلہ
چھوٹتا کب ہے اسیر خوش زباں

اب تو میری زبان سے نکلا
سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا
حروف کا طول بھی جو مجھ سے گھٹایا نہ گیا
پھر کھلے گی زبان تب کی بات
مارے گئے ہیں سب یہ گنہگار ایک طرح
پہ اے زبان دراز بہت ہو چلی، خموش
سوزِ دروں ہمارا آتا نہیں زباں تک
نالے کو بلبلوں کے خاطر میں بھی نہ لاؤں
دردِ دل کیوں نہیں کرتا ہے تو اظہار ہنوز
تھے آتشِ دروں سے پھپھولے زباں میں
بند مٹھی چلا جا اس چمن میں
رکھتا ہے منہ میں غنچۂ گل سو زباں کے تئیں
مری طینت میں یارب سودۂ دلہائے نالاں کو
یعنی ہے دعود کا در پیش سفر مت پوچھو
آتا ہے اک عمر میں میری زباں تلک
جیتے جی اپنی رہائی ہو چکی

آہ میری زبان پر آئی
بیت بخشی سمجھ کے کر بلبل
اس فن میں کوئی بے تہہ کیا ہو مرا معارض
ہر لحظہ خنجر درمیاں ہر دم زباں زیرِ زباں
رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری
اس شمع کی مجلس میں جانا ہمیں پھر دل سے
چاہیے پیتے گزرے اس کا نام
حیرتِ روئے گل سے مرغِ چمن
ہو گی جو جل سرِ شو پنہاں نہیں رہے گی
حال آنکہ کام پہنچ گیا کب کا جاں تلک
حسن تو ہے ہی کرد لطفِ زباں بھی پیدا
دفتر بنی کہانی بنی مثنوی ہوئی
ہیں گھاؤ دل پہ اپنے تیغِ زباں سے سب کی
یک پرچۂ اشعار سے منہ باندھے سبھوں کے
دو نہ دے کہیں سراسر
کوئی بھی اپنے سر کو کٹاتا ہے یوں ولے
کاش اے میرؔ زباں بند رکھا کرتے ہم
نالاں ہوئے کہ یاد ہمیں سب کو دے گئے
ہونٹ اپنا ہلا نہ سکے بن
اسیر میرؔ نہ ہوتے اگر زباں رہتی
منہ تکتے ہی رہے ہیں سدا مجلسوں کے بیچ
کشتہ ہوں میں تو شیریں زبانیٔ یار کا
ہماری بات کو اے شمع بزم کریو یاد
طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میرؔ
شمع ہی سر نہ دے گئی برباد
کہا ہیں دردِ دل یا آگ اگلی
بے زباں جو کہتے ہیں مجھ کو سو چپ رہ جائیں گے

یہ بلا آسمان پر آئی
دصوم ہے میری خوش زبانی کی
اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے
وہ طور وہ اسلوب ہے یہ عہد یہ پیماں ہے
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
اک زخم زباں تازہ ہر روز اٹھا جاتا
منہ میں جب تک زبان ہے گویا
چپ ہے یوں بے زبان ہے گویا
اک دن زبان ہو گا ایک ایک بال تیرا
آتی نہیں ہے تو بھی شکایت زباں تلک
میرؔ کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں
کیا شرحِ سوزِ عشق کروں میں زباں نہیں
تب درد ہے ہمارے اے میرؔ ہر سخن میں
جادو تمہارے خامے کی گویا کہ زباں میں
رہتی نہیں شمع ساں زباں لو
جل شمع کیا کروں جو نہ میری زباں بھے
صبح کے بولنے نے ہم کو گرفتار کیا
گلشن میں عندلیب ہماری زباں ہے اب
یعنی جب کھولے تو زباں تک سوچ
ہوئی ہماری یہ خوش خوانیٔ سحر صیاد
گویا کہ میرؔ محو ہیں میری زباں کے لوگ
اے کاش وہ زبان ہو میرے سخن کے بیچ
زبانِ سرخ ہی سر سبز دیتی ہے برباد
کیا کیا کہا کرے ہیں زبانِ قلم سے ہم
کشتہ اپنی زباں کے ہم بھی ہیں
پھپھولے پڑ گئے میری زباں میں
معرکہ میں حشر کے گریبات کی فرصت ہوئی

خاموش رہ سکے نہ تو بڑھ کر بھی کہہ نہ کچھ
سر شمع کا کٹے ہے زبانِ دراز سے

تالو سے زباں رات کو ہرگز نہیں لگتی
عالم ہے سیہ خانہ مری نوحہ گری سے

یوں تو دس گز کی زباں ہم بھی بتاں رکھتے ہیں
بات کو طول نہیں دیتے خدا کے ڈر سے

کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

ہرچند حرفِ جاں ہیں پہ دل جگر سے جاں تک
لیکن کبھو شکایت آئی نہیں زباں تک

زباں سے ہماری ہے صیاد خوش
ہمیں اب امیدِ رہائی نہیں

ہم نے جانا تھا سخن ہوں گے زباں پر کتنے
پر قلم ہاتھ جو آئی لکھے دفتر کتنے

جو جانوں تجھ میں بلبل تہ نہیں تو کیوں زباں دیتا
زباں کو بند سارے باغ میں مجھ کو نہ رسوا کر

نالاں تو ہیں مجھی سے پر وہ اثر کہاں ہے
گو طائرِ گلستاں سیکھے مری زباں کو

کیا کہیے جب میں نے کہا ہے میرؔ ہے مغرور اس پر تو
اپنی زباں مت کھول تو ان نے اور کہا ہے کیا کیا کچھ

ایک ہو دیں جو زبان و دل تو کچھ نکلے بھی کام
یوں اثر اے میرؔ کیا ہو گریہ و زاری کے بیچ

جوں شمع سر کٹے ہے بیاں حالِ دل کیے
لاتا زباں پہ خوب نہیں دل کے راز کو

پر کلے آگ کے تھے کیا نالہائے بلبل
شبنم سے آبلے ہیں گلبرگ سی زباں پر

کل ہی جوش و خروش ہمارے دریا کے سے تلاطم تھے
دیکھ ترے آشوب زباں کے کب بیٹھے ہیں کنار آج

اب رنج و درد و غم کا پہنچا ہے کام جاں تک
پر حوصلے سے شکوہ آیا نہیں زباں تک

کیونکہ خوش خواں نہ ہو دیں اہلِ چمن
ہم انھوں کو زبان دیتے ہیں

محو دعا تھا اکثر غیرت سے لیک گاہے
آیا نہ نام اس کا میری زباں کے اوپر

جی مارتے ہیں دلبر عاشق کا اس خطر سے
حرفِ وفا نہ آیا اپنی کبھو زباں تک

غیرت سے نام اس کا آیا نہیں زباں پر
آگے خدا کے جب ہم محوِ دعا ہوئے ہیں

مربوط کیسے کیسے کہے ریختے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

دیں گالیاں انھی نے وہی بے دماغ ہیں
میں میرؔ کچھ کہا نہیں اپنی زبان سے

گلبرگ سی زباں سے بلبل نے کیا فغاں کی
سب جیسے اڑ گئی ہے رنگینی گلستاں کی

اسرار دل کے کہتے ہیں پیر و جوان میں
مطلق نہیں ہے بند ہماری زبان میں

دماغ

دلیوانِ اوّل

ناتوانی سے نہیں بال نشانی کا دماغ
جب بے دماغی یہی ہے تو بن چکی اپنی

اچھی لگے ہے تجھ بن گلگشت باغ کس کو
دماغ و جگر دل مخالف ہوئے ہیں

رہنا یہی ہے مجھ کو تیری جفا سے ہر دم
تجھ بن دماغ صحبت اہل چمن نہ تھا

اے ہم صفیر تجھ بن کس کو دماغ نالہ
کیا اس غریب کو ہوس سایہ ہما

طوفاں بجائے اشک ٹپکتے تھے چشم سے
کاتب کہاں دماغ جواب شکوہ اٹھائیے

دل مضطرب سے گزر گئے شب وصل اپنی ہی فکر میں
دل دماغ و جگر یہ سب اک بار

میر اب کس کو دماغ گفتگو
جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
میر ہر یک موج میں ہے زلف ہی کا سا دماغ

علاج کرتے ہیں سودائے عشق کا میرے
ساکن کُو کو تیرے کب ہے تماشے کا دماغ

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
عرش پر ہے ہم نمد پوشانِ الفت کا دماغ

گئے دن عجز و نالہ کے کہ اب ہے
ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ

شیخ ہیچ خوب ہے بہشت کا باغ
ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک

دماغ چاہیے ہر اک سے ساز کرنے کو
صحبت رکھے گلوں سے اتنا دماغ کس کو

ہوئی متفق اب ادھر رائے سب کی
یہ دل دماغ دونوں کب تک وفا کریں گے

گل وا ہوئے ہزار وے ہم نہ وا ہوئے
مدت ہوئی ہماری منقار زیر پر ہے

جو اپنی بے دماغی سے کبھی نہ جَل سکے
اے ابر تر دماغ تمہارے کا جب ہیں

بس ہے یہ ایک حرف کہ مشتاق جانیے
نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا نہ شکیب تھا نہ قرار تھا

کام آئے فراق میں اے یار
عمر گزری ریختہ چھوٹا گیا

دماغ عشق ہم کو بھی کبھو تھا
جو کچھ دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا

جب سے وہ دریا پہ آکر بال اپنے دھو گیا
خلل پذیر ہوا ہے دماغ یاروں کا

آئے فردوس بھی چل کر نہ ادھر کو جھانکا
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

اوج دولت کا سا ہے یاں فقر کی پستی کے بیچ
دماغ نالہ چرخ ہفتمیں پر

کہاں دماغ ہمیں اس قدر دروغ دروغ
جائیں گے گر وفا کرے گا دماغ

کس کو دماغِ شعر و سخن ضعف میں کہ میرؔ
اپنا رہے ہے اب تو ہمیں بیشتر خیال

آہ وہ عاشق ستم ترکِ جفا کرتا نہیں
اور مطلق اب دماغ اپنا وفا کرتا نہیں

بلبل کی بے کلی نے شب بے دماغ رکھا
سونے دیا نہ ہم کو ظالم نہ آپ سوئی

گو موسمِ شباب کہاں گل کے دماغ
بلبل وہ چہچہے اتنی یاراں تلک گئے

جو کہ ہر سوتے باغ نکلے ہے
باؤ سے اک دماغ نکلے ہے

دیوانِ دوم

بلبل کے بولنے سے ہے کیوں بے دماغ گل
آپس میں یوں تو ہوتی ہے یارو ہزار بات

گو دماغ اس کی راہ سے اٹھنے کا
بیٹھے اب ہم غبار کی مانند

تھوڑے میں دُور کھینچے ہے کیا آدم آپ کو
اس مشتِ خاک کا ہے دماغ آسمان پر

کس طور اتفاق پڑی صحبت اس سے دیر
ہے میرؔ بے دماغ و قیامت کم اختلاط

آیا کیے دماغ کے اعضا میں یہ فتور
ٹھہرے قشون کیا نہیں سردار درمیاں

اس کے خیال خط میں کسے یاں دماغِ حرف
کرتی ہے بے مزہ جو قلم کی صریر ہو

تنک شراب ضعیف الدماغ ہوں ساقی
دم سحر مئے پر زور مت پلا مجھ کو

اب بھی دماغِ رفتہ ہمارا ہے عرش پر
گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملا دیا

یہی ہیں دیر و حرم اب تو یہ حقیقت ہے
دماغ کس کو ہے در در کی جبّہ سائی کا

چمن میں پھول گل اب کے ہزار رنگ کھلے
دماغ کاش کہ اپنا بھی ٹک وفا کرتا

میرؔ کی گرمی تم سے اچرج ہے
کس سے ملتا ہے وہ دماغ جلا

رندھ مٹنے سے جی کے کس کو رہا ہے دماغِ حرف
دم لینے کی بھی ہم کو تو فرصت نہیں رہی

ایسے آزار اٹھانے کا ہمیں کب تھا دماغ
کوفت نے جی کی تو جینے سے بھی بیزار کیا

چشم و دل و دماغ و جگر سب کو رو رہے
اس عشقِ خانہ سوز نے کیا کیا دکھاتے داغ

دماغ اور دل ہیں سراسیمہ دو لق
سرِ زخم شاید کہ پہنچا جگر تک

دیوانِ سوم

صحبت کسو سے رکھنے کا اس کو نہ تھا دماغ
تھا میرؔ بے دماغ کا بھی کیا بلا دماغ

باتیں کرے پریشگیٔ دل کی پر کہاں
کرتا ہے اس دماغ جلے کا وفا دماغ

گو دماغ و جگر کہاں وہ قلب
یاں عجب ایک انقلاب ہے میاں

کرے گا کون قیامت کو دیسماں بازی
افسوں ہی کے تو دل شدہ ہم رُو سیاہ ہیں
کیا کہئے دماغ اس کا کہ گلگشت میں کل میرؔ
تھا کس کو دماغ باغ اس بن
دو حرف زیرِ لب کہے پھر ہو گیا خموش
آتش زبانی شمع نمط میرؔ کی بہت
کب بے دماغی شہر سے دیتی ہے اٹھنے میرؔ
کس کو دماغ رہا ہے اب یاں اس کی ضدیں اٹھانے کا
جب دیکھتے ہیں میرؔ تمہیں بے دماغ ہو
کس کو فقیری میں سرِ ذل حرف کا ہے میرؔ
مجھ کو دماغِ وصفِ گل و یاسمن نہیں
اٹھتا ہے بے دماغ ہی ہر چند رات کو

دل و دماغ گزارِ صراط مجھ کو نہیں!
ہو تخت کچھ دماغ تو ہم بادشاہ ہیں
گل شاخوں سے جھک آئے پر منہ نہ لگایا
بلبل نے بہت مجھے پکارا
یعنی کہ بات کرنے کا کس کو رہا دماغ
اب چاہیئے معاف رکھیں جل گیا دماغ
یوں تو خیالِ وادیٔ مجنوں کروں ہوں میں
چار پہر جب محنت کریئے تب وہ باتیں ملنے دو
کل ہے کو ناز عشق میں صاحب دخیل ہے
کرتے ہیں اس دماغ پہ ہم انکسار اور
ہم جنس نسیم بادہ فروشِ چمن نہیں
افسانہ کہتے سیکڑوں افسوں کروں ہوں میں

دیوانِ چہارم

ہوا جو دل خوش خیالی آئی ہر ایک اعضا میں ہے فتور اب
عشق کی شان اکثر ہے ارفع لیکن شانیں عجائب ہیں
مت کرو شور و فغاں سے طائرِ آزارِ دل
عشق نے دے کر آگ یکایک شہرِ تن کو پھونک دیا
سارے بہت جھکانے لگے خاک کی طرف
میں بے دماغِ عشق اٹھا سو چلا گیا
کس کو دماغ اب اس سے رہا یاں آٹھ پہر کی منت کا
کیا سرِ جنگ و جدل ہو بے دماغ عشق کو
باغ میں جا کر ہم جو رہے تو اور دماغ آشفتہ ہوا
کیا ضعف تن میں ہے جگر و دل دماغ بن
اکثر کی بے دماغی ہر دم کی سر گرانی
غمِ محبت میں میرؔ ہم کو ہمیشہ جلنا ہمیشہ مرنا
ضعفِ دماغی جس کو ہوئے عشق کے رنج و محنت سے

حواس گم ہیں دماغ گم ہے رہا سہا بھی گیا شعور اب
گھساری ہے دماغ و دل ہیں گا ہے سب سے جدا ہے عشق
اب دماغ اڑتا ہے باتوں میں کہ ہوں بیمارِ دل
دل تو جلا ہے دماغ جلا ہے اور جلا ہے کیا کیا کچھ
شاید کہ میرؔ جی کا دماغی خلل گیا
بلبل پکارتی ہی رہی گلستاں کے بیچ
ربطِ اخلاص سے دن گزرے ہے خلطاس سب موقوف
صلح کی ہے میرؔ میں ہفتاد و دو ملت سے یل
کیا کیا ہمارے سر پہ آ کر بلبل شب چلاتی ہے
پوچھے جو اس قشون میں سردار کوئی ہو
اب کب اٹھائی جاوے یہ زور ناتوانی
صعوبت ایسی دماغ رفتہ کہاں تلک ہم وفا کریں گے
جی بھی سنبھلتا ہے اس کا پر بعد از دیر سنبھلتا ہے

دیوانِ پنجم

چپکا چلا گیا مَیں آزردہ دل چمن سے
کس کا دماغ اتنا بلبل کو جو پکارے

فریادِ شب کی سن کے کہا بے دماغ ہو
دیکھو تو اس بلا کو شاید کہ میرؔ ہو

دماغِ ناز برداری نہیں ہے کم دماغی سے
کہاں تک ہر گھڑی کے روٹھے کو پھر پھر مناؤں گا

بادشاہِ وقت تھا مَیں تخت تھا میرا دماغ
جی کے چار دن اور اک جوشِ گلِ تریاک تھا

کس کو دماغِ جواب رہا ہے ضعف سے اب خاموش ہے
پہروں بکتا نصیحت گر سے میرؔ یہ ہے طاقت کی بات

شوریدہ سر رکھا ہے جب سے اس آستاں پر
میرا دماغ تب سے ہے ہفتم آسماں پر

سوچتے آتے ہیں جی میں پر پگڑی پر گل رکھے سے
کس کو دماغ رہا ہے اس کے جو حرفِ خشن اٹھا دے گا

بوئے خوں بھک بھک دماغوں میں چلی آتی ہے کچھ
نکلی ہے ہو کر صبا شاید کسو گھائل کے پاس

قحطِ مروت اب جو ہوا ہے کس کو دماغ بادہ کشی
ابر آیا سبزہ بھی ہوا کرتا نہیں کوئی ہوا کی طرف

ضعفِ دماغ سے افتاں خیزاں چلتے ہیں ہم راہِ ہوس
دیکھیں کیا پیش آوے اب تو گرتے پڑتے جاتے ہیں

دیوانِ ششم

چاہتا ہے دردِ دل گرِ ناکسوں کے دل دماغ
سو دماغ اپنا ضعیف اور قلب بے طاقت ہے اب

سب گئے دل دماغ تاب و تواں
میں رہا ہوں سو کیا رہا ہوں مَیں

مَیں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا
وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اٹھائیے

وہ دل نہیں رہا ہے نہ اب وہ دماغ ہے
جی تن میں اپنے بجھتا سا کوئی چراغ ہے

ہجراں میں تک نہ پہنچے کوہ اور راغ میں ہم
بوئے وفا نہ پائی دل میں دماغ میں ہم

اپنے ہوتے تو باعتاب رہا
بے دماغی سے باخطاب رہا

بلبل کا شور سن کر نہ مجھ سے رہا گیا
مَیں بے دماغ باغ سے اٹھ کر چلا گیا

دماغ اپنا تو اپنی فکر ہی میں ہو چکا یکسر
خیال اب کس کو ہے اے ہمنشیں نازک خیالی کا

کس کو دماغِ سیرِ چمن ہے کیا ہجراں میں واشد ہو
کم گلزار میں اس بن جا کر آتا ہوں بیزار بہت

اظہارِ کم فراغی ہر دم کی بے دماغی
ان روزوں میرؔ صاحب کچھ میرزا ہوئے ہیں

اٹھا جو باغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا
ہزار مرغِ گلستاں مجھے پکار رہے

کسے ہے رنج و غم والم سے دماغ سر کے اٹھانے کا اب
معیشت اس کی زمانے پر تو ہمارے اوپر زمانہ ہے

بات کا ہم سے ان کو کب ہے دماغ
میرؔ درویشی میں امیر ہوئے

اٹھوں نہ خاک سے کشتہ بس کم نگاہی کا
دماغ کس کو ہے محشر کی داد خواہی کا

گردن (گلا/حلق)

دیوانِ اوّل تا دیوانِ ششم

شمع ساں جلتے رہے لیکن نہ توڑا یار سے
رہی نہ تھی دم کی کشاکش گلے میں کچھ باقی
خوبی کا اس کی بسکہ طلب گار ہو گیا
رہیں ہوں برسوں سے ہمدوش پر کبھو اُن نے
حاصل نہ پوچھو گلشنِ مشہد کا بوا لہوس
اس قیدِ جیب سے میں چھوٹا جنوں کی دولت
تری خاموشی سے قمری، ہوا شورِ جنوں رُسوا
ناموسِ دوستی سے گردن بندھی ہے اپنی
جنگل میں خشک ہو رگ ہائے گردن
یہ غلط کہ میں پیا ہوں قدحِ شراب تجھ بن
دیوانہ ہوں کہ گریباں سے تنگ ہوں
وہ تو گلے لگا ہوا سوتا تھا خواب میں
سرو گر پاؤں پہ قاتل کے کٹائی گردن
تھی خواہش دل رکھنا حمائل
گردن کشی کیا حاصل مانند بگولے کے
چمن میں جا کے جو میں گرمِ وصفِ یار ہوا
جب سے ناموسِ جنوں گردن بندھا ہے تب سے میر
تیغ کی اپنی صفت لکھتے جو کل وہ آ گیا
عید آئندہ تک رہے گا گلہ
گردن بلند کرتے ہی ضربت اٹھا گئے
شیشہ ان نے گلے میں ڈلوا شہر میں سب تشہیر کیا
عیدیں آئیں بارہا لیکن نہ وے آ کر ملے
گئے روز اب دید وادید ہے

رشتۂ الفت تمامی عمر گردن میں رہا
سو اس کی تیغ نے جھگڑا ہی انفصال کیا
گل باغ میں گلے کا مرے ہار ہو گیا
گلے میں ہاتھ مرے پیار سے نہ ڈال لیا
یاں پھل ہر اک درخت کا حلقِ بریدہ تھا
ورنہ گلا یہ میرا جوں طوق میں پھنسا تھا
ہلاکت طوقِ گردن کو بھی ظالم باغ میں غل کر
جیتے ہیں جب تلک ہم تب تک نباہتے ہیں
گریباں کی سی تاریں ہو گئی ہیں
نہ گلے سے میرے اترا کبھو قطرہ آب تجھ بن
گردن مری ہے طوق میں گویا کہ پھنس رہی
بخت اپنے سو گئے کہ جو بیدار ہو گئے
اپنے ذمے سے تو صد شکر کہ ہم پاک ہوئے
گردن میں اس کا ہر گاہ دبے گاہ بے
اس دشت میں سر کاٹنے جوں سیل چلا جاتا
گل اشتیاق سے میرے گلے کا ہار ہوا
جیب جاں وابستۂ زنجیر تا داماں ہوا
ہنس کے اس پرچے کو میرے ہی گلے بندھوا گیا
ہو چکی عید تو گلے نہ ملا
خنجر رکھے ہے اس کا علاقہ گلو کے ساتھ
ہائے سیہ رُو عاشق کی عالم میں کیا رسوائی ہوئی
رہتے ہیں ان کے گلے لگنے کے برسوں سے گلے
گلے سے ہمارے لو عید ہے

عید ہی کاش کے رہے ہر روز
گردن کشِ زمانہ تیرا اسیر ہے
علاقہ میرؔ تھا خنجر سے اس کے
نکلی تھی اس کی تیغ ہوئے خوش نصیب لوگ
گلے بل عیدِ قرباں کو سبھوں کے
گئے جس دم سے ہم اس تند خُو پاس
جس طرح کفر بند صاہے گلے اسلام کہاں
اب عید بھی بغیر ملے اس کے ہے رہا
باغ میں اب آجاتے ہیں تو صرفہ ہمارا چپ میں ہے
گو کہ گردن تیئں یاں کوئی لہو میں بیٹھے
ہوئے برسوں کہ وہ ظالم رہے ہے مجھ پہ کچھ ٹیڑھا
سر اٹھانے کی نہیں ہے ہم کو فرصت عشق میں
کشتے ہیں ہم تو ذوقِ شہیدانِ عشق کے
مر رہے یوں صید گاہ کی کنج میں تو حسن کیا
تپش کے دم ہی تئیں مجھ سے ہے یہ خوں گرمی
ہار کر ہمیں تو کاٹتا تھا گلا
اب تو بدن میں سارے اک پھنک رہی ہے آتش
ہم کیا کریں علاقہ جس کو بہت ہے اس سے
گو لگ گیا گلے مَیں مت کھینچ تیغ مجھ پر
گلے لگنے بن اس کے ایسا روئے
کیا کہیں ہم کہ گلے ڈالے پھریں مستی میں
ہزار فاختہ گردن میں طوق پہنے پھرے
کیا جانیں گے کہ ہم بھی عاشق ہوئے کسو پر
گلا مت توڑ اپنا اے جرس بس
گلے میں گیروی کفنی ہے اب میرؔ
خمیازہ کش ہوں اس کی تمنت سے اس ادا کا
ہو لطف اسی کا تو کوئی کام کو پہنچے

گلے اس کے صبح ملا کرئیے
سلطانِ عصر تیری گلی کا فقیر ہے
ندان اپنا گلا ہم نے کٹایا
گردن جھکائے مَیں تو سنا یہ، اماں ہے اب
ہمارا آہ تم کاٹو گلا مت
رہے خنجر ستم ہی کے گلو پاس
یوں تو تسبیح بھی ہم رکھتے ہیں زنار کے پاس
رہتا تھا جو گلے ہی ہمارے لگا ہمیش
خوبی بیاں کہ تیری ہم کیا گُل کو گلے کا ہار کریں
ہاتھ اٹھاتا ہے جفا سے وہ ستمگار کہاں
کوئی اس تیغ بر کف کو گلے میرے لگا دیوے
ہر دم اک تیغِ جفائے تازہ یاں گردن پہ ہے
تیغِ ستم کو دیر گلے سے لگا رہے
عشق تب ہے جب گلے کو زیبِ خنجر دیکھئے
وگرنہ تیغ تری کب گلے لگاتی ہے
وہ قماری گلے کا ہار آیا
وہ مہہ گلے سے لگتا تو یوں جگر نہ جلتا
رکھ دیتے ہیں گلے پر خنجر نکال اس کا
اپنے گنہ کا ئیں تو کرتا ہوں اعتراف اب
کہ ہم ہیں گے گلے تک آب میں اب
دانے سبحے کے پرو رشتۂ زنار کے بیچ
اسے خیال نہیں کچھ وہ سرو ہے آزاد
غصّے سے تیغ اپنے اکثر رہی گلو پر
نہیں اس راہ میں فریاد رس، بس
تمہاری میرزائی ہو چکی بس
لگ کر گلے سے میرے انگڑائی لے جا ہا
تسبیح گلے ڈال یا زنار رہو تم

اب تو گلے بندھا ہے زنجیر و طوق ہو نا
اسیر زلف کو اس بت کے کیا قید مسلمانی
وہ نہیں جو تیغ سے اس کے گلا کٹوا میے
پھاڑ کے خط کو گلے میں ڈالا شہر میں سب تشہیر کیا
اچھی ہے اس کی تیغ تو باندھو گلے سے میر
اک گردن سے سوحق باندھے کیا کیا کہیے ہوں جو ادا
میں نہ گردن کٹائی جب تک میر
لڑائی ہی رہی روزوں میں باہم بے دماغی سے
ہاتھ گلے میں ان نے ڈالا میں یہ گلا جا کاٹوں گا
گردن کشی سے اپنی مارے گئے ہم آخر
صورت اس کی مری کھینچی تھی گلے لگتے ہوئے
ہم گلا کاٹتے ہی تھے اپنا
پوشاک تنگ پہنے بارے کہاں چلے تم
صبر کہاں جو تم کو کہئے لگ کے گلے سے سو جاؤ
لب کی سفر کو ہم سے وہ مہ جدا گیا ہے
تیغ تلے ہی اس کے کیوں نہ گردن ڈال کے جا بیٹھیں
راتوں پاس گلے لگ سوتے ننگے ہو کر ہے یہ عجب
گلوگیر ہی ہو گئی یاوہ گوئی
صد پارہ گلا تیرا ہے کر ضبط نفس بس
ایک دن ملئے دراز اس کے کہیں دیکھے تھے میں

عشق و جنوں کے اپنے ناموس دار ہیں ہم
تمنا ہے گلا زنار سے اپنا بندھاؤں میں
تنگ آئے ہیں بہت اب آپ ہیں جو مر رہیں
سامنے ہوں قاصد کے کیونکر اس سے میں شرماتا ہوں
مرتا ہوں میں تو آگے مرے مت صفت کرو
مدت اس پر ایک نفس جوں صبح ہماری فرصت کی
عشق کے مجھ سے حق ادا نہ ہوئے
گلے سے اس کے ہم کو عید اب شاید ملا دیوے
غم غصہ سے دیکھیو ہوں گا آپھی گلے کا ہار اپنا
عاشق اگر ہوئے تھے ناز و غرور کیا تھا
سو جفا کار نے تقاش کو گردن مارا
تو گلے کا ہوا ہے ہار عبث
ہے آج عید صاحب میرے گلے لگو تم
بولو نہ بولو بیٹھو نہ بیٹھو کھڑے کھڑے ٹک ہو جاؤ
رخصت میں لگ گلے سے چھاتی جلا گیا ہے
سر تو آخر کار ہمیں بھی خاک کی اور جھکانا ہے
دل کو بے پردہ نہیں ملتے ہم سے شرماتے ہیں ہنوز
رہا ہیں خموشی کو آواز کتنا
سُنتا نہیں اس قافلے میں کوئی جرس بس
ہیں گلے کے ہار اب وے بال بل کھائے ہوئے

متفرّق

(۱) چہرہ (رُو ۔ رُخ)

دیوانِ اوّل تا دیوانِ ششم

کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا
کب رو تھا اس سے بات کے کرنے کا مجھ کو میر
ناکردہ جرم میں تو گنہگار ہو گیا

رہے خیال تنک ہم بھی رُو سیاہوں کا
لے کہیں منہ پہ نقاب اپنے کہ اے غیرتِ صبح
ایسی ہے میرؔ کی بھی مدت سے روئی صورت
دیکھا جو اوس پڑتے گلشن میں ہم تو آخر
روئے عرق فشاں کو بس پونچھ مت گرم ہو
تو گرفتارِ دامِ زلف اُس کا
کیا ہے گر بدنامی و حالت تباہی بھی نہ ہو
رُو سفیدی ہے نقابِ رُخِ شورِ مستی
شام شبِ وصال ہوئی یاں کہ اس طرف
گیا نظر سے جو وہ گرم طفلِ آتش باز
کیا حرف دلنشیں ہو مرا جیسے خط مدام
کیا اے سایۂ دیوار تو نے مجھ سے رُو پنہاں
وہ گل کو خوب کہتی تھی میں اس کے رُو تئیں
اپنی یگانگی ہی کیا کرتے ہیں بیاں
ایسا فقیر ہونا بھلا کیا ضرور تھا
یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رُخِ زرد پر مرے
پھرے کب تک شہر میں اب سُوئے صحرا رُو کہاں
کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں
کیا لعلِ لب کسو کے لیے میر سیت چڑھے ہیں
بھڑکا تھا رات دیکھ کے وہ شعلہ خُو مجھے
دیکھ رُوئے زرد پر بھی میرے آنسو کی ڈھلک
کب ناخنوں سے چہرہ نُچے اس صفا سے ہوں
رخ رونا ہر دم کا شاہد دو جب ایسے ہوں
رکھتے تو ہو مکدر پر اس گھڑی سے ڈریو
یوں خاک منہ پہ مل کر کب تک پھرا کروں میں
ضبط تھا جب تئیں چاہت نہ ہوئی تھی ظاہر
از ہم قطعہ شب سلیے چہرہ چلے آئے

لگے ہو خون بہت کرنے بے گناہوں کا
شمع کے چہرۂ رخشاں سے تو اب نور گیا
چہرے پہ اس کے کس دن آنسو رواں نہ پایا
گل کا وہ رُوئے خنداں چشمِ پُر آب نکلا
اس گل میں کیا رہے گا جس کا گلاب نکلا
ہے یہی رُو سیاہ مت پوچھو
عشق کیسا جس میں اتنی رُو سیاہی بھی نہ ہو
ریشِ قاضی کے سبب پنبۂ ہاں ہے شیشہ
ہونے لگا طلوع ہی خورشیدِ رُو سیاہ
ہم اپنے چہرے پہ اڑتی ہوائیاں دیکھیں
اغیارِ رُو سیہ ترے منہ لگا کیے
مرے اب دھوپ میں جلنے ہی کا آتا ہے پیدا
بلبل سے آج باغ میں جھگڑے بڑے رہے
اغیار رُو سیہ بہت یار ہو گئے
دونوں جہاں میں میرؔ عبث رُو سیہ ہوا
کہتا ہے میرؔ رنگ تو اب کچھ نکھر چلا
کام اپنا اس جنگل میں ہم نے بھی یکسو کیا
کیا عشق میں ہوا ہے اے میرؔ حال تیرا
چہرے پہ تیرے ہر دم بہتا رہے ہے خونناب
کچھ رُو سیہ رقیب نے شاید لگائی بات
اے کہ تو نے دیکھی ہے غلطانی گوہر بہت
رکھو اثر تم نہیں ہو جو دیکھو ہنر کے تئیں
چاہت کا انصاف کرو تم کیونکر ہم انکار کریں
جب خاک منہ پہ مل کر یہ رُو سیاہ نکلے
یارب زمیں پھٹے تو یہ رُو سیہ سمانے
اشک نے بہہ کے مرے چہرے پہ طوفان کیا
قیامت شور ہو گا حشر کے دن رُو سیاہی کا

زردیٔ چہرہ اب تو سفیدی کو پہنچ گئی
بچا رہتا تھا جس سے چہرہ سو اب
کیا سمجھے لطف چہروں کے رنگ و بہار کا
اپنی عزلت رکھتی ہے عالم ہی اور
گو شوق سے ہو دل خوں مجھ کو ادب وہی
دل عاشق کو رو کیا جانے خوباں کہیں نہیں دیتے
دل کو کہیں لگنے دو میرے کیا کیا رنگ دکھاؤں گا
ان ہونٹوں کا حریف ہو ظلمات میں گیا
رنگ نہ بدلے چہرے کا کیونکہ آنکھیں بیٹھی نہ جائیں کہیں
خالی ہاتھ سیاہ رو ایسے کاہے کو تھے گر یہ کتاں
کیا میرؔ پھر ثبات سے رو شوئے دل کریں
شیشہ انہوں نے گلے میں ڈلوا شہر میں سب تشہیر کیا
پوچھو اسی سے مضطرب الحال دل کی یہ کچھ
ایسا چہرے پہ ہے نہوں کا خراش
جس خود نما تک جاؤں ہوں اس سے سنوں ہوں دور دور
کیا پھر نظر چڑھا ہے اے میرؔ کوئی خوش رو
کچھ تدبیر بتاؤ ہم کو دل اپنا ہے درد آلود

وہ رنگ آگے کا سا پیارے نہیں ہے اب
گریباں میں ہے وہ دست ہنر مند
بلبل نے اور کچھ نہیں دیکھا سوائے گل
یہ سیہ رو شہرۂ آفاق ہے
میں رو کبھو نہ رکھا گستاخ اس کے رو پر
بہت آئینہ سے تو ربط ہے صاحب جمالوں کو
چہرے پہ خون ناب ملوں گا پھول سے گل کھاؤں گا
پردے میں رو سیاہ ہے آبِ حیات کا
کیسے کیسے غم کھاتے ہیں کیا کیا رنج اٹھاتے ہیں
جن روزوں درویش ہوئے تھے پاس ہمارے دولت تھی
ایسے نہیں گئے ہیں سکون و قرارِ دل
ہائے سیہ رو عاشق کی عالم میں کیا رسوائی ہوئی
آہ آفتابِ چہرۂ روشن ضمیر ہے
جیسے تلوار منہ پہ کھائی ہے
کیا منہ لگاوے اب کوئی اس رو سیہ بد نام کو
یہ زرد زرد چہرہ تیرا اتر رہا ہے
خاک اڑاتے پھریں کہاں تک چہرہ سب ہے گرد آلود

(ب) رُخسار

رخسار پر ہمارے ڈھلکنے کو اشک کے
چمن بھی ترا عاشقِ زار تھا
دل کے ثبات سے ہم نومید ہو رہے ہیں
کچھ رنج دلی میرؔ جوانی میں کھنچا تھا
جوں آبگیری کردہ شمشیر کی جراحت

دیکھے ہے جو کوئی سو کہے ہے گہر خیال
گلِ سُرخ اک زرد رخسار تھا
اب وہ سماں ہے خوں ہو رُخسار پہ بہے دل
زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک
ہے ہر خراش ناخن رخسارہ و جبیں!

(ج) پیشانی (جبیں۔جبہ۔ماتھا)

محرومِ سجدہ آخر جانا پڑا جہاں سے
ماتھا کیا ہے صرفِ سجودِ درِ بتاں
ہر خراشِ جبیں جراحت ہے
خاک پر ہے سدا جبینِ نیاز
تلواریں کتنی کھائی ہیں سجدہ میں اس طرح
فرو نہ آوے سراس کا طوافِ کعبہ سے
میرؔ ہم جبہ خراشوں سے کسو کا ذکر کیا
غنچہ پیشانی چمن میں میں رہا
شکر کے سجدوں میں یہ واجب تھا
دست بستہ کام ناخن کر گئے
اتنی جبین رگڑی کہ سنگ آئینہ ہوا
مت اس چمن میں غنچہ روش بود وباش کر
یونہی ہے سینہ کوبی اگر دل کی چاہیے داد
جبہ نوچا منہ نوچا سب سینہ نوچا ناخن سے
غصہ میں ناخنوں نے مرے کی ہے کیا تلاش
بے نصیبی سے ہوئے ہم موسمِ گل میں اسیر
باغ میں آئے ہیں پر اس گلِ تر بن یکسو
جو لکھی قسمت میں ذلت ہو سو ہو
ہر اک خراشِ ناخن جبہے سے صد رنگ ہے
گئے ہیں میرؔ کافر ہو کر خدا کے گھر میں
نسبت اس آستاں سے کچھ نہ ہوئی

جوشِ جباہ سے ہم نے وہ آستاں نہ پایا
مانندِ ماہِ نو کے مرے اب جبیں نہیں
ناخنِ شوق کا ہنر دیکھو
اور ہو کوئی جبہ سا کیا خاک
فریادی ہوں گے مل کے لہو کو جبیں سے ہم
نصیب جس کو ترے در کی جبہ سائی ہو
وہ ہنر ہم میں ہیں جو تھے تیشۂ فرہاد میں
بے دماغِ عشق گل کیا بُو کرے
یہ بھی کرتا سدا جبیں سائی
سب خراشوں ہی سے جبہے بھر گئے
آنے لگا ہے منہ نظر اس آستاں کے بیچ
مانندِ گل شگفتہ جبیں یاں معاش کر
پیشانی کو سلیقے سے دکھلا خراش کر
میرؔ نے کی ہے غم غصے میں اپنی یہ بد حالی طرح
تلوار کا سا گھاؤ ہے جبہے کی ہر خراش
تھے نہ پیشانی میں اپنے سجدہ ہائے پائے گل
غنچہ پیشانی و دل تنگ و خفا بیٹھے ہیں
خطِ پیشانی کوئی کیونکر مٹائے
رجھوار ہو تو پوچھے کوئی ہمیں ہنر سے
پیشانی پر ہے قشقہ زنار ہے کمر میں
مدتوں ہم نے جبہ سائی کی

ناخُن (د)

کبھو عاشق کے ترے جیبھے سے ناخن کا خراش
چہرے پر ایک زخم ہے ناخن کا ہر خراش
تیشے سے کوہکن کے کیا طرفہ کام نکلا
کب ناخنوں سے چہرہ نچے اس صفا سے ہمیں
ہم نے تو ناخنوں سے منہ سارا نوچ ڈالا
اس گل تر کی قبا کے کہیں کھو تھے بند
ے موئے سر سے ناخنِ پا تک بھری ہے آگ
دست بستہ کام ناخن کر گئے
آلودہ خوں سے ناخن ہیں شیر کے سے ہر سُو
بند اس قبا کے کھولیں کیا ناخنِ فقیرا ں
ان حنائی دست و پا سے دل لگی سی ہے ابھی
دل کی گرہ نہ ناخنِ تدبیر سے کھلی

خطِ تقدیر کے مانند مٹایا نہ گیا
اب دیدنی ہوئی ہیں مری دستکاریاں
اپنے تو ناخنوں میں اس طرح کا ہنر تھا
رجھوار ٹم نہیں ہو جو دیکھو ہنر کے تئیں
اب کوہکن دکھاوے رہتا ہے گرہ ہنر کچھ
رنگوں گلبرگ کے ناخن ہے معطر اپنا
جلتے ہیں دردمند پہ جلتے کڈھب ہیں یہ
سب خراشوں ہی سے جیبھے بھر گئے
جنگل میں چل بنے تو ہے پھول زور ڈھاکا
وابستہ ہے یہ عقدہ شاید کشودہا کا
میں نے ناخن بندی اپنی عشق میں کی ہے ابھی
عقدہ کھلے گا میر یہ مشکل کشا کے ہاتھ

بغل (ہ)

کھینچا بغل میں میں جو اسے مست پا کے رات
کسو سے حرفِ محبت کا فائدہ نہ ہوا
تو بھی تو مختلط ہو سبزے میں ہم سے ساقی
آج ہمارے گھر میں آیا تو کیا ہے یاں جو نثار کریں
شب اس کو میں نے دیکھا سوتا بغل میں اپنے
ہم بغل اس سنگدل کے کاشکے اس دم ہوں جب
تھی شب کسی کسائی تیغِ کشیدہ کف میں

کہنے لگا کہ آپ کو بھی اب نشا ہوا
بغل میں میں تو لیے یاں بہت کتاب پھرا
لے کر بغل میں ظالم مینائے بادۂ ناب
الا کھینچ بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں
اس خواب کی نہ کرنی تعبیر ہے مناسب
شیشہ مرے پاس ہووے اور وہ مخمور ہو
پر میں نے بھی بغل میں بے اختیار کھینچا

مرا رنگ اڑ گیا جس وقت سنگِ محتسب آگے

دیوانِ میر صاحب ہر اک کی ہے بغل میں
بغل پروردۂ طوفاں ہمیں یہ موج ہے میری

بغل سے گر پڑا مینا و ساغر چھوڑ ہو چھوٹا

دو چار شعر ان کے ہم بھی لکھا رکھیں گے
بیاباں میں اگر روؤں تو شہروں میں بھی آب آوے

(و) گوش/کان

نالہ ہمارا ہر شب گزرے ہے آسماں سے
کان رکھ رکھ کے بہت دردِ دلِ میر کو تم
سُن اے بے درد گلچیں غارتِ گلشن مبارک ہے
پیغام بے غرض بھی سنتے نہیں ہیں خوباں
پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبر میر
سُن گوشِ دل سے اب تو سمجھ بے خبر کہیں
اتنی بھی حرف ناشنوی غیر کے لیے
گوشِ دیوار تک تو جا نالے
نالۂ قیدِ قفس سے چھوٹ اب اک دم نہیں
رہا میں در پسِ دیوارِ باغ مدت لیک
حُسن کو بھی عشق نے آخر کیا حلقہ بگوش
تفنگ اس کی چلی آواز پر لیک
نہ رکھو کان نظمِ شاعرانِ حال پر اتنے
یوں کانوں کان گُل نے نہ جانا چمن میں آہ
سُن کان کھول کر کہ تنک جلد آنکھ کھول
مہلت تنک بھی ہو تو سخن کچھ اثر کرے
بھس تو نالاں زیرِ دیوارِ چمن پہ ضعف سے
دو نغرولیں ہی میں شب کے ہو گا مکان ہُو کا
آگ سا تو جو ہوا اے گُلِ تر آن کے بیچ
شور نہیں یاں سنتا کوئی میر قفس کے اسیروں کا

فریاد پر ہماری کس دن تو کان دے گا
سنتے تو ہو پہ کہیں ورد نہ ہو کان کے بیچ
پہ ٹک گوشِ مروت جانبِ فریادِ بلبل کر
پہنچی نہ گوشِ گل تک آخر دعائے بلبل
کیا کہہ گئی نسیمِ سحر گل کے کان میں
مذکور ہو چکا ہے مرا حال ہر کہیں
رکھ کان ٹک سنا بھی کرو بات کے تئیں
اس میں گل کو بھی کان ہوتے ہیں
گوشِ گل سے لگتے تھے جا کے سو وہ موسم نہیں
گئی گلوں کے نہ کانوں تلک فغاں میری
رفتہ رفتہ دلبروں کے کان میں بالے پڑے
گئی ہے میر گولی کان پر سے
چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے
سر کو پٹک کے ہم پسِ دیوار رہ گئے
غافل یہ زندگانی فسانہ ہے خواب ہے
میں اٹھ گیا کہ غیر تیرے کان آ لگا
گوشِ زدِ گل کے نہیں ہوتا مرا شیون کبھو
سُن رکھیو کان رکھ کر یہ بات بستی والو
صبح کی باد نے کیا پھونک دیا کان کے بیچ
گوش نہیں دیوارِ چمن کے گل کے شاید کان نہیں

میرؔ نہ اپنے دردِ دل کو مجھ سے کہا کر روز و شب
پی پی کر اپنا لہو رہیں گو کہ ہم ضعیف
یارب ہے کیا مزہ سخنِ تلخ یار میں
اس ماہ کے گوش تک تو ہرگز نہیں پہنچتی
کیا سُنا حرفِ شگونِ وصلِ یار
روتے ہیں لوگ اکثر سُن سرگزشتِ عاشق
سحر گوشِ گل میں کہا میں نے جا کر
دعویٰ ہے اس کا یونہی ترے حسن گوش پر
شاید کسو میں اس میں بہت ہو گیا ہے بعد
پھرا مت میرؔ سر اپنا گراں گوشوں کی مجلس میں
گوش زد چٹ پٹ ہی مرنا عشق میں اپنا ہوا
اس کے در پر شب نہ کر آے دل خروش
دوستوں کا دردِ دل کچھ گوش کر
گوش ہر اک کا اسی کی اُدھر ہے
جب گوش زد ہوا اس کے تب بے دماغ ہو وہ
دردِ دل ان نے کب سُنا میرا
کان لگا رہتا ہے غیر اس شوخ کماں ابرو کے بہت
آنکھوں کی طرف گوش کی در پردہ نظر ہے
سُنی سُنائی بات سے واں کی کب جیتے ہیں ہم غافل
عشق میں ہوش و صبر سُنتے تھے
تھے دنیا میں میرؔ بہت سُنے
کان اس طرف نہ رکھے اس حرف نا شنو نے
صوم و صلواۃ یک سو میخانے میں تھے ہم
تاثیر کیا کرے سخنِ میرؔ یار میں

صبح جو گوش دل سے سنا تھا دل ہیں میرے درد ہوا
جوں رینگتی نہیں ہے انھوں کے تو کان پر
رہتے ہیں کان سب کے اسی بدزباں کی اُور
گو آہ بے سرایت جاتی ہے آسماں پر
یوں تو فالِ گوش ہم نے لی بہت
تو بھی تو گوش واکر ٹک میری داستاں پر
کھلے بند مرغِ چمن سے ملا کر
یاں کس نتھو کے ہے صدفِ ہرزہ گوش پر
تم بھی تو گوش رکھو جرس کے خروش پر
سُنے کوئی تو کچھ کہئے بھی اس کہنے سے کیا حاصل
کس کو اس بیماریٔ جانکاہ سے فرصت ہوئی
کہتے ہیں دیوار بھی رکھے ہے گوش
گر نصیبِ دشمناں ہے دردِ گوش
کیا قیامت کا قیامت شور ہے
بس ہو چکی توقع اب نالۂ سحر سے
لگے رہتے ہیں اس کے کان سے لوگ
اس تو گناہِ عظیم پہ یارو ناک ہیں اس کے تیر کرد
کچھ یار کے آنے کی گرگرم خبر ہے
دونوں کان بھرے ہیں اپنے بے تہہ یاں کے فسانے سے
رکھ گئے ہاتھ سو تو کانوں پر
نہ رکھو گوش ان فسانوں پر
کہتے رہے بہت ہم اس کو سُنا سُنا کر
آواز بھی نہ آئی کانوں میں یاں اذاں کی
جب دیکھو لگ رہا ہے کوئی اس کے کان سے

(ذ) تن / بدن / قالب / جسم

اب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ
دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا

عریاں تنی کی شوخی سے دیوانگی میں میرؔ
ادھر آ کر شکار افگن ہمارا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
اک وہم سی رہی ہے اپنی نمود تن میں

نہیں جُز عرش جاگہ راہ میں دم لینے کو اس کے
کیا کیا عزیز خلع بدن ہائے کر گئے

صد گلستاں تہِ یک بال تھے اس کے جب تک
بہہ بھی گیا بدن کا سب ہو کے گوشت پانی

عریاں تنی کی شوخی وحشت میں کیا بلا تھی
جرس راہ میں جملہ تن شور ہے

عریاں پھریں کب تک اے کاش کبھو آ کر
ترا آنا ہی اب مرکوز ہے ہم کو دم آخر

مجروح بدن سنگ سے طفلاں کے نہ ہوتے
تدبیریں کریں اپنے تن زار و زبوں کی

اب چھیڑیئے جہاں وہیں گویا ہے درد سب
لوہو کہاں ہے گریۂ خونیں سے تن کے بیچ

تحمل ہو سکا جب تک بدن میں تاب طاقت تھی
نہ ہووے وصف ان بالوں کا مجھ سے

بدن نما ہے ہر آئینہ لوح تربت کا
تھا نوشتے میں کہ یوں سوکھ کے مریئے اس بن

کچھ عشق کی آتش کی لپٹ پہنچی ہیں زور
جو دردو الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا

آ پڑی یہ ایسی چنگاری کہ سارا تن جلا
مجنوں کے وشتِ خار کا داماں بھی جل گیا

مشبک کر گیا ہے تن ہمارا
نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

آتے ہو اب تو آؤ پھر ہم میں کیا رہے گا
قفس سے تن کے مرغِ روح میرا جب رہا ہو گا

تشریف تم کو یاں تئیں لانا ضرور تھا
طائرِ جانِ قفس تن کا گرفتار نہ تھا

اب کار و اے عزیزاں پہنچی ہے استخواں تک
تہہ گرد بھی نہ بیٹھی تا تن کے تئیں چھپاؤں

مگر قافلے سے کوئی دور ہے
تہہ گرد بیاباں کی بالائے بدن بیٹھے

یہ جی صدقے کیا تھا پھر نہ آوے تن میں یا کوے
کم جلتے جو اس کوچے میں پرہم تھے دوانے

افراط سے اندوہ کے ہول آپ میں جب ہم
پھوڑا سا ہو گیا ہے ترے غم میں تن تمام

کرتے ہیں منہ کو اپنے طمانچوں سے لال ہم
قیامت اب گزر جاتی ہے جی پر ایک ساعت میں

اگر ہر موئے تن پر اک زباں ہو
نظر جسے ہو لے سے خاک خود نمائی ہو

استخواں تن پہ نمودار ہیں سب مسطر سے
سب تن بدن کو اپنے مجسم دیکھتے ہیں جائے

اب تو بدن میں سارے اک پھنک ہی ہے آتش
عشق تو ہو پی گیا سب تن میں ہے سو درد درد

گرد اس کے اور کوئی گرمی سے دیکھتا ہے
سب روم روم تن میں زردئ غم بھری ہے

تن کو جس جاگہ سے چھیڑو دل ہوں وہاں ہے درد درد
اب حیرت ہے کس کس جاگہ پنبہ و مرہم رکھنے کی

گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
عہد یہ تھا کہ نہ بے وصل بدن سے جاوے

کوشش میں سر مارا لیکن در پہ کسی کے جا نہ سکا
میدانِ عشق میں تو قیمہ بدن ہوا ہے

تنِ زارِ لاغر میں ظاہر رگیں ہیں
آسائشِ بدن نہ ہوئی فقر میں بھی کم

تنکا سا ہو رہا ہے تن آگے ہی سوکھ کر
تنگی جامہ ظلم ہے اے باعثِ حیات

سوزِ دل و جگر سے جلتا ہے تن بدن سب
تن بدن بھر میں کیا کہئے کہ کیسے سوکھا

میں نے کہا کہ پھنک رہی ہے تن بدن میں آگ
یارب رکھیں گے پنبہ و مرہم کہاں کہاں

وہ مہ گلے سے لگتا تو یوں جگر نہ جلتا
پھل میری خاک سے نکلیں گے بھی سو زرد زرد

اک آگ لگ اٹھی ہے اپنے تو تن بدن میں
خاکِ جسد ہے میری کس کانِ زر کا خاکا

ہاتھ لگتے دل کے ہو جاتا ہوں کچھ میں زرد زرد
قد کو کیا ہے سروِ چراغاں داغ بدن پر کھا کر

رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں
سو جدا ہوتا ہے کی جی نے دغا اپنے ساتھ

تن پہ زبانِ شکر ہے ہر مو اپنی شکستہ پائی کا
تہ کر کے خاک ہی میں رکھ دیں کفن ہمارا

بھرا ہے مگر عشق ایک ایک نس میں
جاگہ اتو کی جامے پہ نقشِ حصیر تھے

اب ننگ کیا فقیر جو سب میں حقیر ہے
پاتے ہیں لطف جان کا ہم تیرے تن کے بیچ

میں کیا، کوئی ہو، کھینچے ایسے عذاب کیونکر
ہلکی بھی باؤ میں تنکے سے ہلے جاتے ہیں

بولا کہ عشق ہی میں پڑے اب جلا کرو
سوزِ دروں سے ہائے بدن داغ داغ ہے

اِعتِذار

میری تمام احتیاطوں کے باوجود کئی خامیاں تالیفِ ہذا میں رہ گئی ہوں گی خصوصاً تدوینِ اشعار کے سلسلے میں —— یعنی طے کردہ اصول کے باوجود بعض اشعار ایک سے زیادہ عنوانات کے تحت درج گئے ہوں گے جن کی نشاندہی قارئین بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ میں ایسے قارئین کو اپنا محسن تصور کر— ہوئے ان کا شکر گزار رہوں گا اور اگر وہ میری لغزش سے درگزر بھی فرمادیں تو یہ ان کا دوہرا احسا مجھ پہ ہوگا۔

کتابت کے ضمن میں اس خامی کا اعتراف پہلے ہی کیے لیتا ہوں کہ بعض تراکیب کو یکجا لکھنے کی بجا سہواً دو سطور میں تقسیم کر دیا گیا ہے مثلاً "الگ الگ" میں لفظِ "الگ" کو ایک مرتبہ سطر کے آخر لکھ دیا ہے اور دوسری مرتبہ اگلی سطر کے آغاز میں! اسی طرح ذیلی اور بغلی عنوانات بہت ہی جلی حرو میں تحریر کر دیے گئے ہیں جو ذوقِ نظر پر گراں گزرتے ہیں —— اور تکمیل کتابت کے بعد اصلاح کا خاصا دشوار ہوگیا تھا! میں ان جملہ امور کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔

یزدانی

کتابیات

کتاب ہذا کا تین چوتھائی سے زائد حصّہ تو اشعارِ بدن نامہ پر مشتمل ہے اور نثری مواد مجموعی ضخامت کے ایک چوتھائی حصّے کے برابر بھی نہیں اور اس میں سے بیشتر کا تعلق مؤلف کی ذاتی کاوش سے ہے، تاہم کہیں کہیں بعض محققین اور اہلِ نقد و نظر کے حوالے سے بھی بات کی گئی ہے لہٰذا کتب حوالہ کی تعداد قلیل ہونے کے باوجود ان کا اندراج مناسب معلوم ہوتا ہے (ہر چند کہ متعلقہ اصحاب کے اسمائے گرامی متن میں پہلے ہی درج کیے جا چکے ہیں) ان میں "تحقیقات" (عندلیب شادانی)، "ذکرِ میر" (سید عبداللہ) اور "نقوش" (میر نمبر) شامل ہیں۔ آخر الذکر میں سے آلِ احمد سرور، میرزا ادیب، حسن واصف عثمانی، فراق گورکھپوری، نادم سیتاپوری اور جمیل جالبی کے بعض "اقوال" کا حوالہ دیا گیا ہے!

یارب رکھیں گے پنبہ و مرہم کہاں کہاں
سوزِ دروُں سے ہائے بدن داغ داغ ہے